ہلاکت گریز
عالمی علمِ سیاسیات

گلین ڈی۔ پیج

زاہدہ حنا

انتساب

رچرڈ اِسنائڈر (1916-1997)

ایچ ہربرٹ وِلسن (1909-1977)

سیاسی مفکر، استاد اور دوست

وہ سائنس جو اپنے اولین لوگوں کو بھولنے میں ہچکچاتی ہے،
وہ ہار جاتی ہے

الفریڈ نارتھ وہائٹ ہاؤس

پیش لفظ

یہ کتاب بنیادی طور پر دنیا بھر کے علم سیاسیات کے اسکالروں کے ملاحظے اور تنقیدی غور وفکر کے لیے پیش کی جارہی ہے خواہ وہ مبتدی ہوں پروفیسر۔عمر یا تبحر علمی اس تصور میں کوئی خاص تبدیلی نہیں لاسکی ہے کہ ہلاکت انگیزی انسانی صورتحال کی ناگزیریت ہے جسے سیاسی نظریے اور عمل میں تسلیم کرلینا چاہیے۔ امید ہے کہ اس کتاب کے قارئین اس تصور کو زیر بحث لائیں گے اور ایک ہلاکت گریز عالمی مستقبل کی جانب فکر وعمل کے مزید نشانِ راہ ثبت کریں گے۔

انگریزی زبان میں شاید یہ پہلی کتاب ہوگی جس کے عنوان میں ''ہلاکت گریزی'' کا لفظ شامل ہے۔ یہ مروجہ اصطلاح نہیں ہے۔ یہ ''امن'' اور ''عدم تشدد'' سے بھی آگے بڑھ کر، انسانی جان لینے کے عمل پر فوری اور براہ راست توجہ چاہتی ہے۔ بہت زیادہ لوگوں کا فوری ردِعمل یہ ہوسکتا ہے کہ ہلاکت گریزی کو مرکز توجہ بنانا بہت منفی، بہت تنگ نظر رویہ، اور یہ زیادہ اہم چیزوں کو نظر انداز کرتا ہے۔ وہ گاندھی کے اس مشورے پر عمل پیرا نظر آئیں گے کہ اہنسا (عدم تشدد: فکر، لفظ اور عمل میں عدم جراحت) کی ہلاکت گریزی کے طور پر تشریح کرنے سے تشدد پر معمولی اثر پڑتا ہے۔

اس کے باوجود یہ ممکن ہے کہ ایک قاری کے طور پر گاندھی کو اس بات پر غور وفکر کے لئے آمادہ کیا جا سکتا تھا کہ تشدد کی دیگر قسموں کے ماخذ اور حامل کے طور پر ہلاکت سے نجات پر مرکوزیت، عدم تشدد کی علم سیاسیات میں ایک نمایاں پیش قدمی ہوسکتی ہے اور جان لینے کی سیاست سے زندگی کے اثبات کی سیاست کی جانب بڑھا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کا ادعا یہ ہے کہ ہلاکت گریز عالمی سماج ممکن ہے اور یہ کہ علم سیاسیات کے علمی اصول میں تبدیلی اور اس کا سماجی کردار ایسے سماج کے قیام میں مددگار ہوسکتا ہے۔ اس تصور کو کہ قتل کرنا فطرت انسانی اور سماجی زندگی کا ایک ناگزیر وصف ہے جسے سیاست کے مطالعے اور عمل میں قبول کر لینا چاہیے، درج ذیل طریقے سے زیر بحث لایا گیا ہے۔ اولاً یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ حیاتیاتی طور پر اور تربیت کے ذریعے انسان قتل کرنے اور قتل نہ کرنے دونوں کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دوم، یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اپنی ہلاکت آفریں صلاحیت کے باوجود انسانوں کی کثیر تعداد نہ قاتل ہے اور نہ کبھی رہی ہے۔ سوم، ہلاکت گریز صلاحیتیں سماجی اداروں کے وسیع حلقوں میں ظہور پذیر ہو چکی ہیں، اگر انہیں تخلیقی طور پر مربوط اور اختیار کیا جائے تو ہلاکت گریز سماجوں کے قیام میں وہ جزوی حصے کے طور پر کام آ سکتی ہیں۔ چہارم، ہلاکت کی اور ہلاکت گریزی کی وجوہ اور ہلاکت اور ہلاکت گریزی کے درمیان عملِ تغیر کی آگہی میں موجودہ اور ممکنہ سائنسی پیش قدمیوں کے حوالے سے، ہلاکت آفرینی کے لیے معاون نفسی، حیاتیاتی اور سماجی عوامل دونوں کو ہلاکت گریز تغیر پذیر مداخلت کا اہل سمجھا گیا ہے۔ پنجم، سابق الذکر حوالے سے علم سیاسیات اور سیاست میں تشدد کی توثیق کی بنیاد کے طور

پر ہلاکت آفریں انسانی فطرت کے کردار کو کم از کم اصول کی اساس کے طور پر ممکن الوقوع بننا چاہیے۔ ششم، مقامی اور عالمی زندگی سے ہلاکت آفرینی کے خاتمے کی جانب عالمی خواہش کے مطابق پیش قدمی کرنے کی خاطر، ان ماہرینِ علم سیاسیات کو جو ابھی تک ہلاکت گریز سماجی قلب ماہیت کے لیے انسانی استعداد کی جانب راغب نہیں کیے گئے ہیں، دعوت دی جاتی ہے کہ وہ آئیں اور اس امکان کو پیش نظر رکھ کر اس مسئلے کا جائزہ لیں کہ استقرائی اور استنباطی عناصر کو جوڑتے ہوئے خالص نظریے کی اصطلاح میں قیاساً تحقیق و تفتیش کی جائے۔ تشکیک پسندوں نیز ہلاکت گریز تبدیلیوں کے امکان کو تسلیم کرنے والوں کی جانب سے قیاسی تجزیہ اور ادائیگی کردار اصولی ارتقا میں نمایاں مدد کر سکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے نیوکلیئر ڈیٹرینس دلیل پیش کرتی ہے اور نقادوں کو محدود یا پورے طور پر جوہری جنگ کے مقامی اور عالمی اثرات کی نظری اور مفروضی تلاش میں مصروفیت کا موقع ملا، ہلاکت گریز اور تشدد پسند ماہرینِ علم سیاسیات عالمی زندگی کے ہلاکت گریز حالات پیدا کرنے کی وابستگیوں کی پیشگی شرائط، طریق عمل اور ماحصل تلاش کرنے میں تعمیری اور نتیجہ خیز شمولیت اختیار کر سکتے ہیں۔

گو کہ اس کتاب کا ابتدائی تخاطب ان افراد سے ہے جو علم سیاسیات کا مطالعہ کرتے اور اس پر عمل کرتے ہیں، تاہم یہ امر ایک کھلی حقیقت ہے کہ تمام عالمانہ اصولوں اور پیشوں کی دریافتوں اور مدد کے بغیر ہلاکت گریز سماجوں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ ایک گراں قدر مثال ہارورڈ کے ماہرِ سماجیات پیرم اے سوروکن کی تصنیف 'دی ویز اینڈ پاور آف لو' (1954) میں ایثار پیشہ محبت کی عملی سائنس کی جانب اولین پیش قدمی ہے۔ ہمیں ہلاکت گریز طبعی اور

حیاتیاتی علوم، ہلاکت گریز سماجی علوم، ہلاکت گریز فنون، ہلاکت گریز پیشوں اور ہر گوشہ زندگی میں ہلاکت گریز لوگوں کی ضرورت ہے۔مزید براں، ماضی وحال کی انسانی صلاحیتوں کے تمام پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے ہمیں مقامی سیاق وسباق اور ثقافتوں سے بلند ہوکر علم اور تجربے میں حصہ بٹانا چاہیے۔معیار کے مطابق حساسیت کا حامل بننے، دانشمندانہ طور پر چوکس رہنے اور عملی طور پر بامقصد رہنے کے لیے ہلاکت گریز علم سیاسیات کو تفہیم اور شراکت میں عالمی ہونا چاہیے۔

اظہارِ تشکر

اس کتاب کی تشکیل میں ماضی و حال کے معروف اور غیر معروف لوگوں کے حوالے استعمال ہوئے ہیں۔ ان سب کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ ان لوگوں کی ایک جھلک یہاں اور حوالۂ کتب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ میں ہوائی کے لوگوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے دریافت کے اس عالمانہ سفر میں میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا، مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والے ہوائی یونیورسٹی کے طلبہ کا شکریہ جنہیں نے 1978ء تا 1992ء کے دوران انڈر گریجویٹ کورسوں اور گریجویٹ سیمیناروں میں ''غیر متشدد سیاسی متبادل'' کی تحقیق میں حصہ لیا اور فرانسین بلوم، چیوات ستھ آنند اور مکا پیڈ وا ے مسلم جیسے عدم تشدد پر doctoral researchers کا شکر گزار ہوں جنہوں نے فاضلانہ خدمات کا پیشہ اپنایا۔

یہ کتاب پیش کرتے ہوئے میں پرنسٹن کے دو عظیم سیاسی استادوں، رچرڈ سی سنڈر اور ایچ ہوبرٹ ولسن کی اثر اندازی سے خصوصی طور پر آگاہ ہوں۔ سائنس، بینِ مضامین حدِ رسائی، یہ فہم کہ متبادلات کے درمیان انتخاب کرنے کی استعداد میں سیاست کا اصل جوہر موجود ہوتا ہے، تمام سطحوں پر تعلیم کے لیے غور و فکر کے باعث سنڈر احترام کے مستحق ہیں اور اس قدر شناسی پر بھی کہ قدریں ان چیزوں کو جلا بخشنے کی خدمت انجام دیتی ہیں اور یہ کہ اس طرح کی قدروں کے بغیر ان کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ولسن کا شکریہ، کیونکہ گاندھی کے بعد

انہوں مثال پیش کی کہ ایک آزاد اور منصفانہ سماج کو سچائی کے لیے آواز بلند کرنے والے اسکالروں اور شہریوں کی ضرورت ہوتی ہے، چاہے کبھی انہیں اکیلا ہی کیوں نہ کھڑا ہونا پڑے۔

سب اسکالروں کی طرح، میں نے وجدان کے متعدد ماخذات اور علمی برادری کی اندرونی اور بیرونی نصیحتوں سے فیض حاصل کیا ہے۔ روحانی رہنماؤں میں، آچاریوں میں تلسی اور مہاپراگیہ، رّبی فلپ جے بنٹیلے، ریورینڈ سڈنی ہنکس، ڈائی ساکواکیڈا، Sr. Anna Mc Anany، لاما ڈبوم تلکو، فادر جارج زبیلکا، اور عبدالرحمٰن واحد کا میں خاص طور پر مقروض ہوں۔ طبعی، حیاتیاتی اور سماجی علوم کے حوالے سے این چنگ سی، چنگ پون جے، جیمس اے ڈیٹر، جوہن گالٹنگ، پیرو جارجی، ہانگ سنگ چک، لی جے بونگ، برائن مارٹن، رونالڈ میکارتھی، بروس ای مورٹن، کنہائڈ مشاکوجی، اریے پرنوف، الیا پری گوگین، ایل تھامس رامسے، رہی یانگ پل، ہیروہارو سیکی، ولیم سمرنوف، لیزلی ای اسپونسل، جین شارپ، اور رالف سمی کا مجھ پر قرض ہے۔ بشری علوم کے اسکالروں میں اے ایل ہرمن، رچرڈ ایل جانسن، مائیکل این ینگلر، چمن نہال، جارج سائمن، تاتیانا یکشکینا، اور مائیکل ٹروکا مقروض ہوں۔ کتب خانوں کے مہتموں میں، رتھ بنز اور بروس ڈی بونٹا کا۔ سیاسی اور سماجی رہنماؤں میں جیمس وی ابرٹینی، ایم ارم، اے ٹی آریہ رتنے، ڈنیلو ڈولسی، گوین فرایوانس، ہوانگ حانگ یوپ، پیٹرا کے کیلی، جین سندکوکنگ، میریاڈ کوریگن میگوائر، عبدالسلام المجالی، رونالڈ میلون، ارسلا میلون، اندریس پیسٹرانا، ایوا کوئس ٹروپ، شی گو، اکرام ربانی رانا، سولک شو

رکشا، اور ٹی کے این اینتھن کا۔ معلمین میں جوزوی ابوئبا، این رادھا کرشنن، جی رام چندن، جوکوئن اُری، اور ریٹا والسٹروم کا۔ عدم تشدد کے تربیت کاروں میں دھرمانند، چارلس ایل ایفن، سینیٹر، برارڈ لافیٹ، جونیئر کا۔ جسم و روح کے طبیبوں میں، تیا نگ ایچ کام، جین آر لڈک، رامون لوپیز ریز، رہی ڈانگ شیک، روہ جینک وو، اور ویسلے وانگ کا۔ اختراع کے چیمپینز میں وجے کے بھاردواج، کیرن کراس، لیری آر کراس، وانس اینگل مین، ایس ایل گاندھی، سارہ گلیات، لاؤ این ہاہیو گوانسن، منفریڈ ہینگسین، تھیوڈور ایل ہرمن، سزی ہیان لیانگ، انتھونی جے مارسیلا، رچرڈ مورس، رومولا مورسے، اسکاٹ میک وے، ہیلا میک وے، گیڈانگ باگوس اوکا، برٹن ایم سین، اسٹینلے شاب، ولیم پی شا، جوانے ٹجیبانا، والڈیمر توسسک، جان ای ٹرینٹ، الویرو ورگاس کا مقروض ہوں۔

مختلف تناظر سے تعلق رکھنے والے آہن چنگ سی، اے ٹی آر یا رتنے، جیمس میک گریگر برنس، چیوات ساتھا آنند، وانس اینگل مین، جوہن گلٹنگ، لوئس جیویئر بٹیرو، امیڈیو کوٹینو، ایلسبیٹا فورنی، لاؤ این ہا آہیو گوانسن، کائی ہیبرٹ، تھیوڈور ایل ہرمن، ہانگ سنگ چک ایڈورڈ اے کولوڈزیج، رامون لوینیر رئیس، کیکسیا لو، میریڈ کوریگن میگوائر، برائن مارٹن، میلیسا مشبرن، جان ڈی منٹگمری، بروس ای مارٹن، منی مہیند رکمار، ونسنٹ کے پولارڈ، الیا پری گوگن، این رادھا کرشنن، فریڈ ڈبلیو رگس، جیمس اے رابنسن، برٹن ایم سین، نمرتا شرما، جارج سمسن، جے ڈیوڈ سنگر، چنز وسانگ، رالف سمی، کانسٹن ٹائن ٹیوسوف، والڈیمر توسمک، مائیکل ٹرو، ایس پی اودے کمار، ٹی کے این اینتھن، الویرو ورگاس اور بوکسوزاؤ کا انتہائی شکر

گزار ہوں جنہوں نے اس کتاب کے مسودے کا مطالعہ کر کے پُر خلوص تبصرے کیے۔ ان کے تبصروں نے کو زیادہ قابل فہم بنایا ہے اور اس تھیس کے فہم میں اضافہ کیا ہے۔ اگر ان لوگوں کی بصیرت سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا تو اس کوتاہی کا ذمہ دار میں خود ہوں۔

میں جیمس اے رابنسن کا انتہائی احسان مند ہوں جنہوں نے فروری 1999ء میں ابتدائی مسودے کا مطالعہ کیا اور رچرڈ سی سینڈر کے جیسے روحانی جذبے سے کتاب کا تعارف تحریر کیا۔

میں گلینڈا اتسو کو نائٹو پیج کا ہمیشہ شکر گزار رہوں گا جنہوں نے اس کتاب کا مسودہ ٹائپ کیا جیسا کہ وہ پچیس سال سے زیادہ عرصے سے میرا ہر مضمون اور کتاب ٹائپ کرتی رہی ہیں، مجھے ان کا عملی تعاون بالی، بنکاک، بیجنگ، برلن، برسبین، ہیروشیما، لندن، ماسکو، نیو دہلی، نیو یارک (یو این)، پیرس، پرونس ٹاؤن، پیانگ یانگ، سیئول، ٹوکیو اور اولن بٹور میں ___ معلومات کی فراہمی کے لیے حاصل رہا ہے۔

جان ڈبلیو برگیز کی کتاب ''ایک امریکی اسکالر کی یادداشتوں سے اقتباس'' چھاپنے کی اجازت دینے پر کولمبیا یونیورسٹی پریس کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

تعارف

آپ کے ہاتھ میں جو کتاب ہے اسے مصلح اور معلم کہنا چاہئے۔ جب اسے وسیع پیمانے پر پڑھا جائے گا اور سنجیدگی اختیار کی جائے گی تو یہ عالمی طور پر موجود بعض اقدار کو اور ان اقدار کی تشکیل کرنے والے اداروں کی بنیادیں ہلا دے گی۔ ان اقدار، اہداف، ترجیحات، مطلوبہ نتائج، واقعات اور فرمان نیز متعلقہ اداروں میں وہ شامل ہیں جن کا تعلق طاقت کے حصول اور استعمال سے ہے۔ ''طاقت'' ایسے طریق ہائے عمل متعین کرتی ہے جس کے ذریعے لوگ اپنے اور دوسروں کے لیے فیصلے سازی میں شریک ہوتے ہیں، اور اگر ضروری ہو کو جبر کے ذریعے وہ ان فیصلوں پر عمل کرنے کے پابند ہوتے ہیں، (لاسویل اور کپلن 1950:75ء)۔ طاقت کی اقدار سے منسلک ادارے، حکومتوں اور ان کے فیصلہ سازوں کے مقابلے میں زیادہ کا احاطہ کرتے ہیں جو جنگ لڑاتے ہیں اور ان لوگوں کو سزائے موت سمیت سخت سزائیں دیتے ہیں جو سرکاری حکم سے سرتابی کرتے ہیں۔ طاقت کے اداروں کے ساتھ تعامل کرنے والوں میں بڑے بڑے سرمایہ کاروں کی منظّم معیشتیں جن میں سے بعض اختراعات، پیداوار، فروخت اور ''اسلحہ'' استعمال کرنے کی دھمکیوں کے ذریعے دولت پیدا کرتی ہیں؛ یونیورسٹیاں جن کے شعبوں میں بعض تخلیقی ارکان تحقیق کرتے ہیں اور قوت کی حکمت عملیاں اور ''استبدادی سفارتکاری'' وضع کرتے ہیں؛ ماہر کھلاڑیوں اور

فنکاروں کی ایسوسی ایشنز جن میں ایسے افراد شامل ہوتے ہیں جو پُرتشدد کھیلوں اور تفریحات میں مہارت رکھتے ہیں؛ طب اور صحت کے شعبے سے متعلق ایسے معزز افراد کے اسپتال اور شفا خانے جو زندگیاں ختم کرنے اور موت میں سہولت پیدا کرتے ہیں؛ نیم خفیہ سوسائیٹیاں یا ''نجی فوجیں'' جن میں حصہ لینے والے حکومتوں کی لاعلمی میں یا ان کے خفیہ تعاون کے ساتھ ہلاکت آفریں اسلحہ تیار اور استعمال کرتے ہیں؛ خاندان جن کے ارکان خود ناروا سلوک کرتے یا اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں، حتیٰ کہ بعض ثقافتوں میں بیویوں، شوہروں، بچوں، یا ازدواجی رشتے داروں کو قتل بھی کر دیتے ہیں؛ اور بعض مذہبی تنظیمیں جن کے وفا شعار پیرو جو تسلیم شدہ اصولوں، ضابطوں، رواجوں سے منحرف ہونے والوں کو قتل کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں، شامل ہیں۔

سماج کا ہر اہم حلقہ چونکہ ہلاکت کا ارتکاب کرتا ہے اور اپنے سماجوں کی قوت کے طریقہ ہائے عمل کے ذریعے ملوث کیا جاتا ہے لہٰذا مثبت اور منفی دونوں ترغیبات کے ساتھ، ہر ایک کی نگرانی کرتا ہے، لوگوں کو قوانین کے تابع کرتا ہے، روزگار سے لگاتا ہے، اور اصلاح کرتا ہے، بعض اوقات ہلاکتوں کا ارتکاب کرتا ہے جیسے حفاظتی ارکان جو کارپوریشنوں میں، کالج کے کیمپسوں میں، تفریح فراہم کرنے والے اداروں میں، اسپتالوں اور کلینکوں میں، بعض اوقات گھروں کے احاطوں اور گرجا گھروں میں رازدارانہ سرگرمیاں انجام دیتے ہیں۔ طاقت کے اداروں اور دیگر سماجی اداروں کے اندر اور ان کے مابین تعامل، حتیٰ کہ وہ قتل کرنے یا قتل کرنے کی دھمکیوں پر مشتمل ہوں، یہ سب کچھ جدید اور مابعد جدید سماجوں

کے مسائل پیدا کرتا ہے، جن کی نشان دہی صاحب نظر افراد کر چکے ہیں اور جس کا مستعد شرکا کی جانب سے اظہار کیا جا چکا ہے۔

پروفیسر گلین ڈی پیج انفرادی، کمیونٹی اور عالمی نوعیت کے مسائل، انسانی معاملوں میں قتل کرنے اور قتل کرنے کی دھمکیوں کے مسائل سے اصولی طور پر نبرد آزما ہوتے ہیں۔ وہ ایک جانب، وسیع پیمانے پر مشترکہ انسانی دعوؤں، مطالبوں، ترجیحات اور قدر و منزلت کے کم سے کم سرکاری اور مدنی ضابطوں کے حقوق؛ اور دوسری جانب، فروعی تضادات اور فی الحقیقت سماجی تنظیم کی ہر سطح پر چھوٹے گروہوں، محلوں (علاقوں)، قوموں، عالمی سطح اور مختلف قسم کے حکومتی، معاشی، تعلیمی، حرفتی، طبی، سماجی، خاندانی اور مذہبی اداروں کے ذریعے ان بنیادی اہداف اور مقاصد کی تکذیب کے درمیان عملی اور منطقی بطنِ بطون دکھا کر مسائل کی تشریح کرتے ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہلاکتوں کے مسائل کا آغاز عہد حاضر میں ہوا ہے یا اچانک اس کی آگہی ہوئی ہے۔ نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ ایک اسکالر سائنسداں کے بطور اس کتاب کا ظہور مصنف کی تخیل اور مہارتوں کے اتفاقی اطلاق کا نتیجہ ہے۔ اس کی اشاعت کا فوری مقصد یہ ہے کہ اکثر تسلیم شدہ، انسانی تنظیموں اور کمیونٹیوں میں ہلاکتوں کے طویل المدتی کردار کے باوجود، دنیا بھر کے مرد اور خواتین مسئلہ حل کرنے کے طرز نظر کی ایک موثر فہرست بندی اور تجزیہ کرنے، پیش بندی کرنے اور پالیسی کے متبادل اختیار کرنے میں ناکام رہے ہیں جس کے ذریعے ہر گوشے میں تمام اقدار کو متاثر کرنے

والے انسانی تعاملات کے ہلاکت گریز طرز کے لیے بیش امکانات کے حق میں ہلاکتوں کے احتمال کو موثر طور پر ختم کر سکتی ہو۔

اس نوع کا فن پارہ بہت سی عملی، علمی اور فضلیت کی حامل شخصیات کے درمیان، ان کے یا ان کے اداروں کے گرد ہلاکت کے علی الرغم یا سبب سے جمع شدہ علم اور ہنرمندیوں کا مظہر ہوتا ہے۔ مسائل مرتب کرنے میں فلسفی مدد ہوتے ہیں تا کہ اہدافی اقدار اور ترجیحات میں خلل انداز مفروضہ قائم کیا جائے اور اس کی وضاحت کی جائے۔ تاریخ داں، مردم نگار، ماہرین معاشیات اور دیگر مہلک اور ہلاکت گریز طریقوں میں رجحانات اور تمام اہداف اور ترجیحات پر انسانی مظاہرے عروج و زوال کی تاریخ قلم بند کرتے ہیں۔ ماہر بشریات، ماہر حیاتیات، ماہر نفسیات اور ماہر عمرانیات رجحانات کی بنیادی شرائط دریافت کرنے کا بیڑا اٹھاتے ہیں تا کہ ایسے مقامات اور مواقع دریافت کیے جائیں جو مزاحمت کرنے والے انحرافی رجحانات میں مدد ہو سکتے ہوں اور زندگی کا اثبات کرنے والے انتہائی تسلسل کے حامل رجحانات کو فروغ دے سکیں۔ دیگر افراد بھی دست اندازیوں کی عدم موجودگی میں رجحانات کی پیش گوئی کرنے یا راہیں تجویز کرنے میں صلاحیتیں صرف کرتے ہیں جو ناپسندیدہ رجحانات میں رکاوٹ ڈال سکتے ہیں اور پسندیدہ رجحانات کو تقویت پہنچا سکتے ہیں۔ اور عوامی امور کی آگہی رکھنے والے تجربہ کار مرد اور خواتین، اور پالیسی کے موزوں اور قابل عمل متبادل نصابوں کے اہل موجدوں کی صف اور تعداد اور شائستگی میں اضافہ کا موجب ہوتا ہے۔ یہ مرد و خواتین ابتداً اشرافیہ کے مقابلے میں نیم اشرافیہ درجے میں رہتے ہیں جہاں وہ ہلاکت گریزی

کے حق میں اختراع کر سکتے ہیں۔اس کے ساتھ انسانی رجحانات، حالات اور امکانات کے حوالے سے آگہی میں بطور ماہرین یہ افراد تشدد میں مہارت رکھنے والوں کے سامنے طاقتور رکاوٹ کا حامل متبادل پیش کرتے ہیں جنہوں نے گذشتہ صدی کو انسانی تاریخ کا انتہائی خونریز دور بنا دیا تھا۔ جب کہ انہوں نے متبادل رجحان اور امکانات کے ساتھ برسر اقتدار آنے کے انتظار کے دوران زیادہ مفید طور پر انسانی شرف کو سنوارا۔ ہلاکت گریز پالیسی علوم کی نمو اور ان کی ادارہ سازی کے ساتھ خونریز بیسویں صدی کی عصری مطابقت ایک عظیم ترین اور خوش آئند رمز ہے۔

گلین پیج نے جنگ کوریا میں لڑنے اور قتل کرنے کے معاملات سے واقفیت اپنے دور کی تربیت، تنظیم اور استعداد سے حاصل کی تھی۔ جب انہوں نے دوبارہ سے علمی پیشہ اختیار کیا تو حکومتی شخصیات کی جانب سے خارجہ پالیسی کے فیصلوں کی تشکیل اور تشخیص پر خصوصیت کے ساتھ، اور قوموں کے درمیان تعلقات پر دھیان دیتے ہوئے استاد اور محقق بننے کی باقاعدہ تیاری شروع کر دی تھی (سنڈر، بروک اور سپین 1962ء)۔ متعدد زبانوں میں ماہر نیز سماجی علوم میں وسیع طور پر تعلیم یافتہ، گلین پیج علم سیاسیات کے بے شمار ذیلی شعبوں میں اہم طور پر معاونت کر چکے ہیں (بحوالہ پیج 1977ء)۔ علمی فضیلت کی نصف صدی کے دوران ان کے ذاتی اہداف کے تجزیہ نے انہیں مسائل، اہداف، رجحانات، حالات اور قتل کے امکانات اور تخفیف قتل کے لیے تدریس اور عوامی امور میں متبادل عملی نصابوں پر مختلف زاویوں سے روشناس کیا۔ انہوں نے یہ بنیادی مفروضہ قائم کیا کہ ہم عصر وقتی آوازوں اور ریاست کی

سائنسی تحقیقات کے برخلاف، ریاست کے موجودہ تصورات ایسے خیالات پر مبنی ہیں جو ہلاکت گریزی پر قتل کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ کتاب مصنف کی طویل پیشہ ورانہ زندگی کے آخری نصف عرصے کا ثمر ہے اور اب قاری کے سامنے ہلاکت گریز عالمی علم سیاسیات کی ترجمانی کی حامل ان خیالات پر حملہ آور متبادل کی حیثیت رکھتی ہے۔

میں مصنف سے چار عشروں سے زیادہ عرصے سے واقف ہوں۔ اس عرصے میں ہم نے آگہی میں ان کے وسیع اضافوں کا اندازہ لگایا اور قتل اور قتل کے خطرات کے نتائج، گنجائش اور دائرہ اختیار میں وسیع اضافوں پر افسوس کا اظہار کیا۔ ہلاکت گریز عالمی رویوں کے فروغ سے وابستہ کسی بھی سماج کے کسی بھی گوشے سے تعلق رکھنے والے شریک کار شہری اور جمہوریت پسندوں کے لیے اس کتاب کی قدر و قیمت کی توثیق میں میری شرکت پر آمادگی محض دوست داری یا پھر احترام کے باعث نہیں ہوئی، حالانکہ دونوں حیثیتیں قابلِ توجہ ہیں۔ تمام اقدار کی صورت گری اور شمولیت میں تنگ نظر اور پُرتشدد شرکت کے برخلاف، وسیع النظر اور پُرامن شراکت، نسلِ انسانی کے مشترکہ مفادات کے حوالے سے سائنسی اور علمی تحقیق اس کتاب پر لکھنے کی تحریک فراہم کرنے کی بنیاد ہے۔

علم سیاسیات کے ایک ماہر کی تخلیق کردہ یہ کتاب علمِ سیاسیات کی مستحکم بنیادوں اور اس کی خامیوں کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس دنیا کے جدید تصورات کے مطابق ''علمِ سیاسیات'' سائنس پر توجہ مرکوز کرنے کے سماجی علوم میں تازہ ترین علم ہے۔ بطور ''ضابطہ'' اگر اسے اس حیثیت کا مستحق سمجھا جاتا ہو، اس کی کمزوری اس کی حدود کی وسعت کا عکس ہے۔ اس سبقت

سے ایک نئی شاخ یا لائحہ عمل ''پالیسی سائنسز'' وجود میں آئی، جس نے فوری طور پر سماجی مظہر کے حوالے سے کثیر القدر، کثیر الطریق، مسائل تک رسائی پر توجہ مرکوز کی (لاسویل اور میکڈوگل 1992ء)۔ پیچ کی تصنیف، شرف انسانی کی پالیسی کی حامل سماجی علوم کی لاتعداد مترادفات کی عکاس ہے، اوران کی بہتری میں تخلیقی طور پر ممد ہوتی ہے (رابنسن 1999ء)۔

میں، اس تحریر کا مصنف، دوسروں کے مقابلے میں روشن خیالی اور بالادستی کے اداروں سے زیادہ واقف ہوں، نصف صدی تک امریکہ کے متنوع کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زندگی گزاری ہے، تعلیم حاصل کی ہے، درس دیا ہے، اور منتظم رہ چکا ہوں اور اس اثنا میں امریکہ میں مقامی، ریاستی اور قومی کمیونٹی سطحوں کے مختلف گوشوں میں متعدد دیگر ممالک میں مختلف سطحوں پر حکمرانی کے ارتقائی عمل میں خصوصی مہارت حاصل کرتا رہا ہوں۔ انتظامیہ سے متعلق میری سابقہ زندگی کا یہ ایک تجربہ ہے کہ کالج کیمپس کی غلام گردشوں میں بھی ہم میں سے بیشتر افراد آلاتِ قتل اور قاتلوں سے چشم پوشی اختیار کرتے ہیں۔ نشاندہی ہونے کے بعد، اس نوع کے قتل اور قتل کے خطرات کی درجہ بندی اور تاویل کاروباری لاگتوں کے طور پر کی گئی ہے، ہمارے اسکول اور یونیورسٹیاں مطابقت اور مناسبت کے اعتبار سے واقعتاً کاروباری اداروں سے مشابہہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہمارے ایڈمنسٹریشن، مینجمنٹ، آرگنائزیشن اور ٹیکنالوجی کے اسکول کے ذریعے وہ بزنس، کامرس اور فنانس کے شعبوں کی ترقی کے رفتار کا تعین کرتی ہیں۔

سیاسی زندگی میں قوت کا مرکزی کردار، دیگر سماجی شعبوں کے مقابلے میں زیادہ

نمایاں ہے۔ اسے نہ صرف ریاست کی تشریح کے لیے ناگزیر سمجھا جاتا ہے، بلکہ امنِ عامہ، داخلی سلامتی، خارجہ اور دفاعی پالیسیوں کے لیے قومی حکومتوں کے بجٹوں کی بنیاد ہوتا ہے، منتخب سیاسی تنظیموں کے منتخب اہل کاروں کی جانب سے عطیات کے لیے شرف اور فورس سے متعلق صنعتوں پر انحصار سے بھی یہ عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ گھروں، اسکولوں، اسپتالوں اور عبادت گاہوں کے قریب موجود کمیونٹی پولیس کی جانب سے تحفظ کی فراہمی کا انحصار بھی اسی مظہر پر ہے۔

جبکہ خصوصی علمی توجہ، طاقت مہیا کرنے والے اداروں اور ان میں حصہ لینے والوں پر مرکوز ہو رہی ہے، تو علم سیاسیات سے توقع رکھنا چاہیے کہ وہ طاقت کے مظہر کے کردار اور عمل کے حوالے سے وسیع آگہی کی فراہمی میں مدد کرے گی۔ لیکن نصابی کتابوں پر جو طلبا کو امریکی سیاسیات، قومی حکومتوں کا موازنہ اور قوموں کے درمیان تعلقات کے امور اور قوموں کے درمیان تعلقات سے متعارف کراتی ہیں، ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ ان میں طاقت صرف بین الحکومتی تعلقات کا زیادہ اہم موضوع ہے اور تشدد کو واقعاتی ثقافتی انحراف سے تعبیر کیا جاتا ہے اور انہیں بنیادی موضوع نہیں بنایا جاتا۔ جدید علم سیاسیات کی اس پابند اور محدود حیثیت کے تناظر میں پیج نے جس تصور پر توجہ مرکوز کی ہے وہ خوش آئند ہے۔ اس کتاب میں اہداف کی وضاحت، جائزوں کے رجحانات اور ان بنیادی عوامل کی تفہیم اور ادراک سے متعلق اہم علمی اور دانش ورانہ اہداف بیان کئے گئے ہیں جن کو اگر نظر انداز کیا گیا تو ہلاکت انگیزی کا عمل نہ صرف جاری رہے گا بلکہ اس مسئلے میں مزید اضافہ بھی ہو جائے گا۔

یہ عالمی پالیسیوں کی کایا پلٹ کا ایک آغاز ہے، جو دیگر مشفقانہ رجحانات کے علاوہ ہلاکت خیزی میں مدد کرنے کی بجائے اس کا سدباب کرے گی۔ یہ ہلاکت گریز متبادلات کی مزید حوصلہ افزائی کی کوششوں کی بنیاد ہے۔ یہ کوششیں مثبت عمل کے اس امکان میں اضافہ کرتی ہیں جو کلچرل ارتقا کی ابھرتی ہوئی سائنس میں پیوست تناظرات سے مطابقت رکھتا ہے۔اس سیاسی ارتقا کو بعض اوقات اسی نوع کے ''خلقی ارتقا'' کے عمل سے ممیّز رکھنے کے لیے "memetic evolution" کہا جاتا ہے۔ ثقافتی ارتقا یا مخلوط ارتقا (co-evolution) کے نظریات کو جرائد اور کتب میں مسلسل نمایاں مقام حاصل ہو رہا ہے۔ گو کہ ان نظریات کو ابھی مقبول عام فریم ورک میں ڈھالنا ہے، تاہم، اولین کلیہ سازیاں بھی انتہائی جامع اور قابل رسائی ہیں۔ ہلاکت گریز تصورات، اداروں اور رواج کے ارتقا کی مزید رہنمائی کے ابھرتے ہوئے امکانات تجویز کرنے کے لیے ہم ان پر انحصار کر سکتے ہیں (ڈاکنز 1976ء اور 1989ء)۔

دیگر تمام memes کی مانند ہلاکت گریزی بطور "memes" __ موضوع، علامت، تخیل، مشق __ برقرار رہتی ہے یا معدوم ہو جاتی ہے، اور بعض نظریہ دانوں کے خیال میں یہ جنوں کی طرح ہے۔ زندگی یا موت کا انحصار برابری یا برتری پر ہے۔ اور ایک memes کی تکرار یا نقل خود تخیل کی طویل عمری کے ذریعے قدر میں اضافہ حاصل کرتی ہے جو ہلاکت گریزی کی memetic ترقی کو فوقیت دیتی ہے۔ یہ فوقیت انسانی حافظے اور عابدوں کے کتب خانوں، عقیدوں، گیتوں، نظموں اور امن پسند مظاہر اور سرگرمیوں کے دیگر اظہار

میں پائے جاتے ہیں۔ ثقافتی یادداشتوں میں محفوظ کیے جانے کے علاوہ، ہلاکت گریز رواجات آسانی سے تصور میں لائے جاسکتے ہیں، متعدد ممالک میں جنہوں نے فوجوں سے قطع تعلق کرلیا ہے، کمیونیٹیز جو سزائے موت ختم کرچکی ہیں، تحقیقِ امن کے ادارے، تنازعات کی ثالثی اور تنازعہ نبٹانے کی خدمات کی فراہمی اس کی مثالیں ہیں۔

ہلاکت گریز رواجات کی زرخیزی کی جانب اشارے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ان رواجوں کو کتنی آسانی سے نقل کیا جاسکتا ہے اور یہ نقل کیے جاچکے ہیں۔ مزید براں، ہلاکت گریزی کے تصوارت اور اداروں کو زندہ رکھنے کے لیے رسمی طور پر ہو بہو نقالی ضروری نہیں ہے۔ فی الواقع، ثقافتوں، طبقوں، مفادات، افراد، صورت حال میں اختلاف اور تغیر، متبادل ہلاکت گریز پالیسیوں کی اثر انگیزی کے لیے تجربہ پیش کرتے ہیں۔

memetic جدت کی کامیاب اور جاری نقالی سے انتہائی قریبی تعلق رکھنے والی حقیقی صورتحال، ان معاون یا غیر معاون ماخذات کا مجموعہ ہے جس کے اندر وہ رسائی رکھتی ہے۔ عالمی سماج کے متعدد شعبوں میں تغیر پذیر صورتحال کی موجودگی میں ہلاکت گریزی کے حق میں پرزور اصرار کا اس سے مناسب وقت بہ مشکل ہی آسکتا ہے۔ اس امر پر غور کریں کہ بیسویں صدی نے سو برس سے بھی کم عرصے میں پوری دنیا میں اولین حقیقی جمہوری ریاستوں کے آغاز اور استحکام اور ان کے پھیلاؤ میں رہنمائی کی ہے۔ (کرتنیکی 2000ء)۔

مراجعت کے واقعات کی اجازت دینے یا توسیع کی شرح میں سست رفتاری کے باوجود جمہوریت کاری کے فروغ سے قطع نظر اس کے تسلسل کے امکانات روشن ہیں۔ یہ

شہادت موجود ہے کہ غیر جمہوری حکومتوں کے مقابلے میں جمہوری حکومتیں آپس میں جنگ کی جانب کم مائل ہوتی ہیں (اوئیل اور رسٹ 1999ء؛ مزید معلومات کے لیے ملاحظہ کریں گوا 1999ء)۔ مزید براں، ممکنہ طور پر جمہوری حکمراں، غیر جمہوری حکمرانوں کے مقابلے میں ایسی پالیسیاں اختیار کرتے ہیں جن سے قحط سالی سے بچا جا سکتا ہے۔ (سین ,82-170 18:199, 51-3, 155-7)۔

جمہوری دور کے آغاز کے ساتھ صرف حکومت یا دولت میں نہیں بلکہ تمام اقدار کی صورت گری اور حصہ داری میں وسیع شراکت کے لیے مابعد جدید فکر بھی آئی۔ احترام، اپنا اور دوسروں کا احترام، ہلاکت گریز اختراعیت کی حمایت کرتا ہے۔ اسی طرح کی memes ہلاکت آفریں اداروں تک میں تشکیل پاتی ہیں، مثلاً پولیس زیادہ ماہرانہ طور پر نیز پُرامن طور پر فسادات اور احتجاجات کے بحران پر قابو پانے کی تربیت حاصل کرتی ہے، فوجی حکام طاقت کے استعمال سے ماورا عالمی پیشہ وارانہ مستند معیار اختیار کرتے ہیں۔ سماج کے دیگر شعبوں میں بھی حقوق کی خلاف ورزیوں اور تشدد کے متبادل پیدا ہوتے ہیں۔ ان شعبوں میں Favor Houses، عدم تشدد پر مبنی نصاب تعلیم اور اصولی اختلافات کی بنیاد میں وسعت جیسے شعبے اور امور شامل ہیں۔

ارتقائی عمل کے فروغ کا جھکاؤ، ہلاکت گریزی کے حق میں رکھنے کا حتمی دار و مدار صرف عزم اور وابستگی اور رائے عامہ کی ساکھ پر منحصر نہیں ہے۔ ان کے لے معلومات کی ایسی بنیادوں کے حصول کی ضرورت ہے جن کے ذریعے عمل کے متبادل راستے اور طریقے تیار اور

نافذ کئے جاسکیں اور ان کی تخمیہ کاری ہوسکے۔ اس پس منظر میں ، ایک ہلاکت گریز علم سیاسیات کی بے پناہ اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

لہٰذا محترم قاری، آپ کی خدمت میں سائنس اور پالیسی کی کتاب پیش کی گئی ہے۔ آپ کو حق حاصل ہے، بلکہ آپ سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ اس وقت تک کوئی فیصلہ نہ سنائیں جب تک آپ ہلاکت گریز عالمی علم سیاسیات کے مقدمے کا سامنا نہ کر چکے ہوں۔ قائل نہ ہونے کی صورت میں، آپ ایک خاموش لیکن اس موثر ہجوم کے درمیان طمانیت حاصل کریں جو ظاہری یا باطنی طور پر قتل اور قتل کی دھمکیوں کو آئینی تسلیم کرتی ہے۔ اگر آپ قائل ہو جاتے ہیں تو آپ کو اس کتاب میں تجویز کردہ مواقع کے پیچیدہ دفاعی ساز و سامان کا ایک جھروکہ نظر آئے گا اور آپ یکساں تناظر رکھنے والے ہر ثقافت ، طبقے ، مفاد اور شخصیت کے مردوں اور عورتوں مین موجود روشن خیالی اور قوت کو یکجا اور متحرک کرنے کے عمل میں شریک ہوں تا کہ کسی بھی صورتحال اور بحران اور دباؤ کی کسی بھی سطح پر آپ جبر و استبداد کے خلاف ترغیب کاری کی حامی حکمت عملیوں کو فروغ دے سکیں۔ یہ وہ جبر اور استبداد ہے جو شرف انسانی کی عالمی دولت مشترکہ میں زندگی کے ہر شعبے کی قدروں کو متاثر کر رہا ہے۔

جیمس اے رابنسن

پینسا کولا، کرسمس ڈے 1999ء

بیجنگ، نیو ایئرس ڈے، 2000ء

حوالہ جات:

☆ ڈاکنس رچرڈ۔1989ء۔مطلب پرست کونیہ۔آکسفورڈ: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔

☆ گووا، جون۔1999ء۔ پرچیاں اور گولیاں: مبہم جمہوری امن۔ پرنسٹن: پرنسٹن یونیورسٹی پریس۔

☆ کراتینکی، ایڈریان۔ 2000ء۔ دی 1999ء فریڈم ہاؤس سروے: ترقی کی ایک صدی۔ جرنل آف ڈیموکریسی،11(1):187-200

☆ لاسویل، ہیرالڈ ڈی۔اور کیلن، ابراہم۔1950ء۔ پاور اینڈ سماج: اے فریم ورک فار پولیٹکل انکوائری۔ نیوہیون، کون: ہیل یونیورسٹی پریس۔

☆ لاسویل، ہیرالڈ ڈی۔اور میکڈوگل مائرس ایس۔1992ء۔جیورس پروڈنس فار اے فری سماج: اسٹڈیز ان لاء، سائنس اینڈ پالیسی۔ نیوہیون، کون: نیوہیون پریس اینڈ ڈارڈ ریخٹ، مارٹنس نج ہوف پریس۔ دو جلدیں

☆ اونیل، جون آر۔اور رسیٹ، بروس۔ 1999ء۔ دی کانٹین پیس: دی پیسیفک بینیفٹس آف ڈیموکریسی، انٹرڈیپنڈنس، اینڈ انٹرنیشنل آرگنائزیشنز۔ ورلڈ پالیٹکس۔7-1:(1)52

☆ پیج، گلینڈ ڈی۔1977ء۔دی سائنٹفک اسٹڈی آف پالیٹکل لیڈرشپ۔ نیویارک: دی فری پریس۔

☆ رابنسن، جیمس اے۔ 1999ء۔ لینڈ مارک امنگ ڈسی شن میکنگ اینڈ پالیسی انالیسس لینڈ ہیمیلیٹ فار انٹی گریٹنگ الٹرنیٹو فریمز آف ریفرنس: گلین ڈی پیج۔ دی کورین ڈسی شن۔ پالیسی سائنسز14-32:301

☆سین، امریتا۔ 1999ء۔ ڈیولپمنٹ ایز فریڈم۔ نیویارک: کناف

☆ سنڈر، رچرڈ سی۔ بابرک، ہنری ڈبلیو؛ اینڈ سپین، برٹن، مدیران۔ 1962ء۔ فارن پالیسی ڈسی شن میکنگ: این اپروچ ٹو دی اسٹڈی آف انٹرنیشنل پالیٹکس۔ نیویارک: دی فری پریس آف گلین کو، میک ملن

باب اوّل

کیا ایک ہلاکت گریز سماج ممکن ہے؟

جب کوئی ایک عام سوال اٹھاتا ہے تو فلسفے کی ابتدا ہوتی ہے اور اسی طرح سائنس کا آغاز ہوتا ہے۔

برٹرینڈ رسل

کوئی ملک جن موضوعات کو زیر بحث لاتا ہے، اس سے اس ملک کے سیاسی ارتقا کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس ملک کی ناکامی اکثر اس بناء پر ہوتی ہے کہ اس نے اپنے آپ سے درست سوالات نہیں کیے تھے۔

جواہر لعل نہرو

کیا ایک ہلاکت گریز سماج کا قیام ممکن ہے؟ اگر نہیں، تو کیوں نہیں؟ اگر ہاں، تو کیوں کر؟

لیکن ''ہلاکت گریز سماج'' کا مطلب کیا ہے؟ ایک انسانی کمیونٹی، سب سے چھوٹی سے لے کر سب سے بڑی، علاقائی سے عالمگیر، جس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ انسان نہ

ہلاک کیے جائیں اور نہ انہیں ہلاک کرنے کی دھمکیاں دی جائیں، جہاں انسانوں کو ہلاک کرنے کے لیے کوئی ہتھیار نہیں بنایا جائے اور نہ ان کے استعمال کو جائز قرار دیا جائے، اور جہاں نظم ونسق برقرار رکھنے یا تبدیلی کے لیے سماج کسی نوعیت کی دھمکی یا ہلاک کرنے والی قوت کے استعمال پر انحصار نہیں کرے گا۔

اس میں نہ انسانی ہلاکتیں ہوں گی اور نہ ہلاکت کی دھمکیاں۔ اس صورتحال کو جانوروں اور دیگر اقسام کی حیات تک وسیع کیا جاسکتا ہے، لیکن ایسے سماج کی کم سے کم خصوصیت انسانوں کو ہلاک نہ کرنا ہے۔ اس میں ہلاک کرنے کی دھمکیاں نہیں دی جائیں گی، اور ہلاکت گریز صورت حال دہشت کے ذریعے نہیں پیدا کی جائے گی۔

اس میں ہلاکت کے لیے ہتھیار موجود نہیں (ان عجائب خانوں کے سوا جہاں انسانی کشت وخون کی تاریخ کی تفصیل موجود ہے) اور نہ وہاں جان لینے کو قانونی طور پر جائز قرار دیا جاتا ہے۔ وہاں قتل کرنے کے لیے ہتھیاروں کی ضرورت ہی نہیں پڑتی ___ مکے اور لاتیں ہی بہت ہیں ___ تاہم عزم یہی ہے کہ نہ اس صلاحیت کو استعمال کیا جائے گا اور نہ اس کو بڑھاوا دینے والی ٹیکنالوجی اختیار کی جائے گی۔ ایک ایسے سماج میں مذاہب ہلاکت آفرینی کی اجازت نہیں دیتے، ہلاک کرنے کے لیے آسمانی احکامات نہیں دیے گئے۔ حکومتیں اسے جائز قرار نہیں دیتیں، حب الوطنی کو اس کی ضرورت نہیں، انقلابی اس کا حکم نہیں دیتے۔ دانشور اس کے لیے عذر پیش نہیں کرتے، فنکار اس پر جشن نہیں مناتے، عوامی دانائی اسے دوام نہیں بخشتی، عقلِ سلیم اسے اچھا نہیں گردانتی۔ عہدِ حاضر میں کمپیوٹر کی اصلاح کے مطابق

ایک ایسا سماج قتل کرنے کے لیے نہ ''ہارڈ ویئر'' فراہم کرتا ہے اور نہ ''سافٹ ویئر''۔

ایسے سماج کا ڈھانچہ ہلاکت آفرینی پر انحصار نہیں کرتا۔ اس میں ایسے سماجی رشتے موجود نہیں ہیں جن کو برقرار رکھنے یا تبدیلی لانے کے لیے واقعتاً ہلاک کرنے یا ہلاک کرنے کی دھمکی دینا ضروری ہو۔ غلبے یا اخراج کا کوئی رشتہ ___ سرحدیں، حکومت کی اقسام، جائیداد، صنف، نسل، گروہیت، طبقہ، روحانی یا سیکولر نظریے کا نظام ___ اپنی حمایت میں یا چیلنج کرنے کے لیے ہلاک کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ایسا سماج پابندیوں سے آزاد اور تضادات سے پاک، یا تنازعات سے مبرا ہوتا ہے۔ اس کا صرف یہ مطلب ہے کہ اس کا ڈھانچہ اور اس کے اعمال نہ تو ہلاکت سے اخذ کیے گئے ہیں اور نہ ہلاکت پر منحصر ہیں۔ اس میں جائز یا ناجائز، ایسا کوئی پیشہ موجود نہیں ہوگا جس کا مقصد ہلاکت ہو۔

ایک ہلاکت گریز سماج میں انسان ہلاک نہیں کیے جاتے اور ہلاکت کی دھمکی بھی نہیں دی جاتی، نہ ایسی ٹیکنالوجی موجود ہوتی ہے، نہ ہلاک کرنے کا کوئی جواز ہوتا ہے اور نہ سماج میں ایسی صورتحال موجود ہوتی ہے جس کا انحصار دھمکی یا مہلک طاقت پر ہو۔

کیا ہلاکت سے پاک سماج ممکن ہے؟

☆☆☆☆☆

ہمارے جوابات کا انحصار، ذاتی تجربے، پیشہ ورانہ تربیت، ثقافت اور سیاق وسباق

پر ہوگا ___ وہ تمام عوامل جنہیں سیاست کے سائنسدان دوسروں کے رجحانات کی تشریح کرنے کے لیے کام میں لاتے ہیں ___ وہ اثرات جن سے ہم خود محفوظ و مامون نہیں ہیں۔

☆☆☆☆☆

یہ قطعاً ناقابلِ تصور ہے!

علم سیاسیات کے بیس امریکی عالموں سے جب سمر سیمینار کے دوران یہ سوال کیا گیا کہ کیا ایک ہلاکت گریز سماج ممکن ہے تو ان کی جانب سے تقریباً یہ متفقہ جواب موصول ہوا۔ اس سیمینار کا اہتمام 1979ء میں نیشنل انڈومنٹ فار دی ہیومینٹی نے کالج کی تدریس میں استعمال ہونے والے مغربی سیاسی نظریات پر مبنی مستند کتابوں کا جائزہ لینے کے لیے کیا تھا۔ اس وقت یہ پوچھا گیا تھا، ''کیا غیر متشدد سیاست اور غیر متشدد علم سیاسیات ممکن ہیں؟'' اس سیمینار میں امریکی علم سیاسیات کے چار بنیادی شعبوں کو یکساں نمائندگی دی گئی تھی: سیاسی نظریہ، امریکی حکومت، تقابلی سیاست، اور بین الاقوامی تعلقات۔ ایک کے سوا تمام عالم مرد تھے۔ تیزی سے دیے جانے والے تین دلائل نے سیمینار کی اختتامی بحث کے خلاصے میں سوال کا حتمی فیصلہ کر دیا۔ اول، انسان فطری طور پر قاتل ہے، وہ ایسا خطرناک سماجی جانور ہے جو ہمیشہ قتل کرنے پر مائل رہتا ہے۔ دوئم، ناکافی وسائل ہمیشہ مقابلے، تنازعے اور قتل کا سبب بنیں گے۔ سوئم، زنا بالجبر کے امکان کی ہر وقت موجودگی کا تقاضہ ہے کہ رشتہ دار خواتین کی

حفاظت کی خاطر مرد ہمہ وقت قتل کرنے کے لیے تیار رہیں۔ (امریکی خاتون کی یہ دلیل صدا بہ صحرا ثابت ہوئی: ''اگر کوئی میرے بچے کی زندگی کے لیے خطرہ بنا تو میں اسے قتل کر دوں گی۔'' ہلاکت گریز سیاسیات کے بارے میں مزید غور وفکر کی ضرورت محسوس نہ کرتے ہوئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ رسمی طور پر جوابی سوال بھی نہ پوچھا جائے: ''آپ عدم تشدد کے ذریعے ہٹلر اور عالمگیر تباہی کو کس طرح روکیں گے؟'') ۔ انسانی فطرت، وسائل کی کمیابی، اور جنسی حملوں کے بنیادی دلائل نے ہلاکت گریز سیاسیات کے عمل اور سائنس کو ناقابلِ غور بنانے کا فریضہ انجام دے دیا۔

مغربی سیاسی فکر کی مستند کتابوں کے تازہ ترین جائزے کا حوالہ بھی غیر ضروری سمجھا گیا۔ چین میں تعزیری ضابطہ پرست رواج اور ہندوستان میں چالاک کوٹلیہ کی ڈالی ہوئی روایت کی طرح ان کے کامل علم نے بھی انہیں اسی نتیجے پر پہنچایا۔ مبہم یا غیر مبہم طور پر قتل کے لیے آمادگی ایک اچھے سماج کے قیام اور دفاع کے لیے لازمی سمجھی جاتی ہے۔

افلاطون (347-427 ق م) کی مثالی 'جمہوریہ' 'Republic' میں، فلسفی حکمران (سرپرست) کو جنگجو طبقے سے لیا گیا تھا جو (ضمنی طور پر) استبداد اور ترغیب کے ذریعے پیداوار کرنے والوں اور غلاموں پر حکومت کرتے تھے۔ مزید برآں، جیسا کہ لیون ہیرالڈ کریگ نے اشارہ کیا ہے، ''ایک غیر متعصب ناظر یہ نتیجہ اخذ کرنے سے شاید ہی بچ سکے کہ (افلاطون کی 'جمہوریہ' میں) جنگ کو سیاسی زندگی کی بنیادی حقیقت سمجھنا چاہیے، اور درحقیقت پوری زندگی کے لیے، اور یہ کہ ہر اہم فیصلہ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا جانا چاہیے۔''

(کریگ 1994ء، cf ساگان 1979ء)

ارسطو (384-322 ق م) کی 'سیاست' 'Politics' میں، پسندیدہ سیاسی نظام میں ___ حکمرانی چاہے ایک کی ہو، چند کی، یا کئی کی ہو___ ہتھیاروں پر اختیار صاحبِ جائیداد لوگوں کا ہوگا، اور غلاموں کو تابع بنائے رکھنے اور دشمن کے قبضے میں جانے سے محفوظ رہنے کے لیے فوجیں ضروری ہیں۔ فوجوں کی اس مستقل ہلاکت آفریں موجودگی کو نہ افلاطون موضوعِ بحث بناتا ہے اور نہ ارسطو اس بارے میں سوال اٹھاتا ہے۔

مشہور و مقبول میکیاویلی (1469-1527) کی مشہور تصنیف 'دی پرنس' میں حکمرانوں کو اپنا اقتدار قائم رکھنے اور اپنی ریاستوں کی طاقت، شہرت، اور وقار میں اضافے کے لیے قتل کرنے کو حق بہ جانب ثابت کرنے کے لیے واضح جواز فراہم کیا گیا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ ''لومڑی'' کی مکاری کے ذریعہ حکومت کی جائے، لیکن بہ وقتِ ضرورت حکمرانوں کو ''شیر'' کی بے باک ہلاکت آفرینی سے پہلوتہی نہیں کرنا چاہیے۔ جمہوری ریاست کی قوت کو استحکام بخشنے کے لیے وہ شہری ملیشیا قائم کرنے کی تجویز پیش کرتا ہے۔

تھامس ہوبس (1588-1679) اپنی کتاب Leriathan میں سماجی نظم وضبط کو قائم رکھنے اور جنگ میں فتح کے لیے حکومتوں کی جانب سے قتل کرنے کے لیے مزید جواز پیش کرتا ہے۔ انسان چونکہ قاتل ہے لہٰذا فطری حالت میں غیر منظّم زندگی کا نتیجہ ایک سفاک بدنظمی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ لیکن انسان سلامتی کا جویا اور متلاشی بھی ہے چنانچہ اسے ایک مرکزی حکمران کی اطاعت کرنی چاہیے اور اسے یہ اختیار دینا چاہیے کہ وہ ان کی سلامتی کے

لیے قتل کر سکے اور اپنی حفاظت کے لیے دوسرے کو ہلاک کرنے کا حق انہیں اپنے لیے محفوظ رکھنا چاہیے۔ ہوبس نے مسلح بغاوت کو جائز قرار دینے سے گریز اختیار کیا ہے۔

یہ کام جان لاک (1632-1704) نے اپنی کتاب 'Two Treaties of Government' (حکومت کے دو اصول) میں انجام دیا ہے۔ وہ افلاطون، ارسطو، میکیاویلی، اور ہوبس کے ساتھ اس امر پر متفق ہے کہ سیاسی حکمرانی ہلاک کرنے کے لیے تیار رہنے کو ضروری بنا دیتی ہے۔ لیکن وہ مزید آگے بڑھ کر انقلابی ہلاکت آفرینی کو حق بہ جانب قرار دیتا ہے۔ جب اقتدار اعلیٰ پر فائز حکمراں مطلق العنان بن جاتا ہے اور ملکیت، آزادی، اور زندگی کے خلقی حقوق پامال کرتا ہے ___ تو جبر و استبداد کے شکار شہریوں کو یہ حق حاصل ہے اور یہ ان کا فرض بنتا ہے کہ وہ اسے تباہ کر دیں۔ جیسے فطری صورتحال میں قاتل کو ہلاک کیا جاتا ہے، بالکل اسی طرح سول سوسائٹی کے شہری ایک جابر حکمراں کو تباہ کر سکتے ہیں۔

ہوبس اور لاک کے، حاکموں اور محکوموں کی ہلاکت آفرینی کے دوہرے جواز کو کارل مارکس (1818-1883) اور فریڈرک اینگلز (1820-1895) نے 'کمیونسٹ مینی فیسٹو' میں معاشی طبقے کی جنگ تک وسعت دے دی۔ صاحبِ جائیداد طبقوں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے مفادات کے تحفظ اور مفادات میں اضافے کے لیے ہلاکت آفرین قوت کا استعمال کریں۔ لیکن جب مادی اور سماجی تعلقات نازک مرحلے پر پہنچ جائیں تو استحصال زدہ طبقات متوقع طور پر سوسائٹی کے معاشی اور سیاسی ڈھانچے کی تبدیلی کے لیے پُرتشدد بغاوت برپا کر سکتے ہیں۔ جدید انتخابی جمہوریت کی بعض مخصوص حالتوں میں پُرامن تبدیلی ممکن ہو سکتی

ہے۔ مستقبل میں جب کبھی معاشی استحصال ختم ہو جائے گا تو طبقاتی بنیاد پر قائم ہلاکت آفرین صورتحال بھی معدوم ہو جائے گی۔ لیکن عبوری دور میں معاشی عوامل کی بناء پر لوگوں کا میلان طبع قتل و غارت کی جانب رہے گا۔

لاک اور مارکس کے درمیانی عرصے میں، ہوبس کے خیالات کی بازگشت کے طور پر ژاں ژاک روسو (1712-1778) اپنی تصنیف 'عمرانی معاہدہ' The Social Contract' میں ریاست کی سیاسی تنظیم کی بنیاد کے طور پر 'عمرانی معاہدے' کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ شہری مجموعی طور پر ریاست کے حاکمِ اعلیٰ بھی ہیں اور رعایا بھی ہیں۔ وہ خود ہی اس برسر اقتدار حکومت کی اطاعت کی پابند ہو جاتے ہیں جو ''عوامی خواہش'' سے ماخوذ قوانین بناتی اور ان کا نفاذ کرتی ہے۔ معاہدے کے تحت ریاست جنگ اور فتح کے حق کی دعویدار ہوتی ہے، غداروں کو سزائے موت دی جا سکتی ہے، اور مجرموں کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ برسرِ اقتدار حکومت شہریوں کو حکم دے سکتی ہے کہ وہ ریاست کے لیے اپنی زندگیاں قربان کریں:

> جب برسر اقتدار حکومت ایک شہری سے کہہ دے: ریاست کے مفاد میں تمہارا مرنا ضروری ہے، تو اسے مر جانا چاہیے، کیونکہ..... اس کی زندگی صرف عطائے فطرت نہیں ہے، بلکہ ریاست کی جانب سے ایک مشروط تحفہ ہے۔
>
> 'عمرانی معاہدہ، دوسرا حصہ، باب پنجم

بنیادی طور پر روسو کا جمہوری سماجی معاہدہ، ہلاکت آفرینی سے جڑا ہوا ہے۔

بیسویں صدی میں، جرمنی کے بااثر سیاسی معاشیات کے ماہر اور عمرانیات کے نظریہ

ساز، میکس ویبر (1920-1864) 'سیاست بطور مقدس پیشہ' میں، جو دراصل 1918ء میں میونخ یونیورسٹی میں کی گئی تقریر پر مبنی ہے، اس خیال کو قطعی طور پر مسترد کر دیتا ہے کہ سیاست ہلاکت گریز پیشہ ہوسکتی ہے۔ ویبر کی رائے کے مطابق، ''سیاست کا فیصلہ کن عنصر تشدد ہے۔'' تاریخی طور پر تمام بالادست سیاسی ادارے اقتدار کے لیے پُرتشدد جدوجہد سے ابھرے تھے۔ نتیجتاً ویبر جدید ریاست کی تشریح ان الفاظ میں کرتا ہے ''ایک ایسی انسانی برادری جو (کامیابی سے) کسی مخصوص سرحد کے اندر جسمانی طاقت کے قانونی استعمال پر کامل اختیار کی دعویدار ہو'' لہٰذا ''جو اپنی اور دوسروں کی روحانی نجات چاہتا ہے، وہ اسے کوچۂ سیاست میں تلاش نہ کرے، کیونکہ سیاست کے مختلف اہداف صرف تشدد کے ذریعہ ہی حاصل کیے جاسکتے ہیں'' ویبر 1958ء:126,78,121)۔

اس لیے یہ بات قابلِ فہم ہے کہ ویبر اور اس کے پیش رو فلسفیوں کے افکار میں مہارت رکھنے والے پروفیسر حضرات کو اسی نتیجے میں پہنچنا چاہیے کہ ہلاکت گریز سیاست اور ہلاکت گریز علمِ سیاسیات 'بعید از قیاس' ہے۔ اساسی پیشہ ورانہ بصیرت کا اظہار 1950ء میں ایک بزرگ امریکی ماہر سیاسیات کے اس جواب میں ہوا جو انہوں نے ایک نوجوان اسکالر کے اس سوال پر دیا کہ وہ 'سیاست' کی وہ تشریح کریں جو ان کی پوری زندگی کے مطالعے کا نچوڑ ہے۔ انہوں نے اپنے پائپ کا ایک کش لیا اور جواب دیا، ''میں نے موت سے متعلق ریاست کی قوت کا مطالعہ کیا ہے۔''

مزید برآں، ہلاکت آفرین فلسفیانہ روایات کی بازگشت جسے تشدد پسند مذہب کی

تائید حاصل ہے، وہ امریکہ کی پوری سیاسی تاریخ اور تہذیب میں پھیلی ہوئی ہے، اس نے شہریوں اور عالموں دونوں کے ذہنوں میں یہ بات راسخ کردی ہے کہ ایک ہلاکت گریز سماج کا وجود ناممکن ہے۔ اس تعین کی بازگشت لیکزنگٹن میں چلنے والی توڑے دار بندوقوں کی آواز جس نے امریکی انقلاب کو چنگاری دکھائی، لاک کے دیے ہوئے جواز کے مطابق اعلانِ آزادی کے ذریعے حکومتِ وقت کی اطاعت سے روگردانی کا اعلان کرنے والے نقارچی کی آواز میں، اور نیوہیمپشائر میں اعلانیہ سرکشی کے نعرے ''آزادی یا موت!'' میں سنائی دیتی ہے۔ ''ریاست کے جنگی ترانے'' میں بھی اس یقین کی گونج سنائی دیتی ہے جو کنفیڈریٹ باغیوں پر یونین کی فتح کا جذبہ پیدا کرتی ہے، اور ''امریکہ کی جنوبی ریاستوں'' کی آہستہ رو گستاخانہ سرکشی میں، اور دور دراز علاقوں اور سمندروں میں جنگ میں مصروف لوگوں کے 'بحری ترانے' میں ___ صدر کے کمانڈر ان چیف کے طور پر عہدہ سنبھالنے کے وقت 21 روپوں کی سلامی میں بھی اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے جو قوم کے متشدد ماضی اور موجودہ فوجی قوت کی یاددہانی کراتی ہے۔ پرچم کشائی کی تقریب، قومی ترانے کے بجنے، اور مسلح حفاظتی دستوں کی موجودگی اور یہ صدارتی دعا کہ ''خدا امریکہ پر برکت نازل کرے'' (ٹوئن 1970)[1] وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے قربانی دینے اور قتلِ عام کرنے کے جذبات ابھارے جاتے ہیں۔

امریکہ کی ابتدا، اس کی سرحدوں میں توسیع، قومی ہم آہنگی اور عالمی طاقت بننے میں اس کی مدد قتال نے کی۔ ملک کے اندر یا ملک کے باہر مارے جانے والے یا زخمی ہونے

والے، فوجی یا شہری ہوں، ہلاک ہونے والوں یا زخمیوں کا انداہ کرنا ابھی باقی ہے اور یقیناً وہ بے شمار ہیں، لیکن امریکی ریاست کی ہلاکت آفرینی کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دیگر ممالک میں سیاسیات کے عالموں سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی سیاسی تشخص پر زیادہ یا کم قتل عام کے اثر انداز ہونے کے بارے میں روشنی ڈالیں۔

غلاموں کی محکومی برقرار رکھتے ہوئے، ایک جدید قوم نے شاہی نوآبادیاتی حکومت کے خلاف مسلح عوامی بغاوت کا آغاز کیا۔ آزادی کے پرچم تلے اس نے مقامی آبادی پر خونیں فتوحات کے ذریعے، شمال اور جنوب کے پڑوسیوں کے خلاف طاقت کے استعمال کے ذریعے اور ٹکراؤ کے مقابلے میں معیشت کو ترجیح دینے والوں کی جائیدادوں پر حقوق کو ساقط کر کے یا خریداری کے ذریعے اپنی براعظمی قلمرو میں توسیع کی۔ ریاست نے خانہ جنگی کے ذریعہ جبری طور سے قومی یکجہتی مسلط کی، جس کے لیے 74,542 کنفیڈریٹ فوجیوں کو قتل کیا گیا اور یونین کے 140,414 سپاہی قربان کر دیے گئے۔

اپنے آپ کو سمندر پار تک پھیلاتے ہوئے امریکی ریاست نے ہوائی (1898)، پوئیرٹو روکو، گوام، اور فلپائن (1898)، مشرقی سموا (1899) اور بحرالکاہل کے جزائر (1945) پر تسلط حاصل کر لیا۔ فلپائن میں اس نے نوآبادیات کے خلاف برپا ہونے والی بغاوت (1898-1902) کو جبر و استبداد کے ذریعہ کچل دیا اور انضمام کی مخالفت کرنے والے متعدد مسلمانوں کا بے تحاشہ قتل عام کیا (1901-1913)۔ تنہائی پسند جاپان کو بحری طاقت کے استعمال کی دھمکی دے کر اسے بیرونی تجارت کے لیے کھول دیا (1853-1854)۔

اس ابھرتی ہوئی قوم نے جنگوں اور مداخلت کاریوں کے ذریعے اپنے مفادات کو آگے بڑھایا اوران کا تحفظ کیا۔ امریکہ نے برطانیہ کے خلاف جنگ (14-1812)، میکسیکو کے خلاف (48-1846)، اسپین کے خلاف (1898)، جرمنی، آسٹریا، ہنگری، ترکی اور بلغاریہ کے خلاف (18-1916)، جاپان، جرمنی اور اٹلی کے خلاف (45-1941)، شمالی کوریا اور چین کے (53-1950)، شمالی ویتنام (75-1961)، اور عراق کے خلاف (1991) کی جنگیں لڑیں۔ مسلح مداخلتوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے: پیکنگ (1900)، پناما (1903)، روس (19-1918)، نکاراگوا (25-1912)، ہیٹی (34-1915)، لبنان (1958)، ڈومینیکن ری پبلک (66-1965) اور صومالیہ (1992)۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے گرینا ڈا میں (1983) اور پناما میں (1989) مداخلت کر کے حکومتوں کو اقتدار سے معزول کر دیا اور مداخلت کی دھمکی دے کر ہیٹی (1992) میں حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ مداخلت یا حملوں کے ذریعہ اس نے کمبوڈیا (1970) اور لاؤس (1971) میں امتناع کی راہ اختیار کی، لیبیا (1986)، افغانستان (1998)، اور سوڈان (1998) میں انتقام لینے کے لیے حملے کیے اور عراق (1993)، بوسنیا (1995) اور یوگوسلاویہ (1999) میں جنگی اور حربی مفادات آگے بڑھانے کا عزم ظاہر کرنے کے لیے حملے کیے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے دوسری عالمی جنگ کے بعد آدھی صدی کے دوران، سرمایہ داری مخالف ریاستوں، انقلابیوں اور دیگر دشمنوں پر دنیا بھر میں غلبہ پانے کے لیے ہلاکت آفرینی کی اپنی استعداد میں بے پناہ اضافہ کرلیا۔ انقلاب امریکہ کے زمانے میں ایک

ہزار سے بھی کم پر مشتمل باقاعدہ مسلح افواج کی تعداد 1990ء کے عشرے میں پندرہ لاکھ مردوں اور خواتین تک پہنچ چکی تھی، ان کی پشت پر پنٹاگون (امریکی محکمۂ دفاع) کے 23,000 منصوبہ ساز، ایک اختراعی سائنسی اشرافیہ، اور دنیا میں اسلحہ سازی کی جدید ترین صنعت موجود ہے۔ یہ سب اس طرح ممکن ہوا کہ ان اخراجات کے لیے ٹیکس دہندگان کے چوتھائی ٹریلین ڈالر ہر سال کانگریس اور صدر کی جانب سے منظور کیے جاتے تھے۔ ایک محتاط تخمینے کے مطابق 96-1940ء کے دوران امریکہ کے صرف جوہری ہتھیاروں کے پروگرام پر قوم کو 5.821 ٹریلین ڈالر خرچ کرنا پڑے ہیں (شوارٹز 1998ء)۔ ریاستہائے متحدہ کے تصرف میں کسی بھی دوسرے ملک سے زیادہ سمندر پار اڈے ہیں، وہ غیر ممالک میں زیادہ فوجی طاقت منتقل کر چکا ہے، زیادہ فوجی اتحاد قائم کر چکا ہے، اور دوسرے ملکوں کی نسبت بیرونی افواج کو زیادہ سے زیادہ تربیت اور اسلحہ سے لیس کر رہا ہے (یہ لوگ اس کے دشمنوں کے قاتل، بعض اوقات اس کے دوستوں کے قاتل، اور یہاں تک کہ اس کے اپنے قوم کے قاتل ہیں)۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ دنیا کی مسابقتی، نفع بخش، اسلحہ منڈی میں ہتھیاروں کا سب سے بڑا فراہم کنندہ بن چکا ہے۔ انسان نے اب تک جس قدر ہلاکت آفریں ایجادات کی ہیں، اس حوالے سے ریاستہائے متحدہ امریکہ اس صلاحیت کا مالک بن چکا ہے کہ وہ انتہائی تباہ کن ہتھیاروں کے ذریعے کرۂ ارض کی زمین، سمندر اور فضا میں ہر جگہ قتلِ عام کر سکتا ہے۔

1990ء کے عشرے تک، جنگ کے ذریعے قائم ہونے والا ریاستہائے متحدہ امریکہ

1776ء کے اعلانِ آزادی کے بعد سفر کرتے ہوئے اس دعوے تک پہنچ گیا ہے کہ وہ ''دنیا کی واحد سب سے بڑی فوجی طاقت اور دنیا کی قیادت کرنے والی معیشت ہے'' (صدر ولیم جے۔کلنٹن، قوم سے خطاب، 19 فروری 1993ء)۔ جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے چیئرمین، آرمی جنرل شلیکا شویلی کے الفاظ میں، ریاستہائے متحدہ امریکہ ''عالمی مفادات'' کے ساتھ ایک ''عالمی قوم'' بن چکی ہے۔ 1995ء میں جاپان پر جوہری بم کی فتح کی 50ویں سالگرہ کا جشن مناتے ہوئے صدر امریکہ نے ہوائی میں جمع ہونے والے تینوں مسلح افواج کے جوانوں سے عہد کیا، ''آپ پوری دنیا میں ہمیشہ بہترین تربیت یافتہ اور بہترین اسلحے سے لیس لڑاکا قوت رہیں گے۔'' انہوں نے اعلان کیا: ''ہمیں کرۂ ارض پر سب سے زیادہ طاقتور رہنا ہے تاکہ ہم اپنے عہد میں تاریکی کی قوتوں کو شکست دے سکیں۔'' اس عزم کی عکاسی چیف اف اسٹاف جنرل رونالڈ فوگل مین نے 1996ء میں ایئر فورس اسٹریٹجک پلاننگ کی صراحت کرتے ہوئے کی تھی، ''ہمارا ہدف، تلاش کرنا، سخت نگرانی کرنا، تعاقب کرنا، اور زمین پر حرکت کرنے والی ہر شے کو نشانے کی زد پر رکھنا ہے۔'' انہوں نے مزید انکشاف کیا، ''اب ہم یہ کام انجام دے سکتے ہیں، لیکن بروقت نہیں'' (وقوعہ کے وقت نہیں)۔ (ہیری ٹیج فاؤنڈیشن، واشنگٹن، ڈی سی۔ میں 13 دسمبر 1996ء میں خطاب)۔

بیسویں صدی جب اختتام پر پہنچ رہی تھی تو امریکی رہنماؤں کی روایتی خواہش تھی کہ اسے ''امریکی صدی'' سے تعبیر کریں اور اس عزم کا اظہار کریں کہ تیسرے ہزارے کی اولین صدی کو ''دوسری امریکی صدی'' بنایا جائے گا۔ اس نوع کے تشدد کے زیرِ اثر فتح مندی کی

روایات کے درمیان ہلاکت گریز ریاستہائے متحدہ امریکہ کے بارے میں سوچنا ناقابلِ تصور ہے۔قتل عام اور قتلِ عام کی دھمکی کے ذریعے قومی آزادی کی بنا ڈالی گئی، غلامی کا خاتمہ کیا گیا، نازی ازم اور فاشزم کو شکست دی گئی، عالمگیر تباہی کا خاتمہ کیا گیا، ایٹم بم کا شکار ہونے والے جاپان میں زندگیاں بچائی گئیں، عالمی سطح پر کمیونسٹوں کی توسیع پسندی کو روکا گیا، سوویت ایمپائر کے انہدام کے اسباب پیدا کیے گئے اور اب وہ اس دعوے پر پورا اترتا نظر آتا ہے کہ اکیسویں صدی کے پورے عرصے کے دوران وہ جمہوری آزادی اور سرمایہ دارانہ معیشتوں کے نفوذ کے لیے رہنما قوت بن جائے گا۔

ایسے امریکیوں کے لیے جو سینئر پروفیسر ہوں یا علم سیاسیات کے مبتدی طلبا، اس بات کو ماننے کے لیے نہ فلسفے کی ضرورت ہے اور نہ قومی سیاسی روایت کی کہ ایک ہلاکت گریز سماج کا قیام ناممکن ہے۔روزمرہ زندگی میں ہونے والے قتال اس بات کی تصدیق کر دیتے ہیں۔

اپنے ہم وطنوں کے ہاتھوں ہر سال 15 ہزار سے زائد امریکی ہلاک کر دیے جاتے ہیں (1999ء میں 15,533؛ فی ایک لاکھ پر 5.7 افراد، 1900 میں یہ شرح 1.2 تھی)۔ قتل کی جن وارداتوں کا اندراج کیا جاتا ہے، ان میں پولیس یا شہریوں کی جانب سے کیے جانے والے ''جائز قتل'' کو شامل نہیں کیا جاتا (1999ء میں ان کی تعداد 294 اور 188 تھی) دوسری عالمی جنگ کے بعد سے قتل ہونے والوں کی تعداد (اندازے کے مطابق لگ بھگ 750,000) قوم کی تمام اہم جنگوں کے دوران ہونے والی ہلاکتوں (650,053)

سے آگے نکل گئی تھی۔ ''اشتعال سے بھرپور حملے'' (1999ء میں 916,383؛ 336.1 فی ایک لاکھ)، ایسے ہتھیاروں کے ساتھ حملے جو ہلاک کرنے یا مہلک زخم پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہوں، (فیڈرل بیورو آف انویسٹی گیشن 2000ء: 32,23,13)۔ امریکی سول سوسائٹی میں قتل کے مقابلے میں خودکشیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے (1995ء میں 31,284؛ 11.9 فی ایک لاکھ)۔ اقدام خودکشی کی تعداد 25 گنا زیادہ ہے۔ اندازوں کے مطابق سالانہ 10 لاکھ سے زیادہ اسقاط کرائے جاتے ہیں۔

امریکی قتل کرنے کے یہ طریقے استعمال کرتے ہیں: شدت سے ضرب لگانا، سر قلم کرنا، بم سے اڑانا، آگ میں جلانا؛ غرقاب کرنا، پھانسی پر لٹکانا، دھکا دینا، اور زہر دینا؛ خنجر کے وار کرنا، گلا گھونٹنا، گلے میں پھندا ڈالنا اور زیادہ تر گولی مار دینا (1999ء میں 64.5 فیصد)۔ قتل کی نوعیت پہلے سے منصوبہ بندی، فوری اشتعال، پیشہ ورانہ اور حادثاتی واقعہ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ازدواجی زیادتی، بچوں سے بدفعلی، بڑوں سے زیادتی، لفظی تکرار، شرابیوں کا فساد، منشیات کی تجارت میں دھوکہ بازی، سماج دشمن گروہوں کے جھگڑے، قمار بازی، رقابت، اغوا، جسم فروشی، زنا بالجبر، ڈاکہ زنی، جرم کی پردہ پوشی، اور ''آسمانی'' یا 'شیطانی'' فرمان کے تحت ہونے والے قتل بھی شامل ہیں۔ حقیقی طور پر کوئی جگہ محفوظ نہیں ہے: گھر، اسکول، گلیاں، شاہراہیں، کام اور عبادت کی جگہیں، جیل خانے، پارک، قصبے، شہر، ویرانے اور قومی حکومت کی مرکزی عمارت۔ موت کا نشانہ بننے والوں کو انفرادی طور پر، یکے بعد دیگرے، اجتماعی طور پر اور بے وجہ قتل کر دیا جاتا ہے؛ زیادہ تر مرد

(1999ء میں 76 فیصد)۔لیکن 85-1976ء کے دوران ازدواجی قتل کے واقعات میں بیویوں کی تعداد (9480) کے مقابلے میں شوہروں کی تعداد کم تھی (7,115) (مرسی اور سالٹز مان 1989ء)۔قاتلوں میں تنہا افراد، جوڑے، گروہ، فرقہ پرست، جرائم پیشہ گروہوں کی انجمنیں، دہشت گرد اور جب قانون کا نفاذ کر رہے ہوں تو اس کام میں ریاست کے ملازم بھی شامل ہوتے ہیں۔مشہور قاتلوں میں غالب اکثریت مردوں کی ہے (1999ء میں 1,046 خواتین کے مقابلے میں 9,140 مرد)، اور ان میں نوجوانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔1980ء میں لگائے جانے والے تخمینے کے مطابق ''ایک امریکی کی زندگی میں ایک موقع ایسا ہوتا ہے کہ وہ قتل کا شکار ہو جائے، یہ تناسب سفید فاموں میں 240 میں سے ایک اور سیاہ فاموں اور دیگر اقلیتوں میں 47 میں سے ایک ہے'' (روزن برگ اینڈ مرسی 1986ء: 376)۔27 جنوری 1998ء کو صدر کلنٹن کے یونین ایڈریس کے جواب میں سینیٹ میں ریپبلکن اکثریتی رہنما ٹرنٹ لاٹ نے قومی ٹیلی وژن پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا: ''تشدد پر مبنی جرائم ہمارے ملک کو آزاد انسانوں کی سرزمین کی بجائے خوفزدہ انسانوں کی سرزمین بنا رہے ہیں۔''

نیوز میڈیا روزانہ امریکی ہلاکت آفرینی کی تصدیق کرتا ہے۔ایک بیٹی اپنی ماں کا سر قلم کر کے پولیس اسٹیشن تک جاتی ہے، اور اسے فٹ پاتھ پر پھینک دیتی ہے۔ایک ماں اپنے دو بیٹوں کو غرقاب کر دیتی ہے؛ دو بیٹے اپنے والدین کو قتل کر دیتے ہیں۔ایک سیریل کلر طوائفوں کو اپنا نشانہ بناتا ہے؛ ایک ہم جنس پرست بدکاری کی ترغیب دیتا ہے، اپنے نوجوان

شکار کے اعضا کی قطع برید کرتا ہے، ان کے بدن کے ٹکڑے ریفریجریٹر میں محفوظ کر لیتا ہے، اور پھر اس گوشت کو کھاتا ہے۔ چھپ کر گولی چلانے والا ایک شخص یونیورسٹی میں پندرہ افراد کو قتل کر دیتا ہے۔ ایک دیہی مڈل اسکول میں رائفلوں سے مسلح دو لڑکے اپنی چار ہم جماعت لڑکیوں اور ایک ٹیچر کو ہلاک، ایک دوسرے ٹیچر اور نو مزید ہم جماعتوں کو زخمی کر دیتے ہیں۔ کولمبائن ہائی اسکول، لٹل سن، کولوریڈو میں بھاری ہتھیاروں سے مسلح لڑکوں نے 13 ہم جماعتوں کو ہلاک اور 28 کو زخمی کیا، اور پھر خودکشی کر لی۔ 99-1996ء کے دوران 11 سے 18 کی عمر کے اسکول کے طلبا نے 27 ساتھیوں، طلبا، دو ٹیچروں، تین والدین کو ہلاک کیا اور 65 دیگر کو زخمی کیا۔ خودکار ہتھیار سے ایک شخص شہری اسکول کے بچوں کا، ان کے کھیل کے میدان میں قتل عام کر دیتا ہے۔ ویتنام جنگ میں حصہ لینے والا ایک شخص فاسٹ فوڈ فیملی ریسٹورینٹ میں موجود گاہکوں پر مشین گن سے حملہ کر کے 20 کو ہلاک اور 13 کو زخمی کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ دو بدو فوجی لڑائی کا ماہر ایک دوسرا شخص چرچ میں گھس کر عبادت میں مصروف لوگوں کا قتل عام کرتا ہے، ساتھ ہی بلند آواز میں کہتا جاتا ہے ''میں اس سے پیشتر ایک ہزار قتل کر چکا ہوں اور ایک ہزار مزید کروں گا۔''

ہابس کی خوفزدہ کر دینے والی غارت گری کے خلاف شہریوں کی صف آرائی اور ویبر کے نظریات پر مبنی ریاست کے بارے میں لاک جیسی بے اعتمادی میں مبتلا مسلح افراد کے پاس لگ بھگ بیس کروڑ بندوقیں..... کم از کم سات کروڑ رائفلیں، ساڑھے چھ کروڑ ہینڈ گنیں، چار کروڑ نوے لاکھ شاٹ گنیں، اور اسّی لاکھ دیگر دور مار گنیں موجود ہیں (کک اینڈ لڈوگ

1997ء) ہتھیاروں کی تجارت ..... ان کے کارخانے، ان کی فروخت، درآمد اور برآمد ..... ہزارہا قانونی اور غیر قانونی ڈیلروں کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ چار کروڑ چالیس لاکھ بالغ امریکی شہری آتشیں اسلحے کے مالک ہیں، ایک تخمینے کے مطابق یہ اسلحہ کم از کم ایک تہائی امریکی خاندانوں میں موجود ہے۔ بیشتر بچے ان کو تلاش کر لینے کی اہلیت رکھتے ہیں جبکہ والدین کے خیال میں وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ قوم کی خاتونِ اول، ہیلری کلنٹن، چلڈرنز ڈیفنس فنڈ کے تخمینوں پر مبنی حقائق بیان کرتی ہیں کہ روزانہ ایک لاکھ پینتیس ہزار بچے پستول اور دیگر ہتھیار اسکول لے کر جاتے ہیں (22 فروری 1996ء کو ناشوا، نیو ہیمپشائر میں خطاب)۔ کہا جاتا ہے کہ شہری اپنی حفاظت، شکار، تفریح اور حکومتی جبر کے خلاف مزاحمت کے لیے اسلحہ رکھنے کے حق کا دعویٰ کرتے ہیں جو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے آئین میں 1791ء کی دوسری ترمیم کے ذریعے ناقابلِ تقسیم حق کے طور پر ودیعت کیا گیا ہے: ''ایک آزاد ریاست کی سلامتی کے لیے ایک بہترین منظّم ملیشیا کا ہونا ضروری ہے، چنانچہ عوام کا اسلحہ خریدنے اور اس کے استعمال کا حق فسخ نہیں کیا جا سکتا۔''

ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مسلح پولیس داخلی ہلاکت آفرینی کے خطرے کے مقابل صف آرا ہے۔ ان میں قانون کا نفاذ کرنے والے وفاقی ایجنٹوں کے ساتھ ریاستی اور مقامی پولیس شامل ہے (1999ء میں 641,208 افسران؛ گویا ایک لاکھ افراد پر 250 افسران)۔ 1999ء میں 42 افسران قتل کیے گئے (فیڈرل بیورو آف انویسٹی گیشن 2000ء:91)۔ ان کو نیشنل گارڈ کے ریاستی یونٹوں اور ریاستہائے متحدہ کی وفاقی مسلح افواج

کے ذریعے بہ وقتِ ضرورت قوت بہم پہنچائی جاتی ہے۔مختلف جرائم میں دس لاکھ اسّی ہزار سے زیادہ سزا یافتہ قیدی ہیں،ان میں 1999ء میں سزائے موت کے منتظر 3,527 مجرم بھی شامل ہیں (بیورو آف جسٹس 2000b:2000a)۔ وفاقی جرائم کے لیے 50 ریاستوں میں سے 38 میں سزائے موت بدستور نافذ ہے۔ 1977ء تا 1999ء کے دوران مجموعی طور پر 598 لوگوں کو موت کی سزا دی گئی۔ بیسویں صدی کے خاتمے پر بڑھتے ہوئے جرائم کے خوف اور بظاہر بے لگام تشدد کے درمیان ایسی تشویش ناک آوازیں بلند ہورہی ہیں کہ سزائے موت میں توسیع یا اس کا دوبارہ نفاذ کیا جائے،سڑکوں پر مزید پولیس والوں کو تعینات کیا جائے،زیادہ لمبی مدت کی سزائے قید نافذ کی جائے اور مزید جیل خانے تعمیر کیے جائیں۔

امریکہ میں تشدد کی تربیت سماجی طور پر حاصل ہوتی ہے اور ثقافتی طور پر اس کو کمک پہنچتی ہے۔رسمی اور غیر رسمی طور پر، قانونی اور غیر قانونی طور پر لوگوں کو سکھایا جاتا ہے کہ قتل کس طرح کیا جائے۔ دو کروڑ بیس لاکھ سے زیادہ سابق فوجی ہلاکت آفرینی کے لیے پیشہ ورانہ تربیت حاصل کرنے والے گریجویٹ کہے جاسکتے ہیں۔(24,800,000،1999ء میں) تقریباً 4 بالغ مردوں میں ایک سابق فوجی ہے۔ بہت سے جونیئر ہائی اسکولوں، ہائی اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ابتدائی فوجی تربیت فراہم کی جاتی ہے۔کاروباری حلقے خود حفاظتی میں قتل کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔نجی ملیشیاؤں کو دو بدو لڑائی کی تربیت دی جاتی ہے؛ سڑکوں پر پھرنے والے غنڈوں کے گروہ قتل کرنے کے لیے معاشرتی میلان پیدا کرتے ہیں؛ جیل خانے غارت گری کے کالجوں کے طور پر خدمات ادا کرتے ہیں۔کرائے کے

فوجیوں کے میگزین لڑائی کے فنی پہلو سکھاتے ہیں، ہتھیار فروخت کرتے ہیں اور کرائے پر دستیاب قاتلوں کے بارے میں اشتہارات شائع کرتے ہیں۔ وڈیو اور کمپیوٹر گیمز، نوجوان کھلاڑیوں کو سڑکوں کی لڑائی سے لے کر زمینی، ہوائی، بحری اور خلائی جنگ میں قتل کرنے کی نقالی کرنے میں مصروف رکھتے ہیں، جس میں وسیع پیمانے پر ہلاکت آفریں فنی پہلوؤں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ "virtual reality" کا کاروبار کرنے والے، ''ایڈرینا لائن کی سطح بڑھانے''، قتل کرو یا قتل ہو جاؤ پر مبنی تفریحی تجربات کی تجارت کرتے ہیں۔ ایک وقت کالج کیمپسوں میں یہ روچلتی ہے کہ ساتھی طلبا کو ''قتل کرنے'' کا کھیل کھیلا جائے۔ حقیقی اور نقلی قتل، بچپن میں کھلونا ہتھیاروں سے کھیلنے کی فطری توسیع معلوم ہوتے ہیں۔

ہلاکت آفرینی کے لیے نیا بتی تربیت اور انسانی زندگی کی اقدار سے بے حسی مواصلاتی ذرائع سے فراہم کی جاتی ہیں۔ کارٹون، فلموں، ٹیلی وژن اور ریڈیو پروگراموں، گیت، کتابوں اور تجارتی اشتہارات کے خالق استاد ہیں۔ بچپن سے بلوغت تک کے عرصے میں ذہن پر تشدد کی ہزار ہا شبہیبیں اپنا عکس چھوڑ چکی ہوئی ہیں، ڈرمائی انداز میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ہیرو اور ولن کے ذریعہ لوگوں، جائیدادوں، حیوانوں اور فطرت کو کس کس طرح تباہ کیا جاسکتا ہے۔ آہستہ آہستہ کشت وخون اور بربریت کی تصویریں، تیزی سے جنسی مناظر سے متعلق ہو جاتی ہیں۔ خاص طور سے پُرتشدد فلموں کے اشتہارات میں جن کے پسِ پشت ہلاکت آفرینی کے لیے تحت الشعوری رغبت پیدا کی جاتی ہے۔

تاریخ میں کسی قوم کے ذہنوں پر اتنی زیادہ ہلاکت خیز تصویروں کے نقش ثبت نہیں

ہوئے ہوں گے۔ کمانڈوز اور قاتلوں کی تربیت کرتے ہوئے قتل کرنے میں جھجک پر قابو پانے کے لیے ایک آزمودہ فوجی تکنیک ان کو جبری طور پر گھناؤنے مظالم کی فلمیں دیکھنے پر مجبور کرنا ہے.....سر کو شکنجے میں جکڑ کر آنکھوں کو بند ہونے سے روکے رکھنا (واٹسن 1978ء: 248-51)..... یہ ایسا ہی ہے جیسے پوری قوم کو زندگی کے احترام سے عاری کیا جا رہا ہے تاکہ وہ قتل کو غیر جذباتی طور پر قبول کر لے۔ جج حضرات کا کہنا ہے کہ نابالغ قاتلوں میں بتدریج انسانی زندگی کے لیے احترام ختم ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ سول سوسائٹی کے لیے کتنا ہی نقصان دہ ہو لیکن پُرتشدد ذرائع ابلاغ کا پھیلاؤ ایک ایسی ریاست کے لیے فائدہ مند ہے جسے پیشہ ور محبِّ وطن قاتلوں کی ضرورت ہے۔ فوجی بھرتی کے دس لاکھ ڈالر کے ایک اشتہار میں اس کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے اور اسے سپر باؤل امریکی فٹ بال کے کھیل کی براہ راست ٹیلی وژن نشریات پر دکھایا جاتا ہے۔ کروڑوں ناظرین دیکھتے ہیں کہ ایک وڈیو گیم میں سے شمشیر برہنہ لہراتا ہوا ازمنۂ وسطیٰ کا ایک سورما چشم زدن میں تلوار کی نوک سے سلامی پیش کرتا ہوا ریاستہائے متحدہ کا آج کا ایک میرین افسر بن جاتا ہے۔

زبان، ہلاکت آفرینی کو راسخ کرتی ہے اور اسے تقویت پہنچاتی ہے اور ایسا وہ فطری پن اور ناگزیریت کے احساس کے ذریعے کرتی ہے۔ امریکی معیشت کی بنیاد آزاد انٹرپرائز کیپٹل ازم پر قائم ہے۔ امریکی روزمرہ کی زبان میں بولتے ہیں ''اسٹاک مارکیٹ میں قتل عام کرنا''؛ وال اسٹریٹ کی ایک کہاوت ہے ''گلیوں میں جب خون بہہ رہا ہو تو آپ خریداری کرتے ہیں''؛ اور تجارتی ادارے ''قیمتوں کی جنگ'' میں مقابلہ کرتے ہیں۔ امریکی

سیاست آزاد انتخابی جمہوریت پر مبنی ہے۔ انتخابی مہم چلانے والے کارکنوں کو ''فوجی دستہ'' یا ''پیدل سپاہی'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے؛ مجالسِ قانون ساز میں بل ''قتل'' کر دیے جاتے ہیں؛ اور غربت، جرائم، منشیات اور دیگر مسائل پر قوم ''جنگ جاری رکھتی ہے۔'' بیس بال امریکہ کا قومی کھیل ہے۔ ناخوش اور ناراض پرستار اپنے غصے کا اظہار کرتے ہوئے نعرہ لگاتے ہیں کہ ''ایمپائر کو قتل کر دو!'' کھیل پر رواں تبصرہ کرنے والے مبصر فٹ بال کی مضبوط ٹیموں کو ''قاتل'' کہہ کر پکارتے ہیں؛ کھلاڑیوں کو ''جنگی ہتھیار'' کہا جاتا ہے؛ گیند ایک کھلاڑی سے دوسرے کھلاڑی کے ہاتھ میں منتقل ہوتے ہوئے ''لانگ بم'' کہلاتی ہے؛ ناکام ٹیموں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ''قاتلانہ جبلت سے محروم'' تھیں۔ امن کے شہزادے کی پرستش کرتے ہوئے، مذہبی آزادی پر غرور میں مبتلا، امریکی نغمہ گاتے ہیں''، ''عیسائی فوجیو آگے بڑھو'' اور عیسائی صلیبی جنگوں اور جہادی جذبے کی عکاسی کرتے ہوئے، ''صلیبی سپاہیوں'' کے طور پر، طائفہ بنا کر ''زینۂ یعقوب'' پر چڑھتے ہیں۔ زندگی میں فارغ لمحوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے امریکی اسے ''وقت کا قتل'' کہتے ہیں۔

نسل پرستی اور جنس پرستی کی زبان کے نقصان دہ اثرات کی بڑھتی ہوئی آگہی کے باوجود، امریکی فراٹے سے ہلاکت آفرینی کی زبان بولتے رہتے ہیں۔ امریکی انگلش کے لسانی ''اسلحہ خانے'' میں ایسی اصطلاحات پائی جاتی ہیں جن میں معلوم تاریخ کے تمام اسلحے کا تذکرہ محفوظ ہے، ان کے استعمال کے طریقے اور ان کے اثرات سامنے آجاتے ہیں۔ غداری ''پشت میں خنجر پیوست کرنا'' ہے؛ بجٹ پر کلہاڑی چلائی جاتی ہے اور کسی معاملے میں

کوشش کا مطلب ہے ''نشانے پر گولی چلانا''؛ نظریات کو ''تار پیڈو'' کر دیا جاتا ہے''؛ حزب اختلاف کے لیے ''طیارہ شکن گولہ باری'' کی اصطلاح رائج ہے؛ اور عمل کے نتائج کو ''صف سے باہر نکل جانا'' کہا جاتا ہے۔ وکلاء ''کرائے کی بندوقیں'' ہیں۔ کسی خوبصورت فلم اسٹار کو اصطلاحاً ''گورے رنگ اور سنہرے بالوں والا بم'' کہا جاتا ہے۔

دوسری جانب، حقیقی قتل کو رواجاً خوش گفتاری کا لبادہ پہنا دیا جاتا ہے۔ دنیا کا پہلا ایٹم بم B-29 بمبار طیارے سے ہیروشیما پر گرایا جاتا ہے اور اسے ''ننھا بچہ'' کے نام سے پکارا جاتا ہے، طیارے کو پائلٹ کی ماں کے حوالے سے ''اینولا گے'' (Enola Gay) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگلا پلوٹونیم بم ''موٹا آدمی'' ناگاساکی پر ''بوک کی کار'' کے ذریعے گرایا جاتا ہے۔ شہری آبادی کے بے تحاشہ قتل عام کی صلاحیت کے حامل بین براعظمی جوہری میزائلوں کو ''صلح جُو'' کہا جاتا ہے۔ جنگ و جدل کی زبان کی جگہ کھیلوں کی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ قتل عام کے لیے تیاری کی فوجی مشقوں کو ''کھیل'' کہا جاتا ہے۔ دوران جنگ شہری آبادی یا خود اپنے فوجیوں کے قتل کو ''ضمنی ہرجانہ'' Collateral Damage کہا جاتا ہے۔ سابق صدر رونالڈ ریگن نے اس بارے میں یوں اظہار خیال کیا تھا، ''جدید تاریخ میں امریکہ جنگ کے لیے کم سے کم تیار، ایک انتہائی پُرامن ملک ہے''۔ (پی بی ایس 1993ء)۔

امریکہ میں ہلاکت آفرینی کے عناصر باقاعدگی سے امریکی شہریوں کے درمیان اور خود اپنے اور ریاستی ایجنٹوں کے درمیان اجتماعی تشدد کا ارتکاب کرتے ہیں۔ 1992ء ایک

سیاہ فام باشندے کے خلاف پولیس کی بربریت کا الزام رد کرتے ہوئے جب عدالت نے پولیس اراکین کو بری کیا تو اس کے ردعمل میں ہونے والی فائرنگ، لوٹ مار، اور آتش زنی کے دوران لاس اینجلس کے جنوب مرکزی علاقے میں 52 افراد قتل ہوئے، 2000 زخمی ہوئے، اور 8,000 گرفتار کیے گئے۔ دو ماہ کے اندر اردگرد کے علاقوں کے خوف زدہ شہریوں کو کم از کم 70,000 بندوقیں فروخت کی گئیں۔ یہ خونریزی واٹس (1965ء میں 34)، نیوآرک (1967ء میں 26) اور ڈیٹرائٹ (1967ء میں 46) میں ہونے والے اسی نوع کے قتال کی یاد دلاتی ہے، اس کے علاوہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں غلاموں کی بغاوت کے دوران جانوں کے زیاں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ 1967ء میں ڈیٹرائٹ میں امن وامان بحال کرنے کی کارروائی میں 4,700 فوجی چھاتا برداروں، 1,600 قومی گارڈ کے سپاہیوں، اور ریاست مشی گن کے 360 گھڑسوار سپاہیوں نے حصہ لیا۔ (لاک 1969ء)

ہابس اور ویبر کے نظریۂ ریاست کے ساتھ لاک کے نظریہ کے مطابق دوسری ترمیم کی وراثت کو یکجا کرنے کے اثرات 1993ء میں ویکو، ٹیکساس میں اور 1995ء میں اوکلاہاما سٹی، اوکلاہاما میں قتال کے ذریعے سامنے آئے۔ ویکو میں ریاست کے مسلح کارندے ایک مسلح مذہبی فرقے کے خلاف قانون نافذ کرنا چاہتے تھے؛ چار وفاقی افسران قتل اور ایک درجن زخمی ہوئے، اس خونیں جھڑپ میں عورتوں اور بچوں سمیت فرقے کے 89 ارکان ہلاک ہوئے۔ اس المناک واقعے کی دوسری برسی پر صریح انتقام میں ریاست کے ایک مخالف نے اوکلاہاما سٹی میں فیڈرل آفس بلڈنگ مسمار کرنے کے لیے ٹرک بم کا دھماکہ کر دیا جس کے

نتیجے میں عورتوں اور بچوں سمیت 168 افراد ہلاک ہو گئے۔

امریکی جب اپنی سرحدوں سے آگے نگاہ ڈالتے ہیں تو ان کے اس یقین کامل کی تصدیق کے لیے بہت سی شہادتیں سامنے آجاتی ہیں کہ ایک ہلاکت گریز سماج کا قیام ناممکن ہے۔ بیسویں صدی، نوع انسان کا انتہائی سفاک دور ہے، اور اس دہشت ناک حقیقت کا مظہر ہے کہ انسان بہت بڑے پیمانے پر قتل کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔ رڈالف جے۔ رومیل کی تحقیق کے ذریعے ہم خون ریزی کا تاریخی اور عالمی تناظر میں تعین کر سکتے ہیں۔ "Democide" (نسل کشی، سزائے موت، قتل عام اور مصنوعی قحط کے ذریعے اپنے ہی عوام کی ریاستی ہلاکتیں)، اور ''جنگ'' میں بڑے پیمانے پر ہونے والی ہلاکتیں (عالمی، علاقائی، شہری، انقلابی، اور گوریلا جنگ) کے درمیان امتیاز قائم کرتے ہوئے، پہلی جدول میں رومیل نے موجود تاریخ میں ہلاکتوں کی وسعت کا ایک محتاط اندازہ لگایا ہے۔

جدول:1

1987ء تک Democide اور جنگ میں ہونے والی ہلاکتیں

	ماقبل 1900ء	1900-1987ء	کُل
Democide	133,147,000	169,198,000	302,345,000
جنگ	40,457,000	34,021,000	74,478,000
کُل	173,604,000	203,219,000	376,823,000

ماخذ: رومیل 1994ء: جدول 1.6؛ 71-66۔

اس طرح تاریخی سیاسی قتل عام کا شکار ہونے والوں کی تعداد تقریباً 40 کروڑ ہوسکتی ہے۔ رومیل Democide کے تحت ہونے والی ہلاکتوں کو سب سے زیادہ کمیونسٹ حکومتوں کے کھاتے میں ڈالتا ہے، دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ مطلق العنان اور جابر حکومتوں، اور سب سے کم جمہوریتوں کے کھاتے میں۔ امریکی حافظے میں اب تک ہٹلر کے پیروکاروں کی جانب سے ہونے والا قتل عام، مخالفین کو راہ سے ہٹانے کے لیے اسٹالن پرستوں کی کارروائیاں، جاپانیوں کی جارحیت اور ماؤنوازوں کے قتال کی یادیں تازہ ہیں۔

ولیم جے۔ ایکہارڈ اور اس کے جانشینوں نے اندازہ لگایا تھا کہ 1900ء سے 1995ء کے دوران بیسویں صدی میں جنگ سے متعلق ہلاکتوں کی تعداد مجموعی طور پر کم از کم 106,114,000 ہے، جس میں 62,192,000 شہری اور 43,920,000 فوجی ہلاک شدگان شامل ہیں (سیوارڈ 1996ء: 19)۔ ''سرد جنگ'' کے ''پُرامن'' دور میں قتل عام جاری رہا اور 1945ء اور 1992ء کے درمیانی عرصہ میں 149 جنگوں میں اندازاً کم از کم 22,057,000 لوگ ہلاک ہوئے، جن میں 14,505,000 شہری اور 7,552,000 فوجی تھے (سیوارڈ 1993ء؛ 1-20)۔ صرف 1996ء میں کم از کم تیس لڑائیاں جاری تھیں۔

ٹیلی وژن کے پردوں پر وقفہ وقفہ سے دنیا بھر سے خونریزی کی تصویری جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، بعض کی جڑیں قدیم دشمنی میں پیوست ہوتی ہیں اور بعض سفاکیاں روزمرہ

ضرورتوں کے پورا نہ ہونے سے جنم لیتی ہیں۔ ایک خوفناک بحران کے بعد دوسرا سامنے آتا ہے جبکہ ذرائع ابلاغ لمحاتی طور پر ایک بحران پر توجہ مرکوز کرتے ہیں اور پھر دوسری جانب متوجہ ہو جاتے ہیں۔ خونریزی بہت سی صورتیں اختیار کرتی ہے، تمام کی جڑیں قتل کرنے کے لیے آمادگی میں پیوست ہیں: بین الاقوامی جنگیں، خانہ جنگیاں، انقلابات، علیحدگی کی جنگیں، دہشت پسندوں کی سفاکیاں، سرحدی تنازعات، فوجی بغاوتیں، نسل کشی، نسلی، مذہبی، قبائلی قتل عام، قتال، بیرونی مداخلت، اور ہلاک کرنے کے لیے اعضا کی قطع و برید اور اعضا سے محرومی۔ بعض اوقات بیرونی عناد امریکیوں کے داخلی قتل پر منتج ہوتے ہیں، جیسے 1993ء میں نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر بم دھماکہ جو اسرائیل کے لیے امریکی حمایت کے مخالفین نے کیا تھا، اس بم دھماکے میں چھ افراد ہلاک اور ایک ہزار زخمی ہوئے تھے۔ یا غیر ملکوں میں قتل عام جیسے 1998ء میں نیروبی اور دارالسلام میں امریکی سفارت خانوں پر یکے بعد دیگرے بارود سے لدے ہوئے ٹرکوں سے حملے جس میں 12 امریکی اور 300 افریقی ہلاک ہوئے، اور کم از کم 5,000 افراد زخمی ہوئے۔

اختتام کو پہنچتی ہوئی بیسویں صدی کی دنیا پر نظر ڈالتے ہوئے، امریکی سیاسی رہنما، ہابس کی پیروی کرتے ہوئے، اس رائے کا اظہار کرنے میں دیر نہیں لگاتے کہ ''باہر ہر طرف جنگل ہے!'' اور ختم ہو جانے والی سلطنت رومہ کے یہ شیدائی اور متوالے یاد دلاتے رہتے ہیں، ''اگر امن چاہتے ہو، جنگ کی تیاری کرو''۔

☆☆☆☆

ابتدائی عقائد، فلسفیانہ میراث، وطن پرستانہ سماج کاری، ذرائع ابلاغ کی کمک، ثقافتی مشروطیت، اور عالم گیر خونریزی کے اس سیاق وسباق میں ___ یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ سیاسیات کے امریکی سیاسی علماء اور ان کے شاگرد ہلاکت گریز سماج کے امکان کو پُرزور طور پر مسترد کر دیتے ہیں۔ اگر کسی یونیورسٹی کے تعارفی کورس سے لے کر گریجویٹ کلاس سیمینار میں ہلاکت گریز سماج کا سوال اٹھایا جائے تو انسانی فطرت، معاشی وسائل کی کمیابی اور جنسی اور دیگر حملوں کے خلاف دفاع کی ضرورت کے بنیادی اعتراضات روایتی طور پر سامنے آتے ہیں۔ گو کہ جوابات ثقافتی بنیادوں پر دیے جاتے ہیں لیکن ان میں بلا کا تنوع پایا جاتا ہے اور ان کی شاخیں لامحدود ہوتی ہیں۔ ہر بار جب سوال اٹھایا جاتا ہے تو کوئی نئی بات سامنے آ سکتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نوع انسانی غلبے کی جستجو میں رہتی ہے، وہ خودغرض، حاسد، ظالم اور جنونی ہے؛ خودحفاظتی میں قتل کرنا حیوی رجحان ہے اور ایک ناقابلِ تقسیم انسانی حق ہے۔ انسان معاشی طور پر حریص اور مقابلے پر آمادہ رہتے ہیں؛ سماجی اختلافات اور متصادم مفادات قتل کو ناگزیر بنا دیتے ہیں۔ دوسری چیزیں قتل کرنے سے بھی بری ہیں ___ ذہنی اذیت دہی اور معاشی محرومی ___ ہلاکت گریز سماج مطلق العنان ہوگا، آزادی کا خاتمہ ہو جائے گا؛ ایسا سماج غیر ملکی جارحین کے حملوں کا نشانہ بنے گا اور ان کا غلام بن جائے گا۔ سیاسی اصول کے طور پر غیر ہلاکت انگیزی غیر اخلاقی ہے؛ جارحیت کے شکار لوگوں کو بچانے کے لیے قتل کرنا ہمیشہ جائز سمجھا جانا چاہیے۔ سزا کے طور پر جرائم پیشہ افراد کو ہلاک کرنا سماج کو فائدہ پہنچاتا ہے اور دوسروں کو ایسے اقدام سے روکتا ہے۔ ہتھیاروں کی

ایجاد کو ختم نہیں کیا جا سکتا؛ مہلک ٹیکنالوجی ہمیشہ موجود رہے گی۔ تاریخ میں ہلاکت گریز کسی سماج کی کوئی مثال نہیں ملتی؛ یہ قطعاً ناقابلِ تصور ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی کلاس کے تمام طلبہ اس بارے میں متفق ہیں۔ بعض امریکی طلبا یہ رائے رکھتے ہیں کہ چونکہ انسان تخلیقی اور دردمندی کی صلاحیت رکھتے ہیں، چنانچہ تعلیم کے ذریعے ایک ہلاکت گریز سماج وجود میں لایا جا سکتا ہے۔ دوسروں کے خیال میں چھوٹے گروہوں پر مشتمل سماج ہلاکت گریز ہو سکتے ہیں، تاہم بڑے سماج میں اور عالمی سطح پر یہ ممکن نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ امریکیوں کی رائے دیگر ممالک کے پروفیسروں اور علم سیاسیات کے شاگردوں کے مقابلے میں خصوصی طور پر زیادہ متشدد ہے۔ یہ کہنے کے لیے باضابطہ تقابلی تحقیق کی ضرورت ہوگی۔ تاہم موجودہ دنیا میں علم سیاسیات کے پیشے سے متعلق لوگوں میں عموماً قنوطیت غالب ہے۔

تاہم جب یہ ناقابلِ تصور سوال __ ''کیا ایک ہلاکت گریز سماج کا وجود ممکن ہے؟'' __ دیگر سیاسی ثقافتوں میں پوچھا گیا تو حیرت انگیز طور پر بعض مختلف جوابات سامنے آئے۔

میں نے اس سوال کے بارے میں پہلے کبھی نہیں سوچا.....

1980ء میں عدم تشدد پر مبنی علم سیاسیات کے موضوع پر بحث کرنے کے لیے اسٹاک ہوم میں ایک اجلاس ہوا جس میں سویڈن کے ماہرینِ مستقبلیات شریک تھے۔ سویڈن کے

ایک ساتھی پروفیسر نے کہا: ''میں نے اس سوال کے بارے میں پہلے کبھی نہیں سوچا۔ اس پر غور کرنے کے لیے مجھے کچھ وقت درکار ہے۔'' حیرت انگیز طور پر اس سوال کو نہ یکسر مسترد کیا گیا اور نہ اس رائے سے فوری اتفاق کیا گیا۔ سوال پر ضروری غور وفکر اور مزید سوچ بچار کے لیے مہلت مانگی گئی۔ اسی طرح 1997ء میں سیول میں سسٹم سائنسدانوں کے بین الاقوامی اجلاس کے موقع پر کیمسٹری کے ایک نوبل انعام یافتہ نے جواب دیا ''میں نہیں جانتا۔'' اس سوال کا یہ جواب انہوں نے اس لیے دیا کہ اس کا جواب دینے کے لیے ان کے پاس ایک مناسب سائنسی بنیاد موجود نہیں تھی۔ بعدازاں انہوں نے کانفرنس کے ارکان پر زور دیا کہ اس سوال پر سنجیدگی سے غور کیا جائے کیونکہ بظاہر ناممکن سوالات پر غور وخوص کے ذریعے ہی سائنس اور تہذیب ترقی کرتی ہے۔

یہ قابلِ قیاس ہے، لیکن.....

1979ء میں ماسکو میں منعقد ہونے والی انٹرنیشنل پولیٹکل سائنس ایسوسی ایشن کی گیارہویں عالمی کانفرنس کے موقع پر دو روسی اسکالروں نے ایک مقالے ''عدم تشدد پر مبنی سیاسیات'' کو سن کر اس سوال پر سنجیدگی سے غور کرنے کے لیے آمادگی ظاہر کی۔ حیرت انگیز طور پر دونوں اس بارے میں متفق تھے کہ سیاست اور سیاسیات کی سائنس کا ہدف عدم تشدد پر مبنی سماج وجود میں لانا ہے۔ ''لیکن'' ایک نے سوال کیا، ''عدم تشدد پر مبنی سیاست اور عدم تشدد

پر مبنی علم سیاسیات کی معاشی بنیاد کیا ہے؟'' دوسرے نے سوال اٹھایا، ''چلی (جہاں فوج نے جمہوری طور پر منتخب ہونے والی سوشلسٹ حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا)، نکاراگوا (پر تشدد استبداد اور خونیں انقلاب)، اور کمپوچیا (جہاں انقلاب کے نام پر 10 لاکھ سے زیادہ افراد قتل کر دیے گئے) جیسے المناک واقعات پر ہم کس طرح قابو پائیں گے؟''

درحقیقت، کسی بھی نوع کی معیشت نہ تو قتل پر انحصار کرتی ہے اور نہ اس کی حمایت کرتی ہے __ جیسا کہ ''سرمایہ داری'' اور ''کمیونزم'' کی موجودہ شکلوں میں ہوتا ہے۔ قاتلانہ سفاکیوں کے مہلک اثرات کا ہلاکت گریز سیاست کس طرح تدارک یا خاتمہ کر سکتی ہے یا اسے روک سکتی ہے؟

عدم تشدد کے امکان کے مفروضے کے تحت، اٹھائے گئے سوالات سنجیدہ سائنسی سوچ بچار کے متقاضی ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ انسان فطری طور پر متشدد نہیں ہے، لیکن.....

1981ء میں، اردن یونیورسٹی عمان میں سیاسیات کے عرب علماء اور انتظامیہ کے ماہرین کے ایک گروپ کے سامنے جب عدم تشدد پر مبنی علم سیاسیات کا سوال رکھا گیا، تو ایک پروفیسر نے اجلاس کے بیشتر شرکاء کی مشترک رائے کا اظہار کیا: ''ہم جانتے ہیں کہ انسان فطرتاً متشدد نہیں ہے''، ''تاہم'' انہوں نے مزید کہا، ''ہمیں اپنے تحفظ کے لیے لڑنا پڑتا ہے۔''

اگر ابتدائی دلیل کہ انسان فطری طور پر ناگزیر حیثیت میں متشدد ہیں، کے حوالے سے سوال کیا جائے تو یہ امکان سامنے آتا ہے کہ ان حالات کا کھوج لگایا جائے جن کے تحت کوئی شخص قتل نہیں کرتا۔

یہ ممکن نہیں، لیکن.....

ہیروشیما یونیورسٹی میں انسٹی ٹیوٹ آف پیس سائنس کے تحت 1985ء میں منعقد ہونے والے دسویں سالانہ یادگاری سیمینار کے دوران، جہاں بڑی حد تک جاپانی شرکاء یکساں طور پر حامیوں اور مخالفین میں تقسیم ہو گئے، ایک پروفیسر نے جواب دیا ''یہ ممکن نہیں، لیکن عین ممکن ہے کہ ممکن ہو بھی جائے۔'' اس امر کو تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ ایک ہلاکت گریز سماج فوری طور پر وجود میں نہیں آ سکتا، اس کے مستقبل میں وجود میں آ جانے کو رد نہیں کیا گیا۔ بعد ازاں انہوں نے سوال اٹھایا ''عدم تشدد پر مبنی سماج کو وجود میں لانے کے لیے کس طرح کی تعلیم کی ضرورت ہوگی؟'' مسئلہ کے تخلیقی حل کے لیے ایک تعمیری دعوت۔

یہ یقیناً ممکن ہے.....

کوریا کے ایک پروفیسر آف فلاسفی، کورین ایسوسی ایشن آف سوشل سائنٹسٹس کے

صدر اور پیانگ یانگ کے سیاسی رہنما نے دسمبر 1987ء میں حیرت انگیز طور پر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا: ''یہ یقیناً ممکن ہے۔'' کیوں؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ فطرت انسانوں کو قتل کرنے پر مجبور نہیں کرتی۔ انہیں ''شعور''، ''اچھی قوتِ فیصلہ'' اور ''تخلیقی صلاحیت'' سے نوازا گیا ہے، یہ صلاحیتیں انہیں ہلاکت خیزی کو مسترد کرنے کے قابل بناتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ قتل کو جائز ثابت کرنے کے لیے معاشی کمیابی کا سہارا نہیں لیا جانا چاہیے ___ لوگ مادی اشیا کے غلام نہیں ہیں۔ کمیابی پر ''تخلیقیت'' یا ''پیداواریت'' اور ''انتہائی اہم طور پر منصفانہ تقسیم'' کے ذریعے قابو پایا جاسکتا ہے۔ تیسری یہ بات ہے کہ زنا بالجبر کو بنیاد بنا کر ہلاکت گریز سماج کے امکان کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ زنا بالجبر کو ''تعلیم'' اور ''ایک مناسب سماجی فضا مہیا کر کے'' صفحۂ ہستی سے مٹایا جاسکتا ہے۔

کولمبیا کے شہر مینی زالس میں فروری 2000ء کے دوران تقریباً 200 کمیونٹی رہنماؤں کے اجلاس میں شریک لوگوں سے جب یہ سوال کیا گیا، ''کیا ایک ہلاکت گریز سماج کا وجود میں آنا ممکن ہے؟'' تو حیرت انگیز طور پر نفی میں ایک ہاتھ بھی نہیں اٹھا۔ بعدازاں اس مفروضے کی حمایت میں تمام ہاتھ ایک ساتھ اٹھ گئے۔

کوریا اور کولمبیا میں یہ مثبت جوابات قابلِ توجہ ہیں، یہ وہ سماج ہیں جنہیں بدترین تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ڈیموکریٹک پیپلز ری پبلک آف کوریا کی تشدد آمیز سیاسی روایات جزوی طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی برابری کرتی ہیں: نوآبادیاتی تسلط کے خلاف مسلح انقلاب، اتحاد کے لیے خانہ جنگی اور ملکی اور غیر ملکی دشمنوں کے خلاف درست بنیادوں پر ملکی

دفاع اور حملہ۔ کئی عشروں تک اسی طرح کولمبیا کا سماج فوج، پولیس، پیرا ملٹری، گوریلوں اور بدکار قاتلوں کی غارت گری اور ہلاکت خیزی کے عذاب میں گرفتار رہا ہے۔

متنوع سماجی ردِعمل

پیشگی بحث کے بغیر جب مختلف گروہوں، ملکوں اور ثقافتوں کے سامنے ہلاکت گریز سماج کے امکان کا سوال پیش کیا جاتا ہے تو گروہوں کے درمیان اور تمام گروہوں کی جانب سے اتفاق یا عدم اتفاق کے متنوع سماجی رجحانات سامنے آتے ہیں اور عالمی سطح پر باضابطہ سوچ بچار کے امکانات ابھرتے ہیں۔

''نیو پولیٹکل سائنس'' نامی کتاب پر ایک جائزہ سیمینار مئی 1989ء بمقام ولنیٹس، لتھوانیا، سابقہ سوویت یونین کے ماہرین سیاسیات پر مشتمل تھا، اس کا اہتمام اوپن سوسائٹی انسٹی ٹیوٹ نے کیا تھا، وہاں اس سوال کے حوالے سے آٹھ کا جواب نفی میں تھا اور ایک کا اثبات میں۔ مارچ 1999ء میں سیول یونیورسٹی میں گریجویٹ طلبا کے لیے علم سیاسیات کے ایک تعارفی سیمینار میں بارہ جوابات 'نہیں'، پانچ 'ہاں' اور دو جوابات 'ہاں' اور 'نہیں' دونوں میں تھے۔ فروری 1998ء میں ہونولولو، ہوائی فورم آف پیسفک پارلیمنٹریز کے اجلاس کے موقع پر جس کا انتظام جاپان میں قائم فاؤنڈیشن فار سپورٹ آف دی یونائیٹڈ نیشنز نے کیا تھا، چھ جواب 'ہاں'، پانچ 'نہیں' اور دو جوابات 'ہاں' اور 'نہیں' میں تھے۔ جاپان سے خواتین

کے ایک نگراں گروپ کی، بارہ خواتین نے نہیں، گیارہ نے 'ہاں' اور ایک نے 'ہاں' اور 'نہیں' میں جواب دیا۔

میڈلین، کولمبیا میں، نومبر 1998ء میں ''تدریس کا مستقبل'' کے موضوع پر اساتذہ کی قومی کانفرنس کے موقع پر 275 نے ہاں میں، پچیس نے نفی میں جواب دیے۔ میڈلین کے خاندان میں کام کرنے والے سماجی کارکنوں کے ایک گروپ سے تیس 'ہاں' اور سولہ 'نہیں' میں جواب ملے۔ کرائے کے قاتلوں سمیت، نوجوان گینگ ممبروں کے ایک گروپ کے درمیان سے جو بطور sicarios (ننھے خنجر) مشہور ہیں، سولہ جوابات 'نہیں'، چھ 'ہاں' میں آئے۔ جب ان کے فیصلے کی وجوہ جاننے کے لیے سوال کیا گیا تو ایک قاتل نے کہا ''میں اپنی دو بیٹیوں کی دیکھ بھال کے لیے قتل کرنے پر مجبور ہوں۔ ملازمتیں نہیں ملتیں۔'' ایک مثبت جواب دینے والے نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''جب امیر اور غریب کے درمیان فرق مٹ جائے گا تو ہمیں مزید قتل کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

مہاتما گاندھی کینیڈین فاؤنڈیشن فار ورلڈ پیس کے مالی تعاون سے ''اقدار اور اکیسویں صدی'' کے موضوع پر اکتوبر 1997ء میں ایڈمونٹن، کینیڈا میں، ہائی اسکول کے طلبا کے ایک گروپ کے سیمینار کے ساتھ ہونے والی تقریب میں 48 نے نفی میں جواب دیا اور 25 نے ہاں میں۔ ایٹلانٹا، جارجیا میں، مارٹن لوتھر کنگ، جونیئر، سینئر فار نان وائلنٹ سوشل چینج کے تعاون سے اپریل 1999ء میں ''عدم تشدد'' پر ہونے والی ایک بین الاقوامی کانفرنس کے موقع پر 40 نے 'ہاں' میں جواب دیا، تین نے 'نہیں' میں۔ فروری 2000ء میں روس کے

شہرامسک میں، 17 سے 26 سال تک کے ادب کے طلبا میں سے 121 نے 'نہیں' میں، 34 نے 'ہاں' میں، اور تین نے 'ہاں' اور 'نہیں' دونوں میں جواب دیا۔

☆☆☆☆☆

کیا ایک ہلاکت گریز سماج کا قیام کیا ممکن ہے؟ عالمی قتال اور پُرتشدد بیسویں صدی کے پُرتشدد اختتام پر قتل کرنے کی دھمکیوں کے درمیان علم سیاسیات کے استادوں اور ان کے شاگردوں کے لیے قابلِ فہم انداز میں نتیجہ اخذ کرنے کے لیے وسیع امکانات موجود ہیں__ کہ وہ اس بات کو بالکل ناقابلِ تصور قرار دیں! لیکن اس سوال پر سنجیدہ توجہ دینے کے لیے آمادگی کے اشارے بھی پائے جاتے ہیں__ یہ قابلِ غور ہے اور ہوسکتا ہے کہ یہ ممکن بھی ہو۔ مزید برآں نسل انسانی کی بقا کو لاحق ناقابلِ بیان خطرات کے باوجود عزم و ارادے، سائنس، اداروں اور انسانی اعتماد کو مستحکم بنانے والے معاملات کی روشنی میں یہ مکمل طور پر ممکن ہے۔

باب دوم

ہلاکت گریز سماج کی صلاحیتیں

اگر ہم متبادل کے حصول کا پختہ ارادہ کرلیں تو ہمیں وقت سے پہلے ہی انسان کے اپنے تشدد کے دور کے خاتمے کے بارے میں کافی جان کاری ہوسکتی ہے۔

ڈیوڈ این۔ڈینیلس اور مارشل ایف گلولا

ڈپارٹمنٹ آف سائیکاٹری، اسٹینفورڈ یونیورسٹی، 1970ء

ہلاکت گریز سماج کے ممکن ہونے کے بارے میں سوچنے کے لیے کیا اسباب ہیں؟ ایسا سوچنا کیوں درست ہے کہ انسان عالمی سطح پر زندگی کے احترام کی صلاحیت رکھتے ہیں؟

ہلاکت گریز انسانی فطرت

گوکہ ہم اس بارے میں روحانی بنیادوں پر آغاز کرسکتے ہیں لیکن آیئے پہلے مکمل طور سے سیکولر حقیقت پر غور کرتے ہیں۔ بیشتر انسان قتل نہیں کرتے۔ اس وقت تمام زندہ انسانوں

کی __ اور وہ جو کبھی زندہ تھے __ ان کی صرف اقلیت قاتل ہے۔ کسی بھی سماج میں قتل کے اعداد و شمار پر غور کریں۔

جنگ میں ہونے والی ہلاکتوں پر بھی غور کریں۔ دنیا کے فوجی اور نسلی جغرافیائی عجائب خانوں میں مشکل ہی سے اس بات کا ثبوت ملے گا کہ نوعِ انسانی کی نصف یعنی خواتین کبھی بھی جنگجو یا لڑاکا رہی ہیں۔ تسلیم کہ خواتین قتل کرتی ہیں، ہم نے یہ بھی مانا کہ بعض خواتین نے جنگوں اور انقلابات میں لڑائیاں لڑی ہیں، یہ بھی درست ہے کہ بعض سماج ایسے رہے ہیں جن میں خواتین حتیٰ کہ بچوں نے بھی شکست خوردہ دشمنوں پر تشدد کیا ہے اور قتل کا ارتکاب کیا ہے، اور یہ بات بھی درست ہے کہ بہت سی جدید فوجوں میں قتل و غارت کے لیے خواتین کی خدمات حاصل کی جارہی ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بیشتر خواتین جنگجو یا فوجی قاتل نہیں رہی ہیں۔ اس میں آدمیوں کے اقلیتی لڑاکا کردار کو بھی شامل کرلیں۔ حقیقتاً مردوں کی صرف ایک اقلیت جنگ میں لڑتی ہے۔ ان میں بھی براہ راست صرف ایک اقلیت قتل کرتی ہے۔ جنگ کے دوران دشمن کو ہلاک کرنے والے ایسا کرتے ہوئے زیادہ تر ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں اور بعد میں ضمیر کی ملامت سہتے ہیں۔ شاید زیادہ سے زیادہ دو فیصد بغیر کسی پشیمانی کے بار بار قتل کرسکتے ہوں۔ جنگ میں قتل سے مردوں کے گریز کے ایک اہم تجزیے میں لیفٹیننٹ کرنل ڈیوگراس مین کی وضاحت کے مطابق ''جنگ ایک ایسا ماحول ہے جو کچھ ہی عرصے میں اس میں حصہ لینے والے 98 فیصد افراد کو ذہنی طور پر کمزور کردیتا ہے، وہ لوگ جو جنگ میں پاگل نہیں ہوئے وہ بظاہر میدانِ جنگ میں آنے سے پہلے ہی پاگل پن __ جارحانہ

خللِ دماغی__ میں مبتلا رہ چکے ہوتے ہیں (گراس مین 1995ء:50)۔ یہ بات روایتی علم سیاسیات کے مفروضوں کے برعکس ہے کہ انسان فطری طور پر پیدائشی قاتل ہوتے ہیں، دراصل فوجی تربیت کا بنیادی ہدف ''ایک عام فرد کے اندر قتل کرنے کے خلاف گہری مزاحمت پر قابو پانا ہوتا ہے'' (295)۔

انسانی کنبہ قتل نہ کرنے کی صلاحیتوں کے مزید ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اگر بنی نوع انسان فطری طور پر قاتل ہوتے، اگر صرف نصف انسانیت ناگزیر طور پر قاتلانہ رجحان کی حامل ہوتی، تو اپنی مختلف شکلوں میں خاندان کا وجود باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ باپ ماؤں کو قتل کر ڈالتے، مائیں باپوں کو؛ والدین بچوں کو؛ اور بچے والدین کو۔ ایسے واقعات ہوتے تو ہیں لیکن ان واقعات کی بناء پر ہلاکت آفرینی کا ایک ایسا فطری قانون قائم نہیں ہوتا جو نوعِ انسانی کی تقدیر کے فیصلے کر سکے۔ اگر ایسا ہوتا تو بہت عرصہ پہلے دنیا کی آبادی عدم آباد کا رخ کر چکی ہوتی۔ اس کے برخلاف ناقابلِ بیان حد تک مادی محرومیوں اور نہایت تذلیل آمیز رویوں کے باوجود، انسانی کنبہ مسلسل زندگی کی تخلیق اور اس کو برقرار رکھنے میں بے مثال پیمانے پر مصروف رہا ہے۔

ہلاکت سے گریز کی اس عالمی پہیلی کو حل کرنے کے لیے ہمیں ثبوت فراہم کرنے ہوں گے اور اختراع پسندی سے کام لینا ہوگا۔ ہمیں اس بات کا تخمینہ لگانا ہوگا کہ اب تک کتنے انسان دنیا میں آ چکے ہیں اور ان میں سے کتنے قاتل تھے اور کتنے قاتل نہیں تھے۔ مجموعی انسانی زندگیوں کا 10 لاکھ قبل مسیح سے سنہ 2000ء بعدِ مسیح کا تخمینہ تقریباً اکیانوے ارب

91,100,000,000 لوگوں کا ہے (ویکس 1996ء: 37 کے ساتھ کے فٹز 1966ء کو شامل کرتے ہوئے، جیسا کہ رمزے نے 1999ء میں دوبارہ حساب لگایا)۔ رڈولف رومیل نے جنگوں اور democide کی ہلاکتوں کا جو اندازہ لگایا ہے، اسے پچاس کروڑ تک بڑھا دیں اور غلط طور پر فرض کرلیں کہ ہلاک ہونے والا ہر شخص واحد قاتل کے ہاتھوں ہلاک ہوا، اور پھر قتل عمد کا ارتکاب کرنے والوں کے اعداد وشمار جاننے کے لیے اسے من مانے طور پر چھ سے ضرب دے دیں تو 1,000 سال قبل مسیح سے اب تک تقریباً 3,000,000,000 قاتل پیدا ہوئے (10 لاکھ قبل مسیح کے اعداد دستیاب نہیں ہیں)۔ لیکن ہلاکتوں کا یہ خام اور بڑھایا ہوا تخمینہ بھی اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کم از کم 95 فیصد انسانوں نے قتل نہیں کیے۔ اگر ریاست ہائے متحدہ میں ایک لاکھ انسانوں میں سے دس قاتل تھے تو گویا آبادی کا 01. فیصد ہر سال قتل کرتا ہے۔ اگر اشتعال میں آکر کیے جانے والے حملے 500 فی 100,000 تھے تو 5. فیصد جمع کرنے سے کل آبادی کا مجموعی 51. فیصد اصل یا قتل پر مائل قاتل بنتے ہیں۔ شاید تمام بنی نوع انسان کے دو سے کم یا پھر ایک فیصد انسان، انسانوں کے قاتل رہے ہوں گے۔ مخصوص سماجوں میں قاتلوں کا فیصد، یقیناً ثقافت اور دور کے لحاظ سے انتہائی مختلف ہو سکتے ہیں (کیلی 1996ء)۔ اس کے باوجود نوع انسانی کی بقا اور افزائش انسانی فطرت میں ہلاکت آفرینی پر حیات پذیری کے غلبے کی تائید کرتی ہے۔

روحانیت کی بنیادیں

نوعِ انسانی کے روحانی رواج اور روایت میں قتل سے پاک سماج قائم کرنے کے بارے میں اعتماد اور اساس موجود ہے۔ تسلیم کہ انسانی قربانیوں اور نسل کشی کے لیے لرزہ خیز قتلِ عام سے لے کر جوہری فنا کو جائز ثابت کرنے کے لیے مذاہب کو استعمال میں لایا جاتا رہا ہے (تھامپسن 1988ء)۔ لیکن خدا، خالقِ کائنات، عظیم روح کا اہم ترین پیغام کبھی بھی یہ نہیں رہا ''اے بنی نوع انسان، میری بات سن! جا کر دوسرا انسان تلاش کر اور اس مرد یا عورت کو قتل کر دے!'' اس کے برخلاف خدا کا پیغام یہ رہا ہے ''زندگی کا احترام کرو! قتل مت کرو!''

دنیا کے تمام روحانی عقائد میں غیر مہلک ادراکات تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ میکس ویبر یہ رائے قائم کرتا ہے کہ قتل کرنے کے سیاسی احکام کبھی بھی روحانی عقیدے کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتے۔ جین مت اور ہندومت ''اہنسا پرمودھرما'' (عدم تشدد زندگی کا عظیم ترین قانون ہے) کے ادراک میں شریک ہیں۔ بدھ مت کی پہلی شرط ہے ''کسی کی جان مت لو۔'' یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں مشترکہ حکمِ ربانی ہے ''تو کبھی قتل نہیں کرے گا'' (Exod.20:13) یہودیوں کی قدیم ترین تعلیمات میں فرمودات سے ایک ہے ''جو کوئی بھی ایک شخص کی زندگی بچاتا ہے، تو یہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے لوگوں کی ایک کثیر تعداد کی حفاظت کی ہو۔ جبکہ وہ شخص جو کسی ایک فرد کی زندگی کو نیست و نابود کرے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے

اس نے پوری دنیا کو تباہ کیا ہو‘‘ (Eisendrath:144)۔ اس تعلیم کی روح مشروط طور پر، اسلام میں جاری رکھی گئی: ’’جو شخص ایک انسان کو قتل کرتا ہے، سوائے قتل یا زمین پر فساد پھیلانے کے سوا (بہ طور سزا)، تو یہ پوری انسانیت کا قتل سمجھا جائے گا؛ اور جو شخص ایک زندگی بچاتا ہے، پوری انسانی نسل کو بچاتا ہے‘‘ (القرآن 5:32)۔ بہائی عقیدہ __ یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی تعلیمات کو سموتے ہوئے __ ہدایت کرتا ہے ’’خدا سے ڈرو، اے لوگو، اور کسی کا بھی خون بہانے سے اجتناب کرو‘‘ (بہاءاللہ 1983:277)

انسان دوست رسم و رواج بھی ہلاکت سے پاک سماج کی پسندیدگی اور اس کے ممکن ہونے کا کھلا اظہار کرتے ہیں۔ کنفیوشس کے نظریات کے مطابق، جب حکمرانوں کے درمیان نیکی غالب آتی ہے، تو سزائے موت کی کوئی ضرورت نہیں رہتی (فنگ 1952:60ء)۔ تاؤ مت کا کہنا ہے، جب انسان سادہ، طبعی اور فطرت سے مطابقت میں زندگی گزارتے ہیں ’’گو کہ اس وقت جنگی ہتھیاروں کا وجود ہوسکتا ہے، ایک شخص بھی ان ہتھیاروں کو ہاتھ نہیں لگائے گا‘‘ (فنگ 1952:190ء)۔ جدید اشتراکی تصور کے مطابق مزدور جب ایک دوسرے کو قتل کرنے کی حمایت سے انکار کریں، تو جنگیں ختم ہو جائیں گی۔ پہلی عالمی جنگ کی مخالفت میں لکھا جانے والا ایک منشور اعلان کرتا ہے:

> دنیا کے صنعتی مزدوروں کے تمام باشعور ارکان دیانتداری کے ساتھ انسانوں کا خون بہانے کے مخالف ہیں، مذہبی وجوہ کے حوالے سے نہیں، جیسے Quakers اور Friendly Societies، بلکہ اس لیے کہ ہمیں یقین ہے کہ دنیا کے تمام سماجوں میں مزدور طبقے کے مفادات اور بہبود کے معاملات مجموعی طور سے یکساں طور پر مقدم ہیں۔ ہم

جرمنی کی سامراجی سرمایہ دارانہ حکومت کے شدید ترین مخالف ہونے کے باوجود کسی بھی ملک کے مزدوروں کے قتل عام اور ان کے معذور کیے جانے کے خلاف ہیں۔

(True 1995:49; for a courageous example, see Baxter 2000)

تمام سماجوں میں قتل کو ناپسند کیا جاتا ہے۔ مذاہب میں زندگی کے لیے جو احترام پایا جاتا ہے، انسان دوست اس کی تکریم کرتے ہیں۔

ہلاکت گریز سماج کو ممکن بنانے کے لیے دنیا کی روحانی اور انسان دوست روایات میں ہلاکت کو ناپسند کرنے والی اخلاقیات کی موجودگی کی کیا اہمیت ہے؟ ایک جانب تو یہ نوعِ انسانی کے شعور میں زندگی کے لیے گہرا احترام پیدا کرنے کے لیے خدائی ارادے کو ظاہر کرتی ہے۔ دوسری جانب یہ، ایسے اصول کو قبول کرنے، اس پر عمل کرنے، یا اسے تخلیق کرنے کی انسانی صلاحیت ظاہر کرتی ہے۔ انسان اگر فطری طور پر ناقابلِ علاج قاتل ہوں، تو ایسے اصول کا قبول کیا جانا، یا منتقل ہونا یا اس کی تقلید ممکن نہیں ہوسکتی تھی۔ اگر ہلاکت گریز روحانی اخلاقیات، اشرافیہ نے انقلاب کی ہمت شکنی کے لیے، مظلوموں نے ظالموں کو کمزور کرنے کے لیے، یا قاتلوں نے انتقام سے بچنے کے لیے ایجاد کی تھیں، تب بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ جن انسانوں کو مخاطب کیا گیا ہے وہ اس پر مثبت ردعمل ظاہر کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

تاریخ کی انتہائی ہولناک خونریزیوں کے واقعات سے قبل، دوران، اور ازاں بعد ہلاکت گریزی کی روح ابھری ہے۔ اس کا اظہار قاتلوں کے ذریعے کریم النفسی کے ساتھ عنایت کردہ تسکین بخشی سے نہیں ہوتا۔ ہم عصر عہد میں شدت سے کچلے جانے کے باوجود

ہلاکت گریزی زندہ رہی ہے۔ بعداز صلیبی جنگوں کی عیسائیت، بعداز غلبۂ اسلام، قتال عظیم کے بعد کی یہودیت، عسکریت پسندی کے بعد کا بدھ مت اور مقامی لوگوں کی نوآبادیاتی دور کے بعد کی رسومات میں ہلاکت آفرینی سے نجات کو مسلسل تحریک ملتی رہی ہے۔ ہلاکت خیز بیسویں صدی میں اس کا مشاہدہ عیسائیوں میں ٹالسٹائی اور مارٹن لوتھر کنگ جونیر، ہندوؤں کے مہاتما گاندھی، مسلمان عبدالغفار خان، یہودیوں میں جوزف ابی لیاہ، بدھ مت کے دلائی لامہ، گرین پارٹی کے پیٹرا کیلی، اور بے شمار دیگر معروف اور غیر معروف لوگوں کی ان جرأت مندانہ کاوشوں میں کیا جاسکتا ہے جوانہوں نے عالمی سطح پر عدم تشدد کے حوالے سے کیں۔

ہر عقیدے میں ہلاکت گریز جذبے کی موجودگی اور اس سے اصولی وابستگیوں کی مثالیں کروڑوں ہم عقیدہ لوگوں کے لیے بیداری اور اس جذبے سے جڑنے کی راہ کھولتی ہیں۔ غیر مہلک ناگزیریت اور ہلاکتوں کے لیے ذمہ داری کی قبولیت اور اس کے نقصان دہ نتائج ہلاکت گریز شخصی اور سماجی تبدیلی کے لیے تحریک پیدا کرتے ہیں۔ ہلاکت گریزی کی جڑیں ہر روایت و رواج میں تلاش کی جاسکتی ہیں، بنی نوع انسان کا روحانی ورثہ مجموعی طور پر اس کثیر النوع نظام کی طرح ہے جو برگد کے پیڑ کی طرح زندگی کو برقرار رکھتا ہے۔ اس پورے شاخ در شاخ نظام سے یا اس کے کسی بھی حصے سے اثرات قبول کیے جاسکتے ہیں۔ سب انسانوں کے لیے قوتِ حیات کی تلاش کرو۔ مذہبی اور انسان دوست عقائد میں زندگی کے لیے احترام کی حقیقت اس اعتماد کے لیے مضبوط روحانی بنیاد فراہم کرتی ہے کہ ایک ہلاکت گریز سماج ممکن ہے۔

سائنسی بنیادیں

''ہم صرف مذہب کے ذریعے عدم تشدد تک نہیں پہنچ سکیں گے۔'' یہ ہندوستان کے اولین مذہبی رہنماؤں میں سے ایک، آچاریہ مہاپراگیہ، اہنسا (عدم تشدد) کی ہدایت ہے جو قدیم جین روایات کے تخلیقی وارث تھے۔ جین مت میں، ''اہنسا زندگی کے تمام مرحلوں کا مرکز ہے، تمام مقدس کتابوں کا مغز، اور تمام ذمہ داریوں اور نیکیوں کا ..... خلاصہ ..... اور جوہر ہے'' (جین اور ورنی 139:1993ء)۔ اچاریہ مہاپراگیہ کے خیال میں، عدم تشدد پر مبنی سماج کے حصول کا راستہ اپنے اندر عدم تشدد دریافت کرنے کے لیے افراد کو بااختیار بنانا اور روحانی حقائق کے ساتھ جدید اعصابی سائنس کو جوڑ کر اس کا سماجی طور پر اظہار کرنا ہے۔ اچاریہ مہاپراگیہ کے تجزیے کے مطابق، تشدد کا سبب وہ جذبات ہیں جو endocrine غدودوں سے نکلتے ہیں اور دل کی حرکت کو تیز اور دھیما کرنے والے اعصاب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور اس چیز کا تعلق ہماری غذا سے ہوتا ہے۔ مزید برآں ہمارے عصبیاتی نظام کے سائنسی علم کی بنیاد پر ہم اپنے اندر عدم تشدد کی نشوونما کرنے کے لیے سادہ ترغیبی مشقوں سے اپنے دماغ کی قوت کو حسبِ منشا استعمال کر سکتے ہیں اور غیر متشدد سماجی زندگی سے خود کو وابستہ کر سکتے ہیں (مہاپراگینہ 1987ء اور 1994ء؛ زاویری اور کمار 1992ء)۔

ہلاکت گریز انسانی صلاحیتوں پر اعتماد کے لیے کیا کچھ سائنسی بنیادیں موجود ہیں؟ سائنس سے وسیع طور پر مراد ہے ہر وہ علم جو درست ہونے کی صفت اور وثوق کا تعین کرنے

کے لیے تفتیش اور تجربات __ حقائق، نظریات اور طریقہ کار کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ سائنسی انقلاب کا پیش خیمہ یہ بات ہوتی ہے جب چند فلسفی تسلیم شدہ افکار کو موضوعِ بحث بنانا شروع کرتے ہیں۔

عدم تشدد کے لیے یہ کام اے رچرڈ کونراڈ (1974ء) نے انجام دیا تھا جو یہ روا جی مفروضہ زیرِ بحث لاتا ہے کہ زنا بالجبر سے لے کر قتال تک، تشدد سے نپٹنے کے لیے واحد موثر طریقہ قتل کرنے کے لیے آمادگی ہے۔ کونراڈ استدلال پیش کرتا ہے کہ تشدد کے مسئلہ کو حل کرنے کا واحد متبادل نظریہ تین مفروضوں پر منحصر ہے: کہ تمام غیر متشدد متبادلات کی شناخت کی جا چکی ہے؛ کہ سب کو آزمایا جا چکا ہے؛ اور کہ سب ناکام ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ مفروضات بودے اور ناقابلِ مدافعت ہیں؛ مسائل کے غیر متشدد حل کے متبادلات قیاساً لامحدود ہیں؛ وقت، وسائل اور دیگر عوامل کی عملی مجبوریاں ان تجربات تک کو روکتے ہیں جن کی شناخت ہو چکی ہے؛ لہٰذا ہم یہ یقین نہیں کر سکتے کہ واحد متشدد متبادل ہی کامیابی سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ اسی لیے کونراڈ یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ تشدد کو تسلیم کرنے کے ایک فلسفیانہ میلان کے بجائے اس جانب رجوع کرنا چاہیے جس میں غیر متشدد متبادلات کی تخلیق اور آزمائش کی جستجو ہو۔ اس طرح کی طرزِ فکر ممکنہ طور پر ایسی سائنسی دریافتوں تک رہنمائی کریں گی جو انسانی ہلاکت آفرین کی ناگزیریت کو موضوع بحث بنائیں گی۔ (یوڈر 1983ء بھی ملاحظہ کیجیے)۔

اس مفروضے پر بحث جاری ہے کہ اپنی حیوانی فطرت کے سبب انسانوں کو لازمی طور

پر قاتل ہونا چاہیے۔ ٹولین یونیورسٹی کے ماہر نفسیات لوہ سنگ سائی (1963ء) مظاہرہ کر چکے ہیں کہ چوہے کھانے والی بلی اور ایک گندی نالی کے چوہے کو پُر امن طور پر ایک ہی برتن میں کھانا کھانے کی تربیت دی جاسکتی ہے۔ یہ پُر اثر کرنے، سماجی آموزش کی آمیزش کا طریقہ کار تھا۔ شروع میں شیشے کی دیوار کے ذریعہ دونوں کو علیحدہ رکھا گیا جہاں دونوں جانوروں نے سیکھا کہ وہ خوراک کی ایک مشترک پلیٹ میں خوراک پہنچانے والے آلے کو چلانے کے لیے انہیں یکے بعد دیگرے متوازی لیوروں کا دبانا پڑے گا۔ سات ہزار تربیتی نشستوں کے بعد یہ ممکن ہوسکا کہ شیشے کی درمیانی رکاوٹ کو ہٹا دیا جائے اور چوہا، بلی کا ترنوالہ نہ بننے۔

تسائی نتیجہ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے:

> سائنس کی تاریخ میں ہم نے پہلی بار نہایت اہم تجربات کے ذریعے اس بات کا مظاہرہ کیا کہ بلیاں اور چوہے ___ نام نہاد فطری دشمن ___ تعاون کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ اس طرح کی دریافت نفسیات میں اس روایتی عقیدے کو سمندر بُرد کر دیتی ہے کہ حیوانی فطرت میں ایک ناقابلِ تنسیخ جھگڑالو جبلت موجود ہے جو لڑائی یا جنگوں کو ناگزیر بنا دیتی ہے (1963:4)۔

تسائی نے کہا کہ ''بہت سوں کا خیال ہے کہ ہماری تحقیق نے امنِ عالم کے نظریاتی امکان کے لیے اساسی حیاتیاتی بنیاد کا ابتدائی پتھر رکھ دیا ہے۔'' مسابقتی ہلاکت آفرینی کی طے شدہ ناگزیریت کے تسلسل کے بجائے تسائی ''تعاون کے ذریعے بقا'' کی سائنسی بنیاد پر قائم فلسفے کی بات کرتا ہے۔ ماہر طبیعات اور سائنس کے تاریخ داں انٹونیو ڈریگو، تنازعہ کے

حل کے لیے کارنو اور نیوٹن کے نظریات کی پیچیدگیوں کا تقابل کرتے ہوئے لامحدود اعلیٰ تعاون کے حق میں ایک یکساں سائنسی اساس پر قائم تجویز پر پہنچتا ہے (ڈریگو 1994ء)۔

نفسیاتی معالج جیروم جے فرینک تعاون کی تجویز یہ ہے کہ ہلاکت خیز مخاصمتوں پر قابو پانے کے لیے مشترک فائدے مند ہدف ہونے چاہئیں۔ (فرینک 1960:261-2: 1993:204-5)۔

وسطی امریکہ کے ہلاکت گریز جانور، بونونو نے جو کہ جینیاتی اعتبار سے دودھ پلانے والے جانوروں سے تعلق رکھتا تھا اس مفروضے کو چیلنج کرلیا ہے ''قاتل بوزنہ'' کی ایک نوع کے طور پر انسان کی ارتقائی نمود میں ہلاکت آفرینی ناگزیر طور پر گہری جڑیں رکھتی ہے۔ (کانو 1990ء)۔ کانگو کے منگانڈ ولوگوں میں، جو منطقۂ حارہ کے جنگلوں میں بونوبو کے ساتھ رہتے ہیں، یہ قدیم روایت چلی آرہی ہے کہ ایک زمانے میں دونوں رشتے داروں کی طرح ساتھ رہتے تھے، اس لیے انہیں ہلاک کرنے کی سخت ممانعت ہے (کانو 1990:62ء) گوریلوں، چمپنزیوں اور دیگر بوزنوں کے مقابلے میں، بونوبو کو ایک دوسرے کو قتل کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا گیا ہے (رینگھم اور پیٹرسن، 1990ء اووال 1997ء) مزید برآں دودھ پلانے والی ایسی ہی قتل کرنے والی نوع کے درمیان ''قیامِ امن'' اور ''باہمی ایثاریت'' کی حالیہ تحقیق بھی اس رجحان کو موضوعِ بحث بناتی ہے جو ارتقائی انسانی فطرت میں صرف ہلاکت آفرینی کی موجودگی کا دعویٰ تو کرتا ہے لیکن ہلاکت آفرینی کے نہ ہونے کے امکان کا نہیں (وال 1996-1989ء) حیوانی فطرت کا ایک پُرامن پہلو بھی ہے اور جیسا کہ کروپوٹکن

(1914ء)، سوروکن (1954ء) اور الغی کوہن (1990ء) انسانی فطرت کے تعاون آمادہ، بےغرضانہ اور ''زیادہ روشن پہلو'' کے مظاہرے کا احاطہ کر چکے ہیں۔

حیوانوں اور انسانوں میں جارحیت کی ایک تقابلی تحقیق میں ماہر حیوانیات و بشریات، آئرینا س ایبل ایبفیلڈ (1979:240-1) نے اس بات کو دریافت کیا ہے کہ قتل نہ کرنے کی روحانی ناگزیریت کے لیے حیاتیاتی بنیاد موجود ہے۔ مشاہدہ کرتے ہوئے کہ ''بہت سے جانوروں میں دروں نوعی جارحیت رسوم و رواج کی اس قدر پابند ہو چکی ہے کہ اس کے نتیجے میں جسمانی ضرر نہیں پہنچتا''، وہ خونریزی سے گریز کے لیے ایسی ہی اور زیادہ واضح انسانی ترکیبیں اور طریقے دریافت کرتا ہے۔ وہ آخری نتیجہ اخذ کرتا ہے ''ایک حد تک حیاتیاتی قاعدے کا فلٹر حکم عائد کرتا ہے: 'تم کو قتل نہیں کرنا چاہیے'۔'' لیکن ''نام نہاد تخصیص کاری کے عمل میں (دوسروں کو مکمل انسان تسلیم نہ کرنا اور اس طرح ان کو غارت گری کا نشانہ بنانا)، انسان نے سب سے بالا ایک ثقافتی مثالی فلٹر مسلط کر لیا ہے جو اس کے حیاتیاتی مثالی فلٹر سے بالاتر اسے قتل کرنے کا حکم دیتا ہے۔'' جنگ میں، ''یہ معیارات ایک تنازعہ بن جاتے ہیں جس سے آدمی ضمیر کے ذریعے آگاہی رکھتا ہے اس کے ضمیر میں اس وقت چبھن ہوتی ہے جب وہ دشمن کو گرفتار کرتا ہے اور ایک انسان کے ناتے سے اس کا سامنا کرتا ہے۔'' تزکیۂ نفس اور سماجی قبولیت کے لیے جنگجوؤں کی بعد از قتل ضرورتوں سے اس کا ثبوت مل چکا ہے۔

ایبل۔ ایبسفیلڈ کے نظریے کی تصدیق کرتے ہوئے گراس مین کا اخذ کردہ یہ نتیجہ کہ ''پوری تاریخ کے دوران میدانِ جنگ میں موجود بیشتر لوگوں نے دشمن کو قتل کرنے کی کوشش

نہیں کی، حتیٰ کہ اپنی اور اپنے دوستوں کی زندگیاں بچانے کے لیے بھی نہیں'' (گراس مین 1995:4)۔ گراس مین نشاندہی کرتا ہے کہ براہ راست قتل کرنے والے فوجیوں میں غیر قاتل فوجیوں کی نسبت نفسیاتی امراض زیادہ پائے جاتے ہیں۔ فوجی ماہر نفسیات اور ماہر اخلاقیات و بشریات کے درمیان ان نتائج کے صرف پالیسی مضمرات پر اختلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلے کا ہدف قتل کرنے میں مزاحمت پر قابو پانے کے لیے پیشہ ورانہ تربیت فراہم کرنا ہے۔ بعد والے کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی ہلاکت گریز حیاتیات کے ساتھ ثقافت کو ہم آہنگ کرنا ہے۔ ایبل۔ ایبسفیلڈ نتیجہ اخذ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> امن کے لیے عالمی خواہش کی جڑیں ثقافتی اور حیاتیاتی معیارات کے درمیان تنازعہ میں موجود ہیں، جو لوگوں کے اندر اپنے حیاتیاتی اور ثقافتی معیار کے فلٹروں میں مفاہمت پیدا کرنے کی طلب پیدا کرتا ہے۔ ہمارا ضمیر ہماری امید ہے، اور اس اساس پر قائم، معقولیت کے ساتھ فراہم کردہ رہنمائی کا حامل ارتقا امن تک رسائی ممکن بنا سکتا ہے۔ یہ اس حقیقت کو پہلے سے فرض کر لیتا ہے کہ جنگ ایسے فرائض ادا کرتی ہے، جو بغیر خون ریزی کسی اور طریقے سے ادا کیے جانے چاہئیں (1979-241)۔

ہلاکت گریزی کے انسانی امکانات پر اعتماد کے لیے دماغی سائنس مزید مدد فراہم کرتی ہے۔ پیشرو دماغی سائنسداں بروس ای مورٹن (2000ء) اپنے اندازِ نظر کو ''عصبی حقیقت پسندی'' (Neurorealism) کی اصطلاح کے ساتھ ایک ''Behavioral Laterality کا دوہرا چوگوشہ دماغی ماڈل'' پیش کرتا ہے، جس میں ہلاکت گریزی اور ہلاک کرنے دونوں کی عصبی حیاتیاتی بنیاد بتائی گئی ہے۔ ماڈل کے چار حصے ''ایک واحد

چوگرفتہ نظام کے تحت دو طریقوں سے عمل کرتے ہیں۔'' یہ ہیں دماغ کا مرکزی نظام (جبلتیں)، محیطی نظام (جذبات)، دایاں اور بایاں نصف کروی نظام (تخیل اور تعقل)، اور جدت فکری نظام (وجدان)۔ مورٹن وجدانِ فکری کے نظام میں بلند تر روحانی اور سماجی آگہی کے منبع کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ ''بلند تر ذریعہ'' ''راست گوئی، خلاقی، نظم وضبط کی پابندی، ایثار پیشگی، معاون، ہم درد اور غیر متشدد'' ہے۔ یہ گروہ کی طویل المعیاد بقا کو آسان بناتا ہے اور ''صحیح معنوں میں ذہن پر انحصار کرنے والا سب کے لیے قابل رسائی مظہر'' ہے۔ ''شعور میں منبع کے ظہور کا احساس تین طریقوں سے بیدار کیا جاسکتا ہے: موت کے قریب پہنچ جانے کا صدمہ، فریب نظر اور واہموں میں مبتلا کرنے والی دواؤں کے ذریعے، اور سب سے زیادہ مراقبے کے ذریعے۔ ''منبع'' روزمرہ سماجی زندگی میں، ''غیر متشدد سماج کی جانب'' باہمی تعاون کے فوائد ابھارنے میں وجدانی طور پر آسانی فراہم کرتا ہے۔ بقا کے لیے مہلک خطروں کی عدم موجودگی میں مدد کرتا اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

اس طرح عصبی حقیقت پسند دماغی سائنس، خود فعالی، غیر مہلک وابستگی اور سماجی قلب ماہیت کے لیے ایک بنیاد فراہم کرتی ہے جو ہلاکت گریز روحانیت اور قتل کرنے سے حیاتیاتی جھجھک کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ یہ ہندومت کے ماننے والے وویکانند کے اس وجدان کے ساتھ بھی مطابقت رکھتا ہے کہ عظیم مذہبی رہنماؤں کا ہدف یہ نہیں ہے کہ خدا کو باہر سے انسان کے اندر لایا جائے بلکہ ہر فرد کی مدد کرکے اس کے اندر پہلے سے موجود خدائی صفات کو باہر لایا جائے۔ یہ بات عیسائی ٹالسٹائی کے صدق دلانہ بیان کی بازگشت ہے کہ

''خدائی سلطنت کا دائرہ آپ کے اندر ہے'' (ٹالسٹائی 1974ء) اس بات کا تقابل پندرھویں صدی کے ہندوستانی صوفی کبیر کی بصیرت سے کیجیے:

دو آنکھوں کے بیچ ہے مالک،

خدا کا پیغام بر۔

خدا تمہارے اپنے بدن کے اندر رہتا ہے،

اس کو دیکھنے کے لیے باہر کی آنکھیں کیا کھولنا؟

(سیٹھی 57-56:1984)

تاہم فرض کر لیتے ہیں کہ ذہن کی حیاتیاتی اساس پر قائم فعلیت کی خرابیاں بعض افراد کو اضطراری طور سے قاتل بننے کی طرف راغب کر لیتی ہیں؟ اگر اس نوع کی ہلاکت آفرینی حیاتیاتی طور پر پیدا شدہ ہے اور تربیت اور ثقافت کی پیدا کردہ نہیں ہے، سائنسی اختراع پسندی یہ ذمہ داری قبول کرتی ہے کہ قتل کے مرض میں مبتلا افراد قتل کرنے کی خواہش سے خود کو نجات دلانے کی قوت فراہم کرے گی۔ اور ایسا کرنے کے لیے دوسری انسانی صفات میں کمی کرنا ضروری نہیں۔ جدید اعصابی سائنس، جینیات اور دیگر حیاتیاتی سائنسوں کے نمودار ہونے کے ساتھ، ''فطرت انسانی'' کی ناگزیر ہلاکت آفرینی کا، چاہے اس کا تعلق خلافِ معمول حیاتیاتی نقص سے ہو، آئندہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس حوالے سے ایک رہنما مثال ارتقائی دماغی نفسیات داں جیمس ڈبلیو پریکاٹ اور دماغی امراض کے معالج رابرٹ جی ہیتھ کی بنیادی اور اطلاقی تحقیق کے ذریعے فراہم کی گئی ہے (ریسٹاک 133-118:1979)۔

انہوں نے نظریہ پیش کیا ہے کہ بعض افراد کی قتل کرنے کی خواہش کا تعلق برقی سرکٹس (''لطف کی گزرگاہیں'') کی کمزوری سے ہے۔ یہ سرکٹ جذبات (دماغ کے محیطی حصے سے متعلق نظام) اور جسمانی حرکات (عقبی دماغ) کے درمیان رابطہ پیدا کرتا ہے۔ وہ مزید فرض کرتے ہیں کہ ان سرکٹوں کا فروغ یا نقص ابتدائی بچپن کے ارتقا میں دائرہ نما جسمانی حرکات کی خاص مقدار سے تعلق رکھتی ہے، اس کا تجزیہ چمپنزیوں کے سروں کو شکنجے کے ساتھ جکڑ کر اوپر اٹھانے کے ذریعے یا گھومنے والی کرسی میں ان کو تیزی سے چکر دے کر کیا گیا۔ انہیں معلوم ہوگیا کہ جکڑے جانے والے چمپنزی مزید جارح ہوگئے اور متحرک مزید سماجی بن گئے۔ عادی قاتلوں پر تجربات کرتے ہوئے ان کے عقبی دماغ میں ایک چھوٹا الیکٹروڈ نصب کیا گیا جو قتل کرنے کی ناقابلِ مزاحمت محرکات کے حامل فرد کے شانے میں نصب شدہ ایک آلے (''اعصابی ہیجان پیدا کرنے والا'' یا ''اعصابی صلح جُو'') کے ذریعے خود کنٹرول کیا جاسکتا ہے، ہیجان پیدا کرنے والا یہ آلہ جیبی ہوتا ہے۔ جب گھبراہٹ کا احساس اور قتل کرنے کی خواہش ابھرتی ہے، تو مذکورہ شخص اسے ختم کرنے کے لیے پُرلطف احساسات کو متحرک کرسکتا ہے۔ ''مجرمانہ طور پر خبط الحواس'' قرار دیے جانے والے بعض افراد نے برسوں قیدِ تنہائی یا حراست کے بعد خود کو بہت پُرسکون محسوس کیا۔ بعض افراد قتل اور خودکشی کی خواہش کے بتدریج خاتمے کے تجربے سے بھی گزر چکے ہیں۔ ان تجربات میں کبھی ناکامیاں بھی ہوئی ہیں۔ ایک موقع پر اعصابی تار ٹوٹ گیا اور مریض نے فوری طور پر ایک نرس کو قینچی سے قتل کردیا۔ تاہم اس اولین طریقہ کار کی کامیابیاں ہلاکت آفرینی اور حیاتیاتی قنوطیت پسندی

سے نوع انسانی کو آزاد کرانے کی جدید نظریاتی اور تکنیکی اختراعات کے لیے نئی منزلیں سر کرنے کے راستے کھولتی ہیں۔

ہلاکت گریز رجائیت پسندی کے لیے مزید عملی محرکات __ علم سیاسیات کی قنوطیت کے ساتھ تیزی سے تقابل کرتے ہوئے __ سامنے آئے۔ یہ اسٹین فورڈ یونیورسٹی کے 23 نفسیاتی معالجین کے اخذ کردہ نتائج سے ظاہر ہوئے جنھوں نے مارٹن لوتھر کنگ جونیئر اور سینیٹر رابرٹ ایف کینیڈی کے قتل کے حوالے سے امریکہ میں ''تشدد کا بحران'' پر تحقیق کے لیے ایک کمیٹی قائم کی تھی (ڈینیلز، گلولا، اور اوک برگ 1970ء)۔ حیاتیات، نفسیاتی محرکات، ماحولیات، غصہ، گروہوں کے درمیان تنازعہ، ذرائع ابلاغ، آتشیں اسلحہ، ذہنی بیماری، منشیات کے استعمال اور دیگر مضمرات کے تعلق سے تشدد اور جارحیت کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد ڈینیلز اور گلولا نے نتیجہ اخذ کیا: ''اگر ہم متبادلات کی تلاش کا فیصلہ کرلیں تو آدمی کے تشدد کے دور کے خاتمے کے بارے میں ہمیں پہلے سے ہی بہت کچھ آگہی ہوجائے'' (جملے پر زور دیا گیا ہے)(441)۔

ماہر نفسیاتی معالج جارج ایف سولومن کی پیش کردہ قتل کی کیس اسٹڈیز (1970ء) ''انسانی فطرت'' کے کمزور حوالے کے مقابلے میں قتل کو قابلِ فہم اور معقول طور پر قابلِ تدارک بناتی ہیں۔ ایک کیس میں، خواتین کو قتل کرنے والے ایک بہ ظاہر غیر جذباتی قاتل کے سماجی تعلقات میں: اس کے جواری باپ کی جانب سے ناکافی توجہ، اس کی شرابی اور بے روک ٹوک جنسی تعلقات رکھنے والی ماں کی جانب سے جنسی تعلق کا قائم کیا جانا، بندوقوں سے

سحر آفرینی، اور ماں سے جنسی تعلقات کے گناہ کی ''ہیبت ناک شبیہوں'' سے چھٹکارے کے لیے منشیات کا استعمال شامل ہیں۔ ایک دوسرے کیس میں، اپنی سابقہ بیوی کے نئے شوہر کو قتل کرنے والے کے پس منظر میں: غربت، ماں پر تشدد کے خلاف باپ سے نفرت، سر پر باپ کی لگائی ہوئی ضربات کے بعد تشنج کا دورہ، ماں کی جانب سے تمسخر، بہنوں کی جانب سے مار پیٹ، میرین کارپس میں فرسٹ سارجنٹ بن جانا، قحبہ خانے میں ملنے والی ایک طوائف سے شادی، اس سے جو دو بچوں کی پیدائش، جب وہ سمندر پر ڈیوٹی پر تھا تو عورت کی بے وفائی دیکھ کر اس پر قاتلانہ حملہ خود اپنی کلائیاں کاٹ ڈالنا، عورت کی جانب سے اعشاریہ 38 بور کے ریوالور سے دھمکائے جانے، اور اس کے اپنے سرکاری پستول کی موجودگی جس سے اس نے __ سابقہ بیوی کو نہیں __ بلکہ اس کے نئے شوہر کو، بچے کے اخراجات اور ملاقات کے حقوق کے بارے میں ایک سہ فریقی جھگڑے کے دوران، قتل کر دیا۔

سالومن نتیجہ اخذ کرتا ہے:

نفسیاتی معالج کے طور پر میں اس نظریہ کا سخت حامی ہوں کہ انسانی رویے کی اصلاح کی جا سکتی ہے۔ تدارک اور علاج میں ہماری ناکامیوں کی بنیاد لاعلمی پر رہی ہے، جسے مزید تحقیق کے ذریعے بہتر کیا جا سکتا ہے؛ تسلیم شدہ اصولوں کو نافذ نہ کرنے پر؛ اختراع کرنے میں ہچکچاہٹ پر؛ اور تشدد پر آمادہ شخص کی کسی خلقی ''علاج ناپذیری'' کے مقابلے میں کہیں زیادہ سماجی انحراف کی جانب انتقام جوئی پر قائم ہے۔ نشوونما اور روبہ صحت رہنے کے لیے انسانی صلاحیت عظیم ہے اور، امید رکھنا چاہیے، تشدد کے لیے اس کی رغبت روکی جا سکتی ہے

-(387)

علم الانسان میں تشدد اور جارحیت پر روایتی اصرار کے مقابلے میں عدم تشدد اور امن کے لیے انسانی صلاحیتوں کو سمجھنے میں جدید دلچسپی، اس مفروضے پر سوال اٹھانے کی فہم پیدا کر رہی ہے کہ ایک ہلاکت گریز سماج ناممکن ہے (اسپانسل اور گریگور 1994b ء: اسپانسل 1996ء)۔ جیسا کہ لیزلی ای اسپانسل وضاحت کرتا ہے، ''غیر متشدد اور امن پسند سماج خال خال نظر آتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ درحقیت، ناپید یا نہ ہونے کے برابر ہیں بلکہ اس لیے کہ تحقیق، ذرائع ابلاغ اور دوسرے شعبوں میں عدم تشدد اور امن بہت ناکافی طور پر زیرِ غور لائے جاتے ہیں۔'' وہ مزید کہتا ہے، ''عدم تشدد اور امن کی خصوصیات، کیفیات، وجوہ، فریضوں، ارتقائی مراحل، اور اثرات جاننا اتنا ہی ضروری ہے جتنا تشدد اور جنگ کے معاملات کا جاننا۔'' (اسپانسل 1994a:18-9)۔

ابتدائی انسانوں کے درمیان آفاقی ہلاکت آفرینی کے ہابس کے مفروضے کی سائنسی تحقیق کو پیروگیورگی (1999ء) اور جے ایم جی وارن ڈرڈینن (1995ء؛ 1990ء) آگے بڑھا چکے ہیں۔ 50 ہزار ''قدیم'' انسانوں کی جنگوں اور قبائلی تصادم جن کا تذکرہ گذشتہ صدی کے نسلیاتی ادب میں موجود ہے اس کا جائزہ لیتے ہوئے، وان ڈرڈینن کو صرف 2 ہزار گروہوں کی قطعی اور مکمل تصدیق ملتی ہے۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ بقایا گروہوں کی ''پیکار'' کے بارے میں عدم اطلاع ان کے پُرامن ہونے کو لازمی طور پر ثابت نہیں کرتی، وان ڈرڈینن انسان کی آفاقی جنگجوئی کے مفروضے کو بطور عقیدہ تسلیم کرنے کے خلاف خبردار

کرتا ہے (9-264-259-257:1990)۔ وہ قدیم باشندوں سے لے کر زونی تک کے 395 ''انتہائی غیر جنگجو'' لوگوں کا نسلیاتی ثبوت پیش کرتا ہے۔(619:595:1995)۔

بشریاتی ادب کا تجزیہ کرتے ہوئے، بروس ڈی، بونٹا (1993ء) 147 ایسے سماجوں کی نشاندہی کرتا ہے جو ''امن پسندی'' کے لیے انسانی صلاحیتوں کو ظاہر کرتی ہیں۔

> امن پسندی ..... ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جس کے تحت لوگ بین الشخصی ہم آہنگی کی ایک نسبتاً بلند تر سطح کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں؛ بالغ افراد کے درمیان، بالغوں اور بچوں کے درمیان، اور دونوں صنفوں کے درمیان بہت کم جسمانی تشدد کے واقعات رونما ہوتے ہوں؛ تنازعات حل کرنے اور تشدد کو ٹالنے کے لیے قابل عمل حکمت عملی وضع کر چکے ہوں؛ دیگر لوگوں کے ساتھ تشدد (مثلاً جنگ) سے بچنے کے پابند ہوں؛ اپنے بچوں کو پرامن طریقے اختیار کرنے کی تربیت دیتے ہوں؛ اور خود کو امن پسند بنائے رکھنے کا قوی شعور رکھتے ہوں (4)۔

امیشوں، انابپٹسٹوں، بالینیوں، باتکوں، برہوروں، بریدرینوں، بوئیڈوں، چیوانگوں، داؤ خوبوروں، فیپاؤں، فوروں، جی/ ویوں، ہیوترتیوں، افالکوں، انوٹوٹوں، جینوں، قادروں، اکنگوں، لداخیوں، لیپ خاسوں، مالا پندرموں، مبوتیوں، مینونیٹوں، مونٹا گنائیوں۔ ناسکپیوں، مورایوں، نائکوں، نوبینوں، اونگیوں، اورنگ اصلیوں، پالیوں، پیاروووں، کونکروں، دیہی شمالی آئرلینڈ والوں، دیہی تھائی باشندوں، سانوں، سن پائلوں، سالتیکوں، سیمائیوں، تاہیٹیوں، ٹانکاؤں، تیمیروں، توراجاؤں، ٹرسٹن آئی لینڈ والوں، ووراؤں، یانادیوں، زپوٹیکوں، اور زونیوں کے درمیان بونٹا امن پسندی کے شواہد کا پتا چلاتا

ہے۔

ان قوموں میں سے 24 کے درمیان تنازعات کے حل کی مزید تحقیق میں، بونٹا (1996ء) نتیجہ نکالتا ہے:

ان سوسائٹیوں کی پُرامن طور پر تنازعات حل کرنے میں کامیابی کی روشنی میں مغربی عالموں کے متعدد خیالات کو مضوعِ بحث بنایا جاسکتا ہے: مثلاً تمام سماجوں میں پُرتشدد تنازعہ ناگزیر ہے؛ اندرونی اور بیرونی تشدد کو سزائیں اور مسلح فوج روکتی ہے؛ تنازعات روکنے کے لیے سیاسی ڈھانچے ضروری ہیں؛ اور تنازعہ کو مثبت اور ضروری خیال کیا جانا چاہیے۔ اس کے برعکس شواہد یہ بتاتے ہیں کہ نصف سے زائد پُرامن سماجوں میں تشدد کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے؛ وہ بالغوں کو کبھی کبھار ہی سزا دیتے ہیں (سماجی مقاطعہ کی دھمکی کے علاوہ)؛ جس طرح وہ اندرونی تنازعات طے کرتے ہیں بالکل اسی طرح پُرامن طریقوں سے کسی بیرونی سماج سے ہونے والے تنازعات سے نپٹتے ہیں؛ اندرونی جھگڑوں کی صورت میں وہ بیرونی حکومتوں کی جانب نہیں دیکھتے؛ اور وہ تنازعہ کو انتہائی منفی نظر سے دیکھتے ہیں (403)۔

علم البشریات کے حوالے سے اگر ہم پلٹ کر ماضی میں دیکھیں تو زیادہ یا کم تشدد والے سماجوں میں بنیادی فرق بچوں کی سماجی تربیت اور گروہ میں ان کے ذاتی تشخص کے معاملات ہیں (فیرو 1978ء)۔ میکسیکو کے دو یکساں سماجی معاشی خصوصیات کے حامل لیکن تشدد کے واقعات میں نمایاں طور پر مختلف زاپوٹیک دیہاتوں کے ایک تقابلی مطالعے سے ڈوگلس پی فرائی (1994ء) نے ان کی اہمیت ظاہر کی ہے۔ پُرامن لاپاز میں، جہاں شاذ و

نادر قتل ہوتا ہے، وہاں کے شہری خود کو ''مودب، پُرامن، غیر حاسد اور تعاون فراہم کرنے والا'' سمجھتے ہیں (140)۔ اس کے نزدیک ہی پُرتشدد بستی سان اینڈریز میں، وسیع طور پر تسلیم کردہ بالکل برعکس نظامِ اقتدار موجود ہے جو تشدد سے چشم پوشی کرتا ہے (141)۔ ان کے یہاں خواتین کا احترام نہیں کیا جاتا، بیویوں کی مار پیٹ، بچوں کو جسمانی سزائیں، نافرمان بچے، جھوٹی قسمیں کھانا، شراب پی کر دنگا کرنا، جنسی رقابتوں، باہمی تنازعے، اور انتقام میں قتل کرنا ایک روزمرہ ہے۔ تقریباً یکساں مادی اور ساختیاتی صورت حال میں سان اینڈیز میں قتل کی شرح 18.1 فی ایک لاکھ ہے۔ اس کے مقابلے میں لاپاز میں یہ شرح 3.4 فی لاکھ ہے۔ یہ تقابل ہمیں یہ سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے کہ انسانی فطرت کے بارے میں قنوطیت اور تشدد سے چشم پوشی کے برادری کے اصول ہلاکت آفرینی کے ساتھ لازم وملزوم ہیں؛ جبکہ غیر متشدد عقائد اور اقدار ایک ہلاکت گریز سماج کی طرف راغب کرتے ہیں۔

حیوانی رویہ، جینیاتی رجحان، حیاتیاتی بشریات، علم الاخلاق، اعصابی فعلیات، جسمانی بشریات، سیاسی نفسیات، نفسیاتی طب، نفسی حیاتیات، نفسیات، سماجی نفسیات، اور عمرانیات کے علم کے ماہرین کے ایک بین الاقوامی گروپ نے 16 مئی 1986ء کو سیوائل میں ''تشدد پر موقف'' کا تاریخی اعلان جاری کیا جس سے انسان کی ہلاکت گریز صلاحیتوں پر اعتماد کے لیے اہم سائنسی بنیاد فراہم ہوئی ہے۔ انہوں نے اعلان کیا:

> **یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے** کہ ہم نے اپنے حیوانی اجداد سے جنگ کرنے کا رویہ ورثے میں پایا ہے..... **یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے** کہ جنگ یا کوئی دوسرا پُرتشدد

رجحان ہماری انسانی فطرت میں جینیاتی طور پر داخل کیا گیا ہے..... **یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے** کہ انسانی ارتقا کے عمل میں رجحانات کی دیگر قسموں کے مقابلے میں جارحانہ رجحان کو زیادہ اختیار کیا گیا ہے..... **یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے** کہ انسان ایک ''پُرتشدد ذہن'' کا مالک ہے..... **یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے** کہ جنگ کا باعث 'جبلت' یا کوئی واحد تحریک ہے۔

اسٹین فورڈ کے نفسیاتی معالجین کی ہلاکت گریز خوش امیدی کی برابری کرتے ہوئے سیوائل کے ان ماہرین نے اعلان کیا:

ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حیاتیات انسانیت کو جنگ کے لیے مجبور نہیں کرتی اور یہ کہ انسانیت کو حیاتیاتی قنوطیت کی قید سے آزاد کرایا جاسکتا ہے اور امن کے بین الاقوامی سال اور آنے والے برسوں میں درکار قلبِ ماہیت کے اہداف کی ذمہ داری لینے کے لیے پُراعتمادی کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ باوجودیکہ یہ اہداف اداروں کے اور اجتماعی ہیں، ان کا انحصار انفرادی شراکت داروں کے شعور پر بھی ہے جن کے لیے قنوطیت اور خوش امیدی فیصلہ کن عامل ہیں۔ جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ 'جنگیں لوگوں کے ذہنوں میں شروع ہوتی ہیں'، بالکل اسی طرح امن بھی ہمارے ذہنوں میں شروع ہوتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی (آدمز 1997 ; 1989:201)۔

2 اگست 1939ء کو البرٹ آئن اسٹائن نے امریکی صدر فرینکلن ڈی روز ویلٹ کو ایک خط لکھ کر اطلاع فراہم کی تھی کہ جوہری طبیعات اس حد تک ترقی کر چکی ہے کہ ''ایک نئی قسم کے انتہائی طاقتور بم'' کی تخلیق ''قریب القیاس'' ہے (ناتھن اور نارڈن، 1968: 295)۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امریکی حکومت نے ایک مشاورتی کمیٹی کی تشکیل پر، 6 ہزار ڈالر کی ابتدائی سرمایہ کاری کی اور پھر کئی بلین ڈالر مین ہٹن پروجیکٹ کے لیے مختص کیے، اور 6 سال

بعد دنیا کے پہلے یورینیم اور پلوٹنیم بموں کی تخلیق ہوئی اور وہ جاپان کے دو شہروں پر گرائے گئے۔ ساٹھ سال بعد وثوق کے ساتھ یہ کہنا ممکن ہوا ہے کہ ہلاکت گریز انسانی صلاحیتوں کے بارے میں کافی سائنسی شواہد سامنے آئے ہیں اگر باضابطہ طور سے مربوط کیے اور آگے بڑھائے جائیں تو ہلاکت گریزی کے حوالے سے انسان کی قلب ماہیت کے قوی امکانات موجود ہیں۔ ان مظاہر میں ایک سو سے زیادہ ڈاکٹریٹ کے مقالے شامل ہیں جن میں ''عدم تشدد'' پر تحقیق پیش کی گئی اور جو 1963ء سے اب تک صرف ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کثرت سے شائع ہو چکے ہیں، یہ مقالے بشریات، تعلیم، تاریخ، زبان و ادب، فلسفہ، نفسیات، علم سیاسیات، مذہب، عمرانیات، زبانی ابلاغ اور دینیات جیسے شعبوں کے بارے میں لکھے گئے (ڈیزرٹیشن ایبس ٹریکٹ انٹرنیشنل 1963ء)۔

ہندوستان جیسے دوسرے ملکوں میں اور انگریزی کے علاوہ دیگر زبانوں میں، کانفرنسوں میں پیش کردہ مقالوں میں، کتابوں اور مختلف علوم کے سمپوزیم میں (کول 1990;1993)، بعض اولین تجزیوں میں (گریگ 1966ء)، نئے جرائد میں (انٹرنیشنل جرنل آف نان وائیلنس 1993ء)، غیر متشدد عمل کے ایک اہم کتابیاتی سروے میں (میکارتھی اور شارپ 1997ء)، اور ایسے ہی دیگر ماخذوں میں جو نتائج سامنے آئے ہیں ان سے یہ واضح ہے کہ عدم تشدد نظریات کے علم کا ایک حقیقی وجود ''امن'' اور ''تنازعے کے حل'' کے ساتھ ساتھ نمو پا رہا ہے۔ آج عدم تشدد کے بارے میں جس قدر علم موجود ہے اس کا موازنہ ایٹمی طبعیات کے علم کی اس سطح سے کیا جا سکتا ہے جو 1939ء میں موجود تھی۔

غیر مہلک صلاحیتوں کے نمایاں مظاہر

ایمائیل ڈرخائم (1917ء۔1858ء)، جدید عمرانیات کا بانی ہے، وہ نظری دلچسپی کے سوالات سے متعلق سماجی زندگی کے ''نمایاں مظاہر'' کی جانب توجہ پر زور دیتا ہے۔ اس تصور کو امریکی سماجی نفسیات دان ڈونالڈ ٹی کیمپ بیل نے آگے بڑھایا ہے۔ اس نے نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی کے سیاسیات کے گریجویٹ طلبا کو یہ بتایا کہ ایک تجرباتی لیباٹری میں کیے جانے والے تجربات سے ملتے جلتے ''فطری طور پر واقع ہونے والے تجربات'' کا ہوشیاری کے ساتھ مشاہدہ کریں (پیگ 1971ء)۔ علم سیاسیات عملی چونکہ مشاہدے کی بنیاد پر نظریے قائم کرنے پر راغب ہوتی ہے __ مثلاً میکیاویلی کے بے رحم حکمراں سیزر بورجیا کی نظریاتی حکمت عملیوں کی تفصیل پر مبنی کتاب ''دی پرنس''۔ تاریخی اور ہم عصر تجربات کے نتیجے میں ''فطری طور پر'' ابھرنے والے ہلاکت گریز رجحانات کی مثالیں غیر متشدد سماجی تبدیلی کے امکانات کی شناخت کے لیے خاص طور پر معنی خیز ہیں۔

ہلاکت گریز صلاحیتوں کے نمایاں مظاہر میں سرکاری پالیسیاں، ادارے، ثقافتی اظہار، غیر متشدد سیاسی جدوجہد، تاریخی مثالیں اور اپنے کام سے گہری وابستگی رکھنے والے افراد شامل ہیں۔

سرکاری پالیسیاں

ہلاکت گریز سماج کے قیام کے لیے کیے جانے والے سیاسی فیصلوں کی شاندار مثالیں ان ممالک میں پائی جاتی ہیں جنہوں نے سزائے موت ختم کر دی ہے، جو فوج نہیں رکھتے اور جو فوجی ملازمت کرنے والوں کے اس حق کو تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اصولی طور پر قتل کرنے کے احکامات پر اعتراض کر سکیں۔

اپریل 2000ء تک، دنیا کے 195 ملکوں اور علاقوں میں سے 73 نے تمام جرائم کے لیے سزائے موت کو ختم کر دیا ہے۔

دوسری جدول

سزائے موت نہ رکھنے والے ممالک اور علاقے (73)

انڈورا	ایسٹونیا	ماریشس	سیکیلس
انگولا	فن لینڈ	مائیکرونیشیا	سلوویک ری پبلک
آسٹریلیا	فرانس	مالدووا	سلووینیا
آسٹریا	جارجیا	موناکو	سالومن آئی لینڈز
آذربائی جان	جرمنی	موزمبیق	جنوبی افریقہ
بیلجیم	یونان	نمیبیا	اسپین
بلغاریہ	گنی بساؤ	نیپال	سوئیڈن

کمبوچیا	ہیٹی	نیدرلینڈ	سوئٹزرلینڈ
کینیڈا	ہونڈراس	نیوزی لینڈ	ترکمانستان
کیپ وردی	ہنگری	نکاراگوا	توالو
کولمبیا	آئس لینڈ	ناروے	یوکرین
کوسٹاریکا	آئرلینڈ	پلاؤ	برطانیہ
کروشیا	اٹلی	پناما	یوروگوئے
چیک ری پبلک	کری باتی	پیراگوئے	وینا تو
ڈنمارک	لیخ ٹن سٹین	پولینڈ	ویٹکن شہری ریاست
جبوتی	لتھوانیا	پرتگال	وینز ویلا
ڈومینکن ری پبلک	لکسمبرگ	رومانیہ	
مشرقی تیمور	مقدونیہ	سان میرینو	
ایکویڈور	مارشل	ساؤتوم اور پرنسپ	

ماخذ: ایمنسٹی انٹرنیشنل، اپریل 2000ء

سزائے موت کے مکمل خاتمے کی ہر مثال سائنسی اور عوامی مفاد کی پالیسی کے دباؤ کا نتیجہ ہے۔ ہر حکومت قتل نہ کرنے کا فیصلہ کیوں، کیسے اور کب کرتی ہے؟ وہ کون سا تاریخی عنصر ہے جس کی وجہ سے بعض ملکوں کی، ثقافتوں اور علاقوں کی نمائندگی کیوں ہوتی ہے جبکہ دوسرے قطعاً غیر حاضر ہوتے ہیں؟ وہ کون سے عوامل ہیں جن کی بناء پر موجودہ عالمی صورتحال وجود

میں آئی ہے؟ اور ہلاکت گریز سماجوں کے مستقبل میں عالمی سطح پر قیام کے لیے عدم تشدد کی یہ مثالیں کن مضمرات کی حامل ہیں؟

سزائے موت کا مکمل طور پر خاتمہ کرنے والے ملکوں کے علاوہ، 14 ریاستوں نے معمولی جرائم کے لیے سزائے موت کو ختم کر دیا ہے جبکہ مارشل لا یا جنگ کے موقعہ پر اس کو برقرار رکھا ہے (مثال کے طور پر ارجنٹائن، بوسنیا۔ ہرزی گووینا، برازیل، اسرائیل، میکسیکو، جنوبی افریقہ اور برطانیہ)۔ 23 ملکوں نے قانون کی کتابوں میں سزائے موت کو برقرار رکھا ہے لیکن دس یا اس سے زیادہ برسوں سے کسی پر اس کا اطلاق نہیں کیا (مثلاً البانیہ، برونائی، دارالسلام، کانگو، پاپوانیوگنی، سینیگال، سری لنکا، ترکی اور مغربی سموا)۔ 91 ملکوں نے سزائے موت کو قانوناً برقرار رکھا ہوا ہے اور ان میں سزائے موت دی جارہی ہے (بشمول چین، مصر، ہندوستان، انڈونیشیا، جاپان، نائیجیریا، پاکستان، روس اور امریکہ)۔ گو کہ امریکہ میں وفاقی جرائم پر سزائے موت برقرار ہے، لیکن اس کی پچاس میں سے بارہ ریاستی اور ڈسٹرکٹ کولمبیا اس کا خاتمہ کر چکی ہیں: الاسکا، ہوائی، آئیووا، مائین، میساچوسیٹس، مشی گن، منی سوٹا، شمالی ڈکوٹا، رہوڈ آئی لینڈ، ورمونٹ، مغربی ورجینیا، اور وسکونسن۔

سزائے موت کو رد کرنے یا دوبارہ اس کو نافذ کرنے کے تذبذب کے باوجود، حکومت کی جانب سے سزائے موت کے خاتمے کا عالمی رجحان ہلاک گریز سماج کے قائم ہونے کے اعتماد کو تقویت پہنچاتا ہے۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ روسو کے ''سماجی معاہدے'' میں شہریوں کو قتل کرنا شامل کیا جائے اور نہ میکس ویبر کی تجویز کے مطابق اسے سیاست کا ناقابلِ

تنسیخ جُز یا خاصہ ہونا چاہیے۔

2001ء میں ہمیں اُن 27 ملکوں کے بارے میں بھی غور کرنا چاہیے جن کے پاس کوئی فوج نہیں ہے۔ان میں سے کُک آئی لینڈز، نیوئی، اور ویٹکن کے علاوہ سارے ملک اقوام متحدہ کے رکن ہیں۔

تیسری جدول

فوج نہ رکھنے والے 27 ملک

کوئی فوج نہیں ہے (19)	کوئی فوج نہیں ہے (دفاعی معاہدے) (8)
کوسٹاریکا	انڈورا (اسپین، فرانس)
ڈومینکا	کک آئی لینڈز (نیوزی لینڈ)
گرینیڈا	آئس لینڈ (ناٹو، امریکہ)
ہیٹی	مارشل آئی لینڈز (امریکہ)
کریباتی	مائیکرونیشیا (امریکہ)
لیخٹینسٹین	موناکو (فرانس)
مالدیپ	نیوئی (نیوزی لینڈ)
ماریشس	پاؤلا (امریکہ)
نورو	
پناما	

سینٹ کٹس اور نیوس

سینٹ لوسیا

سینٹ وِنسنٹ اور دی گرینیڈائنس

سموا

سان مارینو

سالومن آئی لینڈس

تووالو

ونواتو

ویٹکن

ماخذ: باربی 2001ء

کم از کم اٹھارہ ملک یا جغرافیائی علاقے ایسے ہیں جو کسی دوسرے ملک کے زیرِ اثر ہیں اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری اُن ملکوں کے ساتھ معاہدوں کے ذریعے ہے چنانچہ وہ فوج سے پاک ہیں جیسے فن لینڈ کے الانڈ آئی لینڈز، یا انٹارکٹیکا اور مون جیسے علاقے جنہیں بین الاقوامی معاہدے کے تحت فوج سے پاک قرار دیا گیا ہے، (باربی 2001ء)۔

ایسے ملک جہاں فوج کو قومی شناخت، سماجی نظم و ضبط، دفاع، اور حملوں کے لیے ناگزیر خیال کیا جاتا ہے وہاں بعض ملکوں میں فوجوں کی غیر موجودگی باعثِ حیرت ہو سکتی ہے۔ فوج نہ رکھنے والے ملک چھوٹے ہیں __ اور ان میں سے چند مسلح اتحادیوں پر یا پیرا ملٹری

فورسز پر انحصار رکھتے ہیں__ اس کے باوجود وہ غیر فوجی ریاستی حیثیت کے امکان کا مظاہرہ کرتے ہیں۔اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ہلاکت گریز اقوام نا قابلِ تصور نہیں ہیں۔

ایسے ملکوں میں جو فوجیں رکھتے ہیں، جبری فوجی خدمات پر اصولی اعتراض کی ریاستی منظوری ہلاکت گریز سیاسی صلاحیت کا مزید ثبوت فراہم کرتی ہے۔فوجی ملازمت کے دوران قتل کرنے سے شہریوں کے اصولی انکار کی بعض شکلوں کو 1998ء میں 47 ممالک نے قانونی طور پر منظوٗر کیا۔

چوتھی جدول

فوجی خدمات پر اصولی اعتراض تسلیم کرنے والے ممالک اور عمل داریاں (47)

آسٹریلیا	چیک ریپبلک	اٹلی	پرتگال	یوکرین
آسٹریا	ڈنمارک	کرغزستان	رومانیہ	برطانیہ
آذربائیجان	ایسٹونیا	لٹویا	روس	امریکہ
بیلجیم	فن لینڈ	لتھوانیا	سلوواکیہ	یوروگوئے
برمودا	فرانس	مالٹا	سلووینیا	ازبکستان
برازیل	جرمنی	مالدووا	جنوبی افریقہ	یوگوسلاویہ
بلغاریہ	یونان	نیدرلینڈز	اسپین	زمبابوے
کینیڈا	گیانا	ناروے	سرینام	
کروشیا	ہنگری	پیراگوئے	سوئیڈن	

قبرص (یونانی قبرص) اسرائیل پولینڈ سوئٹزرلینڈ

ماخذ: ہورمن اور اسٹالوک 1998ء

قتل سے اعتراض کا قابلِ قبول جواز محدود مذہبی حوالوں سے لے کر قتل سے انکار کے روحانی، فلسفیانہ، اخلاقی، انسان دوستی اور سیاسی وجوہ کی بناء پر ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ متبادل خدمات، خدمت پر مامور فوجیوں کے اصول اور ضمیر کے مطابق اعتراض کرنے کا اختیار اور قوانین کے نفاذ کا قابل بھروسہ ہونا ضروری ہوتا ہے (موسکوس اور چیمبرس 1993ء)۔ وفاقی جمہوریہ جرمنی میں 1949ء کے اساسی قانون کے آرٹیکل 4 میں جان لینے سے انکار کا انتہائی کشادہ دل رجحان شامل کیا گیا ہے، اس کے مطابق: ''کسی شخص کو اس کے ضمیر کے خلاف ہتھیاروں کے ساتھ جنگی خدمات ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا'' (کوہل مان اور لپرٹ 1993ء:98)۔ سزائے موت کو ختم کرنے اور فوج کے بغیر ابھرنے والے ملکوں کا معاملہ ہے، اسی طرح فوجی قاتلوں کی حیثیت سے خدمات انجام دینے سے انکار کو سیاسی طور پر تسلیم کرنے جیسے تدریجی تغیرات، عالمی سطح پر اہم سائنسی توجہ کے حامل ہیں۔

سماجی ادارے

مستقبل میں ہلاکت گریز سماج کے وجود میں لانے والے اور اسے قابل عمل بنانے والے ادارے پہلے ہی دنیا کے مختلف حصوں میں ظہور پذیر ہو چکے ہیں۔ اس سے جان نہ لینے

کے عہد کے لیے انسانی صلاحیتوں کا مزید ثبوت حاصل ہوتا ہے۔ اگر یہ بکھرے ہوئے ادارے تخلیقی طور پر یکجا کر دیے جاتے اور کسی واحد سماج کی ضروریات کے مطابق ڈھال دیے جاتے تو اب بھی ایک ایسے ہلاکت گریز سماج کی تشکیل قرین قیاس ہوسکتی ہے جو محض قیاس اور خیال آرائی کی پیداوار نہیں بلکہ ظاہر کردہ انسانی تجربات پر مبنی ہے۔ بہت سوں میں سے یہاں چند کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔ ہر ایک کی اپنی تفصیل ہے جو مکمل بیان کی متقاضی ہے۔

روحانی ادارے

ہلاکت گریز عقائد کو ماننے والے مذہبی ادارے ہمیں دنیا بھر میں مل سکتے ہیں۔ ان میں مشرق کے جین مت کو ماننے والے، مغرب کے کوئکر (Quakers)، جاپان کی دی یونیورسل پیس اینڈ برادر ہڈ ایسوسی ایشن، فرانس میں بدھ مت کے ماننے والوں کی پلم ولیج برادری، افریقہ میں سائمن کمبانگو چرچ، روس اور کینیڈا کے ڈوخوبور (روح سے کشتی لڑنے والے) امن پسند، اور امریکہ میں یہودیوں کی پیس فیلوشپ جیسے ادارے شامل ہیں۔ 1919ء میں عالمی طور پر قائم کردہ انٹرنیشنل فیلوشپ آف ری کنسی لی ایشن، ہر عقیدے کے مردوں اور خواتین کو یکجا کرتی ہے ''جو، انصاف مہیا کرنے اور برادری کی تعمیر نو کے لیے اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ قلب ماہیت کے لیے عدم تشدد کو وہ ذاتی، سماجی، معاشی اور سیاسی سطح پر زندگی کا ایک رویہ بنا لیتے ہیں۔''

سیاسی ادارے

1955ء میں رونالڈ میلون، جان لورسیڈ اور دیگر عیسائی امن پسندوں اور دوسری عالمی جنگ میں حصہ لینے والوں نے برطانیہ کی فیلوشپ پارٹی قائم کی جو ایک انتخابی سیاسی پارٹی ہے جو عدم تشدد کے اصولوں سے وابستہ ہے۔[3] یہ پارٹی فنون اور کھیلوں کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہوئے جنگ کے لیے تمام تر تیاریوں کے خلاف اور معاشی اور سماجی انصاف کے حق میں مہم چلاتی ہے۔ جرمنی میں، پیٹرا کے۔ کیلی اور تیس دیگر افراد نے 1979ء میں ماحولیاتی حوالے سے ڈائی گرونن (گرین پارٹی) قائم کی، اس کے نمایاں اصولوں میں سے ایک ''عدم تشدد'' ہے۔[4] اس کے نمایاں افراد مہاتما گاندھی اور مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کی عدم تشدد کی تحریکوں سے متاثر تھے (کیلی 1989ء)۔ دنیا بھر کی گرین پارٹیاں اس پالیسی پر عمل میں مبہم رہتی ہیں، تاہم عدم تشدد سے ان کی بنیادی وابستگی ایک ایسی اختراعی سماجی تحریک کو جنم دیتی ہے جو انتخابات میں حصہ لینے والی ایک سیاسی پارٹی کی شاندار نظیر فراہم کرتی ہے۔ امریکہ کی پیس فسٹ پارٹی، جسے 1983ء میں بریڈفورڈ لائٹل نے روحانی، سائنسی، اور انسان دوست اصولوں پر قائم کیا اور جس نے 1996ء اور 2000ء کے صدارتی انتخابات میں اس کے نمائندے کے طور پر حصہ لیا، اس کا مقصد امریکی سماج کی عدم تشدد کے اصولوں کی بنیاد پر قلب ماہیت ہے اور وہ ان ہی خطوط پر امریکہ کو دنیا میں کردار ادا کرتے دیکھنا چاہتی ہے۔[5] ٹی کے یونی تھان اور دیگر کی قائم کردہ، ہندوستان کی سروودیہ پارٹی سب کی بھلائی کے لیے سماجی ترقی کے گاندھیائی نمونے کو فروغ

دینے کے لیے انتخابی میدان میں داخل ہوئی ہے۔ [6] سیاست سے دور رہنے کی گاندھی کی روایت سے اپنی علیحدگی کا جواز پیش کرتے ہوئے، سروودیہ پارٹی وضاحت کرتی ہے: ''اقتدار اپنے کردار کے اعتبار سے غیر جانبدار ہے، یہ اگر بدعنوان لوگوں کے ہاتھوں میں چلا جائے تب ہی بدعنوانی میں مبتلا ہوتا ہے۔ 1987ء میں اٹلی کے پارتیتو ریڈیکل کی کوکھ سے گاندھیائی عدم تشدد سے متاثرہ، ایک بے مثال ٹرانزیشنل ریڈیکل پارٹی نے جنم لیا۔ اس کا مقصد اقوام متحدہ پر عدم تشدد کے اصولوں کے تحت خصوصی طور پر اثر انداز ہونا ہے۔ مثال کے طور پر پوری دنیا سے سزائے موت کے خاتمے کے لیے، (جنگ کے دوران قتل سے) اصولی اعتراض کو تسلیم کرنے کے لیے، اور جنگی مجرموں پر مقدمہ چلانے کے لیے ___ یہ پارٹی قومی انتخابات میں حصہ نہیں لیتی؛ اس کے ارکان کسی بھی دوسری سیاسی جماعت کی رکنیت رکھ سکتے ہیں؛ اس کے رکن ممالک کے لیے فی کس مجموعی پیداوار کا ایک فیصد کے تناسب سے مقررہ واجب الادا رقم رکھی گئی ہے:۔ مہاتما گاندھی کے تصور کے تحت پارٹی اس بات کا اعلان کرتی ہے: ''ایک بہتر دنیا کی تعمیر کرنے کے لیے قومی مفادات سے بالاتر قوانین اور عدم تشدد انتہائی موثر ہیں۔''

معاشی ادارے

ہلاکت گریز اصولوں کا پرچار کرنے والے ممتاز معاشی اداروں میں ایک ایسا مشترک اسٹاک فنڈ قائم کیا جاتا ہے جو جنگی صنعتوں میں سرمایہ کاری نہیں کرے گا (پیکس ورلڈ فنڈ)؛

ایک مزدور یونین جو گاندھی اور کنگ کے عدم تشدد کے فلسفے سے متاثر ہوکر قائم کی گئی ہے (سیزر شاویز، ڈولورس ہیوورٹا، اور دیگر کی قائم کردہ یونائیٹڈ فارم ورکرز آف امریکہ)؛ عدم تشدد کے بودہ اصولوں پر مبنی سری لنکا میں ایک جامع کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام (سروودیا شرما دانا سنگا مایا اے ٹی آر یہ رتنے کی سربراہی میں شروع ہوا)۔ گاندھی کے نظریے ''ٹرسٹی شپ'' (متولیوں کے سپرد کرنا) سے متاثر ہوکر ونوبا بھاوے (1994ء) اور جے پرکاش نارائن (1978ء) کی سربراہی میں بے زمین کسانوں کو زمین منتقل کرنے کی ہندوستان کی بھودان (زمین کا تحفہ) کا تجربہ شروع ہوا۔ اس تجربے کی محدود کامیابی سے ظاہر ہوا کہ کمیاب وسائل کی عدم تشدد کے اصولوں پر حصہ داری ناقابلِ تصور نہیں ہے۔ مخیّر تنظیمیں سماج میں عدم تشدد کے پھیلاؤ کے لیے امداد کرتی ہیں؛ دی گاندھی فاؤنڈیشن (لندن)، سروودیا انٹرنیشنل ٹرسٹ (بنگلور)، اور اے جے مُستی (Muste) انسٹی ٹیوٹ (نیویارک) ان میں سے چند ہیں۔

تعلیمی ادارے

شدید انسانی تقاضوں میں معاونت کرنے کے لیے عدم تشدد کے کثیر العقائد جوہر پر ایک مکمل یونیورسٹی کی بنیاد رکھنے کے امکان کو مہاتما گاندھی کے نظریات سے متاثر ڈاکٹر جی راما چندرن (1995ء۔1903ء) نے جو ایک مانے ہوئے استاد تھے، تامل ناڈو، ہندوستان میں گاندھی گرام رورل انسٹی ٹیوٹ (Deemed University) قائم کرکے ورثے کے طور

پر چھوڑا ہے۔ اس یونیورسٹی کا مقصد عدم تشدد کی کثیر العقیدہ روح کے مطابق انسانی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔ اس یونیورسٹی نے اپنے اردگرد کے تیس قصبات کو خدمات فراہم کیں۔ بعض اہم اساسی خصوصیات یہ تھیں: (۱) باضابطہ تعلیم اور کمیونٹی پر اس کے اطلاق کو یکجا کرنا؛ سیاسیات اور سائنس اور دیہی سطح پر فیصلہ سازی، طبیعیات اور ریڈیو کی مرمت، حیاتیات اور کنووں کی صفائی، فنون اور بچے کا تخلیقی ارتقا، (۲) گریجویشن کرنے والے ہر طالب علم سے مسائل کے حل پر مقالہ لکھوانا، (۳) تین زبانوں کی تعلیم دینا، مقامی ضرورتوں کے پیش نظر تامل، قومی ہم آہنگی کے لیے ہندی، اور دنیا سے روشناسی کے لیے انگریزی، (۴) یونیورسٹی کیمپس کی دیکھ بھال اور خدمات کے لیے سب سے کام کرانا؛ مثلاً جمعداروں، زمینوں کے رکھوالوں اور باورچیوں کی جگہ۔

اعلیٰ تعلیم کے اس ادارے کے اندر راما چندرن کا سب سے بڑا کام فوجی تربیت کا عدم تشدد پر مبنی ایک متبادل قائم کرنا تھا__ جسے شانتی سینا (امن دستہ) کا نام دیا گیا تھا__ اس دستے کے فعال چیف آرگنائزر سماجی علوم کے پروفیسر این رادھا کرشن (1997ء؛ 1992ء) بنے۔ 1958ء سے 1988ء تک شانتی سینا نے پانچ ہزار باوردی نوجوان مرد اور عورت رضا کاروں کو تربیت فراہم کی جنھوں نے ''امن کے لیے کام کرنے اور بہ وقتِ ضرورت، اس کے لیے اپنی جان قربان کر دینے کے لیے تیار رہنے'' کا عہد کیا۔ روحانی، جسمانی، عقلی اور انتظامی تربیت کو یکجا کر کے، شانتی سینا نے طلبا کو تنازعات کے حل، حفاظتی فرائض، آفات کے موقع پر لوگوں کی امداد، اور کو آپریٹو کمیونٹی خدمات اور ضرورتوں کو پورا

کے لیے تیار کیا۔ بچوں کی دیکھ بھال، گندے پانی کی نکاسی، گھروں کی تعمیر اور لوک ورثہ کی حفاظت جیسے کاموں میں بہتری لانے کے لیے گاؤں والوں کے ساتھ مل کر کام کرنا ان لوگوں کا اندازِ نظر تھا۔ 1970ء کی دہائی کے وسط میں جب ہندوستان کی شہری یونیورسٹیوں کے خلاف لاوا ابل رہا تھا اور انہیں استحصال کا ذریعہ قرار دیا جا رہا تھا، گاندھی گرام کے اردگرد کے دیہاتی اپنے رورل انسٹی ٹیوٹ کو Deemed University کا درجہ دیے جانے کا جشن منا رہے تھے۔ کیمپس کے تحفظ کی ذمہ داری شانتی سینا کی تھی۔ مسلح پولیس کو کیمپس میں آنے کی اجازت نہیں تھی، حتیٰ کہ وزیراعظم نہرو، مسز اندرا گاندھی اور دیگر ممتاز شخصیات کی آمد پر بھی پولیس کیمپس میں قدم نہیں رکھ سکتی تھی۔

تربیتی ادارے

ایسے سماجی ادارے تیزی سے نمودار ہو رہے ہیں جو سماجی تبدیلی، نزاعی معاملات میں بیچ بچاؤ، سماجی دفاع اور دیگر مقاصد کے لیے تربیت فراہم کرتے ہیں۔ قومی سرحدوں اور اس کے پرے ان تجربہ کار تربیت دینے والوں کی مانگ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جو مسئلے کو عدم تشدد پر مبنی طریقوں سے حل کرتے ہیں اور مسائل کے حل کے لیے متشدد طریقوں کو تبدیل کرنے کی انسانی صلاحیت پر اعتماد میں اضافہ کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے چند تنظیموں اور معروف تربیت کاروں کا ذکر کیا جانا ضروری ہے (بیئر 1994ء): عدم تشدد کا راما چندرن

اسکول (این رادھا کرشنن)، پیس بریگیڈز انٹرنیشنل (نارائن ڈیسائی) لافیبیٹ اینڈ ایسوسی ایٹس کی شراکت میں فلوریڈا مارٹن لوتھر کنگ جونیئر انسٹی ٹیوٹ برائے عدم تشدد (برنارڈ لافیٹ جونیئر، چارلس ایل الفن سینئر، اورڈیوڈ جیہن سین)، انٹرنیشنل فیلوشپ آف ری کنسی لی ایشن (ہلڈ لے گارڈ گاس۔ مائراورر چرڈ ڈیٹس)، ٹریننگ سینٹر ورکشاپس (جارج لیکی)، وار ریزسٹنس انٹرنیشنل (ہوورڈ کلارک)، پیلسٹینن سینٹر فار دی اسٹڈی آف نان وائیلنس (مبارک اواد) نان وائیلنس انٹرنیشنل (مائیکل بیئر)، سروسیو پاز وائی جسٹیسیا (اڈولفو پیریز ایسکوئی ویل)، دی انٹرنیشنل نیٹ ورک آف انگیجڈ بدھسٹ (یشوا موسر۔ پوانگسو وان)، اور ٹرانسینڈ (جوہن گال ٹنگ)۔

عدم تشدد کی بنیادوں پر ذاتی تحفظ، سماجی تبدیلی اور کردار کی نشوونما میں تربیت کا ایک اہم ذریعہ جاپان میں وجود میں آنے والا عدم تشدد کا مارشل آرٹ ایکیڈو ہے۔ اس کے بانی، موری ہی اوشیبا کی کے تعلیمات کے مطابق ''کچل دینا، زخمی کرنا، یا تباہ کرنا بدترین انسانی جرم ہے۔'' کائنات کی قوتِ حیات کے ساتھ ہم آہنگی ایکیڈو کا مقصود ہے۔ ''ایکیڈو محبت کی تجسیم ہے'' (اسٹی وینس 1987:94,112ء؛ یوڈر 1983:28ء)۔

سلامتی کے ادارے

دنیا بھر میں متعدد ادارے غیر مہلک طریقوں سے کمیونٹی کے تحفظ کی صلاحیت کی مثال

پیش کرتے ہیں۔ان میں وہ ملک شامل ہیں جن کے شہری فی الحقیقت غیر مسلح ہیں (جاپان)، پولیس کے پاس آتشیں اسلحہ تقریباً بالکل نہیں ہوتا (برطانیہ)، ایسا قید خانہ جہاں کے محافظ مسلح نہیں ہوتے (فن لینڈ)، پُرامن غیر مسلح علاقے (سیٹیو کینٹو منیوگ، فلپائن)، شہریوں کے دفاع کے لیے ایک غیر مسلح ایسوسی ایشن (بنڈ فرسوزیل ورٹی ڈی گنگ، منڈرین، جرمنی) عدم تشدد کے اصولوں پر کام کرنے والی ایسی تنظیمیں جو مسلح تصادم کے علاقوں میں امن کے لیے کوششیں کرتی ہیں (موسر پوانگ سوان اور ویبر 2000ء؛ ماہونی اور ایگورین 1997ء)۔ اسلحے سے پاک دنیا کے لیے کوشش کرنے والی حکومتوں اور شہری تنظیموں کی مختلف تحریکوں کو بھی اس فہرست میں لازماً شامل کرنا چاہیے: یہ وہ ہیں جو، جوہری، حیاتیاتی اور کیمیائی ہتھیاروں کو ختم کرنے کے لیے؛ اور دستی گنوں، حملہ کرنے والے ہتھیاروں، اور بارودی سرنگوں پر پابندی کے لیے کام کر رہی ہیں۔ان تنظیموں میں کوسٹاریکا کے سابق صدر اور 1987ء کے نوبل امن انعام یافتہ آسکر اریاس سانچیز کا قائم کردہ، سینٹر فار پیس اینڈ ری کنسی لی ایشن جس کا مقصد دنیا کو عسکریت اور تنازعات سے پاک کرنا ہے؛ غلاموں کی تجارت مخالف تجربے کی پیروی کرنے والی، موومنٹ ٹو ابالش دی آرمز ٹریڈ، رینالڈو پاچیکو اور ہیڈی وائی۔ یوراک کی فلپائن میں قائم کردہ تنظیم نیچر/گن لیس سوسائٹی نامی تنظیم جو ''معدومیت کے خطرے سے دوچار مخلوق'' انسان کو بچانے کے لیے بنائی گئی ہے۔ (ولا وِن سینشیو۔ یوروم 1995ء)۔

تحقیقی ادارے

مغرب میں، جین شارپ کا قائم کردہ، دی البرٹ آئن اسٹائن انسٹی ٹیوشن (کیمبرج، میساچوسیٹس) دنیا بھر میں جمہوریت، سلامتی اور عدل کے لیے عدم تشدد پر مبنی جدوجہد کے بارے میں تحقیق پر عمل پیرا ہے۔ مشرق میں، جے پرکاش (''جے۔پی'') نارئن کا قائم کردہ، گاندھین انسٹی ٹیوٹ آف اسٹڈیز (درانسی، انڈیا) عدم تشدد پر مبنی سماجی تبدیلی کے لیے سماجی سائنس کی تحقیق میں مصروف ہے۔ بالائے قومی سطح پر، تھیوڈور ایل۔ ہرمن کی قائم کردہ، نان وائیلنس ایکشن آف دی انٹرنیشنل پیس ریسرچ ایسوسی ایشن، تحقیق، تعلیم اور عمل کے میدان میں نئی معلومات کو دنیا بھر میں پھیلانے کا کام کرتی ہے۔

مسائل کو حل کرنے والے ادارے

ہلاکت گریز اصولوں پر مسائل کے حل کے لیے وقف اداروں کی مثالوں میں ایمنسٹی انٹرنیشنل (حقوقِ انسانی کا تحفظ اور سزائے موت کا خاتمہ)، گرین پیس انٹرنیشنل (ماحولیات کا تحفظ اور جوہری ہتھیاروں کا خاتمہ)، وار ریزیسٹرز انٹرنیشنل (جبری فوجی بھرتی پر اصولی اختلاف کا تحفظ اور تمام جنگی تیاریوں کی مزاحمت)، اور میڈیسنس ساں فرنٹیرز (تشدد کے شکار افراد کے لیے طبی امداد) شامل ہیں۔

ذرائع ابلاغ

اس حوالے سے پہل کاری کرنے والے صحافی کولمین میکارتھی (1994ء) اور دنیا بھر کی متعدد مطبوعات مقامی اور عالمی صورت حال پر ہلاکت گریز زاویہ نظر سے لوگوں کو باخبر رکھنے اور ان پر تبصرہ کرنے کے امکان کی مثالیں پیش کر چکے ہیں۔ ان میں دوسروں کے علاوہ ڈے بائی ڈے، برطانیہ کی فیلوشپ پارٹی (لندن) کا ماہانہ پریس، آرٹس اور اسپورٹس ریویو؛ بنکاک کا بدھ مت سے تعلق رکھنے والا سیڈس آف پیس؛ بین الاقوامی پیس نیوز: برائے نان وائیلنٹ ریوولوشن (لندن)؛ فرانسیسی ماہنامہ نان وائیلنس ایکچو لائٹ (مونٹارجس)؛ اٹلی کا ''ازیونے نان وائیولینٹا'' (ویرونا)، جرمنی کا ''گراس ورٹزل۔ ریویولوشن'' (اولڈن برگ) اور امریکی جریدے فیلوشپ (نیاک، این وائی) اور نان وائیلنٹ ایکٹی وسٹ (نیویارک) شامل ہیں۔ سوشل آلٹرنیٹوز (برس بین، آسٹریلیا)، گاندھی مارگ (نئی دہلی)، اور انٹرنیشنل جرنل آف نان وائیلنس (واشنگٹن، ڈی سی) جیسے جرائد مختلف سماجی مسائل پر عدم تشدد کی تفہیم پیدا کرتے اور ان کا ابلاغ کرتے ہیں۔ بعض اشاعت گھر مثلاً نوجیون (احمد آباد، ہندوستان)، نیو سوسائٹی پبلشرز (بلین، واشنگٹن)، نان وائیلنس ایکچو لائٹ (مونٹارجس، فرانس)، اور آربس بکس (میری کینول، نیویارک) عدم تشدد پر مبنی سماجی تبدیلی کے لیے تعلیم دینے والی کتابوں کی اشاعت کے لیے مخصوص ہیں۔

ثقافتی ذرائع

عدم تشدد پر مبنی ثقافتی ذرائع وہ فنی اور فکری تخلیقات ہیں جو انسانی حوصلہ بلند کرتی اور ایک ہلاکت گریز سماج کے قیام کی جانب پیش قدمیوں کی تحریک پیدا کرتی ہیں۔ان میں لوک گیت (''ہم جیتیں گے'')، اوپیرا (ستیہ گرہ، فلپ گلاس)، ناول (لیڈی ڈاؤن یور آرمز، برتھاوان سینٹر)، شاعر (جانیز سانگ، اسٹیومیسن)، فن (سیڈ فار دی پلانٹنگ مسٹ ناٹ بی گراؤنڈ، کیتھے کول وٹز)، اور فلمیں (گاندھی، ایٹن برو) شامل ہیں۔1995ء میں احمد آباد، ہندوستان میں ملیکہ سارا بھائی کا قائم کردہ، دی سینٹر فار نان وائیلنس تھرو دی آرٹس، فلم، تھیٹر، اور ادبی فنون میں سماجی تبدیلی کے لیے ہلاکت گریز تخلیقیت کے لیے باہمی تعامل پیدا کرنے کی سعی کرتا ہے۔

عدم تشدد پر مبنی سیاسی مزاحمتیں

گو کہ تاریخ اس سے نا آشنا نہیں، بیسویں صدی کے نصف آخر میں عدم تشدد پر مبنی سیاسی مزاحمتیں انسان کی ہلاکت گریز صلاحیتوں کو زیادہ نمایاں انداز میں سامنے لاتی ہیں۔ جین شارپ نشاندہی کرتے ہیں، ''ابھی 1980ء تک بیشتر لوگوں کے لیے یہ ناقابلِ فہم تصور تھا کہ ایک عشرے کے اندر عدم تشدد پر مبنی مزاحمت __ یا عوامی قوت __ ایک ایسی اہم قوت

تسلیم کر لی جائے گی جو پوری دنیا میں سیاست کا راستہ متعین کرے گی۔ شارپ 1970ء سے 1989ء تک درج ذیل چند مقامات پر، عدم تشدد کے اصولوں پر مبنی مزاحمتوں کی نشاندہی کرتے ہیں: افریقہ (الجزائر، مراکش، جنوبی افریقہ اور سوڈان)، ایشیا (برما، چین، ہندوستان، جاپان، جنوبی کوریا، پاکستان، فلپائن اور تبت)، شمالی و جنوبی امریکہ (ارجنٹائن، بولوویا، برازیل، چلّی، ہیٹی، میکسیکو، نکاراگوا، پناما، اور ریاست ہائے متحدہ)، یورپ (ایسٹونیا، فرانس، مشرقی و مغربی جرمنی، ہنگری، آئرلینڈ، لٹویا اور یوگوسلاویہ، شرقِ اوسط (اسرائیل مقبوضہ فلسطین)، اور بحرالکاہل (آسٹریلیا اور نیو کیلی ڈونیا)۔ 1989ء کے بعد سے عوامی قوت کے پُرامن مظاہرے سابقہ سوویت یونین، مشرقی یورپ، بالٹک جمہوریتوں، اور منگولیا میں کمیونسٹ پارٹی کے اقتدار کے ڈرامائی خاتمے، جرمنی کے پُرامن طور پر یکجا ہونے؛ اور جنوبی افریقہ میں نسل پرست حکومت کے خاتمے کے لیے کردار ادا کر چکے ہیں۔

ہوسکتا ہے تمام غیر متشدد مزاحمتیں مکمل طور پر تشدد سے پاک نہ رہی ہوں، 1988ء میں برما اور 1989ء میں چین کی طرح بے رحمانہ طور پر کچل دی گئی ہوں اور بعض مبصر یہ کہتے ہوں کہ ان جگہوں پر دہشت زدہ کر دینے والے تشدد سے کام لیا گیا لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ واضح طور پر امریکی، فرانسیسی، روسی، چینی، اور دیگر پُرتشدد انقلابات کو بھول جاتے ہیں۔ ہندوستان میں گاندھی کی تحریکِ آزادی کی مثالوں سے سبق حاصل کرتے ہوئے، جس نے عالمی نوآبادیاتی نظام کی شکست میں اپنا کردار ادا کیا، امریکہ میں نسلی شہری حقوق کے لیے کنگ کی تحریک، فلپائن میں جمہوریت کے لیے عوامی طاقت کی بنیاد پر چلنے والی عدم تشدد پر مبنی

تحریک، جوہری جنگ مخالف تحریک، ماحولیاتی تحفظاتی اقدامات اور دیگر تجربات __ اعلیٰ ٹیکنالوجی کے استعمال سمیت، طاقتور اور عدم تشدد پر مبنی حکمتِ عملی اور مہارت بتدریج پیدا ہورہی ہے۔ اس کے جواب میں بعض برسر اقتدار حکومتیں، امن، آزادی، اور انصاف کے لیے عدم تشدد پر عمل پیرا شہریوں کے مطالبات کا مقابلہ کرنے میں کم متشدد طریقہ کار اختیار کرنے لگی ہیں۔

حکومتی اور انتظامی ڈھانچے کی تبدیلیوں پر اثر اندازی کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے والی وسیع مزاحمتوں کے علاوہ، بعض سماجی تحریکیں ایک ہلاکت گریز سماج کے خدوخال قائم کرنے کے لیے مخصوص تبدیلیوں کا تعین کرچکی ہیں۔ ان میں سزائے موت کے خاتمے؛ اسقاطِ حمل کے متبادلات کے لیے؛ فوجی خدمات پر اصولی اعتراض تسلیم کرانے؛ فوجوں کے خاتمے؛ عدم تشدد پر مبنی شہری دفاع قائم کرنے؛ مسلح تصادم کی لپیٹ میں آنے والے شہری اور دیہی علاقوں میں عدم تشدد پر مبنی تحفظ کی کوشش کرنے؛ جنگی محصولات کا خاتمہ کرنے؛ جوہری، حیاتیاتی اور کیمیائی ہتھیاروں کا خاتمہ کرنے؛ بارودی سرنگوں، خودکار ہتھیاروں، دستی بندوقوں کے خاتمے؛ ہلاکت آفرینی کے لیے معاشی مدد کے انقطاع؛ لوگوں کے ذاتی، اقلیتوں اور مقامی لوگوں کے انسانی حقوق کی حفاظت کرنے؛ ماحولیات کو غارت گری سے تحفظ دینے؛ اور دیگر سیاسی، فوجی، معاشی، سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں کو حقیقت کا روپ دینے والی تحریکیں شامل ہیں۔

عدم تشدد کی تاریخی طور پر بے ساختہ نمودار ہونے والی تحریکوں سے آگے بڑھ کر

بیسویں صدی کے اواخر میں غیر متشدد مزاحمتیں __ جین شارپ (1973ء)، جان گلٹنگ (1996ء؛1992ء)،جیکس سیملین (1993ء)، مائیکل رینڈل (1994ء) اور دوسروں کی ابتدائی تحقیق کی مدد سے اور عالمی سطح پر تبادلۂ خیالات میں سہولتوں کے سبب شعوری طور پر زیادہ بااصول، مزید اختراعی اور دور رس بنتی جارہی ہیں۔ عالمگیریت کے عمل کے دوران جاری خوں ریزی، ریاست اور سماج کے تشدد اور ناانصافیوں کی گرفت کرنے کے لیے عدم تشدد پر مبنی تحریکیں بڑے پیمانے پر جدید انداز اختیار کر کے ابھر رہی ہیں اور دنیا بھر میں نفوذ کر رہی ہیں (پاورس اور ووگیل 1997ء؛ زونس، کرٹز، اور آشر 1999ء؛ ایکرمن اور ڈووال2000ء)۔

تاریخی بنیادیں

اکثر نہایت پُرتشدد دور میں، تاریخ، ہلاکت گریز صلاحیتوں میں نمایاں اضافے کو پیش کرتی ہے۔ عالمی طور پر اگر ہلاکت گریز مظاہر کا میزان لگایا جائے تو نوع انسان کی ہلاکت گریز تاریخ تخلیق ہوسکتی ہے۔اس کے تشکیلی عناصر کی چند جھلکیاں اب دیکھی جاسکتی ہیں۔

ہلاکت گریز عقیدے اور عہد و پیمان کو کچلا نہیں جاسکتا۔ دو ہزار برسوں پر محیط یہود و نصاریٰ کی تاریخ، چھٹا فرمان ربانی ''قتل مت کرو'' (خروج 20:13)، خطبۂ جبل (متی

5-7)، اور صلیب پر حضرت عیسیٰ کی مثال جو کہ سینہ بہ سینہ یا تحریری روایت میں محفوظ ہے، یہ معاملات ہلاکت آفرینی کے خلاف ہلاکت گریز عناصر کی جرأت مند مزاحمت کو جاری رکھیں گی، خواہ اس راہ میں کتنی ہی سزاؤں اور شہادتوں سے عقوبت اور شہادت کے باوجود__ ان پڑھ کسانوں یا مراعات یافتہ اشرافیہ کے لوگوں کو گزرنا پڑے (بروک 1968, 1970, 1972, 1990, 1991a, 1991b, 1992)۔ ٹالسٹائی کی مدد سے روس میں تین مقامات پر 7 ہزار امن پسند دوخوبور کسانوں کی طرف سے 29 جون 1895ء کو ''اسلحے کو نذرِ آتش کرنے'' کی مذہبی تقریب ہوئی، جس کے بعد 7,500 دوخوبور بھیانک سزاؤں سے گزرے اور 1899ء میں کینیڈا جلاوطن کیے گئے (ٹراسوف 1995:9-8)۔ دوسری ثقافتوں میں بھی ہلاکت گریز صلاحیتوں کی تاریخی بنیادیں دریافت کی جاسکتی ہیں؛ مثال کے طور پر بدھ مت میں (ہورگین 1996؛ پیگ گلیاٹ 1991)؛ اسلام میں (بنرجی 2000ء؛ کرو 1990ء؛ ایسورن 1999ء؛ کشتینی 1990ء؛ پیگ، ستیہ آنند، اور گلیاٹ 1993aء؛ ستیہ آنند 1990ء؛ طیب اللہ 1959)؛ اور یہودیت میں (شوارز چائلڈ، n.d؛ پولنر اور گڈمین 1994؛ وِل کاک 1994ء)۔

مزید براں، جیسا کہ موسکو اور چیمبرس (1993ء) جدید جمہوریتوں میں فوجی خدمت پر اصولی اعتراض کی ایک تقابلی تاریخ میں اظہار کر چکے ہیں کہ قتل کرنے سے انکار کا غیر فرقہ وارانہ، انسان دوست، اور سیاسی رواج زور پکڑ رہا ہے۔ ہلاکت گریزی کو سیکولر بنیادوں پر استوار کرنے کا عمل جاری ہے۔ روحانی اور سیکولر خیالات کے افراد، اصولی اور عقلی بنیادوں

پر، قتل کرنے سے انکار میں یک آواز ہو رہے ہیں۔

یہ تاریخی مشاہدہ بھی سامنے آیا ہے کہ تشدد کے حامی بعض سیاسی رہنماؤں نے حیرت انگیز طور پر نیک نیتی سے اور بعض حالات میں جان پر کھیل کر ہلاکت گریز فلسفے سے اپنی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ اس کی ایک مثال پروشیا کے بادشاہ فریڈرک اول کا وہ فیصلہ ہے جس کے تحت 1713ء میں امن پسند مینونائٹ فرقے کو جبری بھرتی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا۔ اسی طرح روس میں مینونائٹ فرقے کو کیتھرین دوم (1763ء) اور الیگزینڈ دوم (1875ء) نے جبری بھرتی سے مستثنیٰ قرار دے دیا تھا، (بروک 436, 234, 230: 1972ء)۔ ٹالسٹائی کے رفیق وی جی چرتکوف کی درخواست، اور بالشیوک وی سی بونک بروک کے مشورے پر، ٹالسٹائی کے پیروکاروں اور دیگر امن پسند مذہبی برادریوں کو 1919ء میں لینن نے سرخ فوج کی خدمات سے مستثنیٰ کر دیا تھا (جوزفین 162:1985ء؛ کوپیٹرز اور زویریف 1995ء)۔ فوج میں سزائے موت کا خاتمہ بالشیویک کے اولین فیصلوں میں سے ایک تھا۔ ایسے فیصلوں کے کم مدت تک برقرار رہنے کی بنیاد پر، ہلاکت گریزی کی دریافت کے احکانات کو ختم نہیں کرتی۔ کیونکہ جس طرح جیروم ڈی فرینک کا مشاہدہ ہے کہ عوام اپنے حکمرانوں کے احکامات کی اطاعت کرتے ہیں، اسی لیے اگر سیاسی رہنماوں کے رویے بدلے جاسکیں تو امن کو مستحکم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قائدین تو رہنمائی کر رہے ہوں لیکن ان کے حمایتی سست پڑ جائیں۔ مغربی جمہوریتوں میں سزائے موت کے خاتمے کی ایک تحقیق میں زمرنگ اور ہاکنس نشاندہی کرتے ہیں:

جمہوری ملکوں میں سزائے موت کا خاتمہ شدید عوامی مخالفت کے دوران ہوا ہے۔ امریکہ کے علاوہ ہر مغربی جمہوریت سزائے موت ختم کر چکی ہے، لیکن ہم کسی ایسے ملک کے بارے میں نہیں جانتے جہاں سزائے موت پر پابندی کے لیے جمہوری اتفاقِ رائے پایا گیا ہو، تاہم یہ پابندیاں عائید ہوئی ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کے خلاف عوامی خفگی طویل عرصہ برقرار رہتی ہے (1986ء:XVI)۔

بہرحال، ہلاکت گریز سماجی تبدیلی کے لیے سیاسی قیادت کی اہمیت کی طرف اشارہ کرنے کا مطلب (پیگ 1977ء؛ برنس 1978ء) عدم تشدد کی حمایت کرنے والی عوامی قوت کی بڑھتی ہوئی طاقت سے صرفِ نظر کرنا نہیں ہے۔ ایک تیسرا تاریخی مشاہدہ ہے کہ ہلاکت گریزی سے وابستہ ہونے والے اس کے ساتھ ہی دیگر نوع کی تکالیف میں کمی اور سماج میں زندگی کا احترام کرنے والی تبدیلیاں لانے کی کوششیں بھی کرتے ہیں۔ ہلاکت گریزی کا مطلب نہ عدم توجہی ہوتی ہے اور نہ بے عملی۔ مثال کے طور پر، جین مت کا اہنسا کا فلسفہ جانوروں، پرندوں اور دیگر نوع کی حیات بچانے کی کوشش کرتا ہے (ٹوبیاس 1991ء)۔ ہلاکت گریزی کی کوشش کس طرح نمایاں ساختیاتی تبدیلیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی جھلک ہندوستان میں گاندھی کی تحریک میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس تحریک کی نظر نہ صرف سیاسی آزادی پر بلکہ نمایاں معاشی، سماجی، اور ثقافتی تبدیلیوں پر تھی جو غریبوں، عورتوں، اقلیتوں، ذات پات، اور باہمی تعلقات پر اثر انداز ہوسکیں۔ اسی طرح امریکہ میں عدم تشدد پر مبنی کنگ کی تحریک آزادی اور نسلی مساوات کی جستجو میں غربت سے جنگ کے ساتھ ساتھ امریکی سماج کی ساخت اور کارکردگی میں انصاف کو درپیش رکاوٹیں دور کرنے کی

کوششوں میں مصروف ہوگئی تھی۔

جدید متشدد قومی ریاستوں کی تاریخ میں بھی ہلاکت گریز غیر مہلک صلاحیتوں کے شواہد دیکھے جاسکتے ہیں۔اس کی ایک مثال امریکہ پیش کرتا ہے۔ بالادست متشدد رواج کے ساتھ موازنے میں، سیاسیات کے طالب علم امریکی تجربے میں ہلاکت گریز بنیادوں سے قابلِ فہم طور پر بڑی حد تک ناواقف ہیں۔تاہم اولین تحقیقات ان کی صریحی موجودگی آشکار کرتی ہیں (بروک 1968ء؛ کونی اور مائیکلووسکی 1987ء؛ ہاکلے اور جوہنک 1993ء؛ کپور 1992ء؛ کوہن 1987ء؛ لینڈ اینڈ لینڈ 1995ء؛ ایسوسی ایشن آف امریکن ہسٹوریئنس 1994ء؛ شلی سیل 1968ء؛ ٹرو 1995ء؛ زِن 1990ء)۔

امریکہ میں ہلاکت گریزی

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی تخلیق کے وقت ہلاکت گریزی موجود تھی۔اس کا آغاز مقامی لوگوں اور امن پسند تارکینِ وطن کے درمیان پُرامن تعلقات میں ہوا۔ستر برس کے بیشتر عرصے میں (1756ء ۔ 1682ء) پنسلوانیا کی ملیشیا سے پاک کالونی میں صلح جو Quakers اور ڈیلاویر کے انڈین پُرامن طور پر مل جل کر رہے، ان دونوں کے دروازے ایک دوسرے سے دوستانہ ملاقاتوں کے لیے کھلے رہے اور کسی نوعیت کی شرانگیز افواہ کے بارے میں باہمی صلاح مشورہ کرنے کے لیے وہ عہد نامے کی شرائط پر عمل کرتے رہے۔

(بروک 91-1990:89ء)۔ امریکی انقلاب سے پہلے کی 13 کالونیوں میں سے 12 کالونیوں کے قوانین میں فوجی ملازمت میں ہلاکت پر اصولی مذہبی اعتراض کے لیے قانونی استثنا موجود تھا۔ انتہائی روشن خیال، رہوڈ آئی لینڈ (1673ء) نے ان لوگوں کو جن کے عقائد انہیں ''فوجی تربیت حاصل کرنے، مسلح ہونے، لڑنے کے لیے جمع ہونے، ہلاک کرنے'' سے روکتے تھے ان ذمہ داریوں سے سبکدوش کرتے ہوئے یہ حکم بھی دیا کہ معترضین کو ''کسی سزا، جرمانہ، جائیداد کی ضبطی، تعزیر یا قید کا سامنا'' نہیں ہونا چاہیے (کوہن 1987:8ء)۔

امریکی قوم کی تشکیل کے دنوں میں دستور ساز مباحثوں میں ہلاکت گریزی موجود تھی۔ 1775ء میں کانٹی نینٹل کانگریس کے منظور کردہ پہلے قوانین میں سے ایک عہد، ہلاکت گریزی کو مذہبی اصول ماننے والوں کے لیے ''عدم تشدد'' کا تسلیم کیا جانا تھا (کوہن 1987:10,13ء)۔ 1789ء میں امریکی دستور میں حقوق کا بل شامل کرنے والی دستور ساز بحثوں میں، نمائندے جیمس میڈیسن نے آرٹیکل 2 میں ایک شق تجویز کی جس کے تحت قتل سے انکار کرنے کا ہر شہری کا حق تسلیم کیا جانا تھا: ''ہتھیار رکھنے پر مذہبی پابندی پر کاربند کوئی شخص ذاتی طور پر فوجی خدمت انجام دینے پر مجبور نہیں کیا جائے گا'' (کوہن 1987:11ء)۔ ایوان نمائندگان نے میڈیسن کی تجویز منظور کر لی لیکن ریاستوں کے حقوق کا دفاع کرنے والی سینٹ کانفرنس کمیٹی نے اسے اس لیے مسترد کر دیا کہ اس طرح ریاستی ملیشیا پر وفاقی اختیارات میں اضافہ ہو جائے گا۔

امریکی انقلاب میں (83-1775ء)، مختلف نسلوں اور مذہبی عقائد رکھنے والے دونوں طرف کے آبادکاروں نے قتل کرنے سے انکار کردیا۔ خوش الحانی سے بائبل پڑھنے والے ایک برطانوی سپاہی، تھومس واٹسن نے قتل کرنے سے انکار کردیا، اور بعدازاں وہ میسا چوسٹس کا ایک کوئکر پادری بن گیا (بروک 81-280:1968ء)۔ برطانوی ناکہ بندی اور بعد میں بوسٹن کے امریکی محاصرے کے دوران (76-1774ء)، صلح جو کوئکروں نے مدِمقابل جنرلوں واشنگٹن اور ہوو دونوں کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ انہیں وہاں کے شہریوں اور پناہ گزینوں میں امداد تقسیم کرنے کی اجازت دی جائے۔ (بروک 94-193:1968ء)۔ بعدازاں خرابیٔ بسیار، اس ہلاکت گریز اصول کو تعاون اور احترام نصیب ہوا۔

یہ بات ناقابلِ تصور نہ تھی کہ غیرمتشدد جدوجہد کے ذریعے آزادی حاصل کی جاسکتی تھی (کونسر، et al 1986ء)۔ ایولز آف دی ریوولوشینری وار (1839ء) میں چارلس کے وھپل کی تحریر کے مطابق: ''اگر ہم نے اسلحے کا سہارا نہ لیا ہوتا تو ہم اسی طرح موثر طور پر، اتنی ہی تیزی سے، ایسے ہی باعزت طریقے سے اور بہت ہی زیادہ موافق شرائط کے تحت آزادی سے ہم کنار ہوسکتے تھے۔'' ضابطۂ کار یہ ہونا چاہیے تھا: ''اول، نامنصفانہ مطالبات ماننے سے سختی اور خاموشی سے انکار؛ دوم، لوگوں کی شکایات کا اعلانیہ اظہار، اور انہیں دور کرنے کے مطالبات؛ اور سوم، انہیں اطاعت پر مجبور کرنے کے لیے کیے جانے والے تشدد کو پامردی سے جھیلنا'' (2)۔ غیرمتشدد جدوجہد کے محرکات کا وھپل کا تجزیہ گاندھی اور جین شارپ کی اس

کے بعد والی سوچ میں موجود حقیقتاً ہر بنیادی عنصر کی پیش قیاسی کرتا ہے (1973ء)۔ غیر متشدد انقلاب کے فوائد شمار کرتے ہوئے، وھپل نے تخمینہ لگایا کہ اس طرح کم زندگیوں کا نقصان ہوتا (شاید ایک ہزار قائدین اور 10 ہزار مرد، خواتین اور بچے ہلاک ہوتے، اس کی بجائے اس آٹھ سالہ مسلح جدوجہد میں ایک لاکھ افراد ہلاک ہوئے؛ جنگ کے معاشی مصارف (135 ملین ڈالر) اس کے علاوہ عسکریت پر ہونے والے اخراجات (300 ملین ڈالر) سے بچا جا سکتا تھا؛ اور نئی قوم کی روحانی اور اخلاقی بنیاد بہت بلند سطح پر قائم کی جا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ عدم تشدد کو ماننے والے امریکی انقلابیوں نے غلامی کے ادارے کو جاری نہ رکھا ہوتا اور ''اس ملک کے اصل باشندوں کو ٹھگنے، گمراہ کرنے اور ان کو نیست و نابود کرنے میں نہ لگ گئے ہوتے''، اور بشمول سزائے موت ''تشدد اور انتقام کے نظام کو اپنی حکومت میں آئینی طور پر منظور نہ کیا ہوتا'' (10)

خانہ جنگی سے پہلے ہلاکت گریزی موجود تھی۔ مصائب برداشت کرتے ہوئے اور قربانیاں دیتے ہوئے، وطن پرستوں نے برطانیہ (1812ء) اور میکسیکو (1845ء) کے خلاف جنگ میں امن کی خاطر، خواتین کے حقوق اور خاص طور پر غلامی کے خاتمے کے لیے کام کیا۔ ان کے درمیان خواتین اور مرد، سیاہ فام اور سفید فام، مذہبی اور سیکولر سب موجود تھے (کونی اور مائیکلوفسکی 23-1987:20ء؛ لینڈ اینڈ لینڈ 41-1995:13ء)۔ تشدد سے پاک انسدایت کے حامیوں کی کوششیں شمالی مجالسِ قانون ساز میں غلامی سے نجات کے قوانین منظور کرانے میں کامیاب ہوگئیں۔ سرحدی علاقوں اور جنوبی ریاستوں میں، کونکر جان

وولمین (72-1720ء) نے مسلسل کوششوں سے روحانی یا معاشی وجوہ کی بنا پر بعض مالکان کو اپنے غلام آزاد کرنے پر آمادہ کرلیا۔ غلامی سے ہلاکت گریز نجات ناقابلِ تصور نہیں تھی۔ برطانیہ نے داخلی طور پر 1777ء میں غلامی، 1807ء میں غلاموں کی تجارت اور 1833ء میں پوری برطانوی سلطنت میں غلام رکھنے کا خاتمہ کردیا تھا، ریاست ہائے متحدہ میں بھی اس کا پُرامن طور پر خاتمہ کیا جاسکتا تھا اگر اس نے بھی کینیڈا کی طرح اپنے مادری ملک کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں رشتہ برقرار رکھا ہوتا۔

خانہ جنگی کے دوران (65-1861ء)، جنگ کی مزاحمت کرنے والوں کے ساتھ جسمانی اذیت، قید، سزائے موت اور پوشیدہ طور پر قتل سمیت ناجائز سلوک کیے جانے کے بعد، وفاقی حکومت (1862ء) اور ریاستوں (1864ء) کے مجوزہ آئین میں قتل پر اصولی اعتراض کی شقیں شامل کی گئی تھیں۔ حالانکہ بعض اوقات نچلی سطح پر ان قوانین کا متناقص طور پر اور کنبہ پروری کے ساتھ نفاذ کیا گیا، اس کے باوجود انفرادی طور پر استثنا کی اپیلیں یونین کے صدر ابراہم لنکن، سکریٹری آف وار ایڈون اسٹین ٹن، کنفیڈریٹ اسسٹنٹ سکریٹری آف وار جان اے کیمپبل نے ہمدردی کے ساتھ وصول کیں (موسکوس اور چیمبرس 1-3:1993ء)۔ جنگ کے مدوجزر میں پھنسے ہوئے عیسیٰ کے ٹینسی فرقے کے عدم تشدد پر کاربند پیروکار پہلے کنفیڈریٹ صدر جیفرسن ڈیوس اور پھر قابض یونین ملٹری گورنر اینڈریو جانسن کے سامنے یہ عرض داشت پیش کرنے میں کامیاب ہوئے کہ انہیں جبری بھرتی سے مستثنیٰ رکھا جائے (بروک 3-842:1968ء)۔ خانہ جنگی کی برادرکش خونریزی کے درمیان، ہلاکت گریز

اصول پر دونوں جانب سے اصرار کیا گیا اور مختلف مرحلوں پر فریقین نے اسے تسلیم کیا۔

صنعت کاری اور سامراجی توسیع کے دور میں اور اس کے بعد بیسویں صدی کی تین عالمی جنگوں میں بھی ہلاکت گریزی اپنا وجود رکھتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مالکان، پولیس، حکومت اور بعض اوقات مزدور تشدد کے باوجود، امریکی مزدوروں کو منظّم کرنے اور ان کے کام کی شرائط میں بہتری لانے کی جدوجہد لازمی طور پر غیر متشدد تھی۔ یہ مسلح مزدور طبقے کا انقلاب نہیں تھا۔ اسی طرح مساوی حقوق کے لیے خواتین کی تحریک بھی غیر متشدد تھی جس کی بناء پر ریپبلکن نمائندہ جینٹ رینکن، 1916ء میں مونٹانا سے منتخب ہوکر کانگریس کی پہلی خاتون ہوئی (جوزف سن 1974ء)۔ 1917ء میں 49 مرد ہم منصبوں اور 6 سینیٹروں کے ساتھ اس نے پہلی جنگ عظیم میں امریکہ کی شمولیت کی مخالفت میں ووٹ دیا۔ 1940ء میں دوبارہ منتخب ہونے کے بعد جینیٹ نے تن تنہا دوسری جنگ عظیم میں امریکی شمولیت کے خلاف ووٹ دیا۔ بعدازاں، 88 برس کی عمر میں اس نے جنگ ویتنام میں امریکی ہلاکت خیزی کے خاتمے کے لیے واشنگٹن میں ہونے والے ایک مظاہرے میں جینٹ رینگن بریگیڈ کی 5 ہزار خواتین کی قیادت کی۔

پہلی عالمی جنگ میں جبری طور پر بھرتی کیے جانے والے کم ازکم 4 ہزار امریکی مردوں نے قتل کرنے سے انکار کیا۔ تیرہ سو نے غیر حربی عموماً طبی؛ فوجی خدمات قبول کیں، دیگر پندرہ سو کو زرعی مزوری سونپی گئی؛ 940 کو علیحدہ فوجی تربیتی یونٹوں میں رکھا گیا؛ اور کسی بھی طریقے سے ہلاک کرنے سے حتمی اور مطلق کرنے پر 450 کا کورٹ مارشل کیا گیا اور وہ فوجی قید

خانوں میں ڈال دیے گئے۔ جہاں سختیوں اور بیماریوں سے 17 کی موت واقع ہوگئی (موسکوس اور چیمبرس 5-34:1993؛ کوہن 42:1987؛ لینڈ اینڈ لینڈ 117-91:1995ء؛شلیسیل 175-128:1968ء)۔

دوسری عالمی جنگ کی جبری فوجی بھرتی کے عرصے میں (47-1940ء)، 72,354 مردوں نے قتل کرنے پر اصولی اعتراض کا عذر کیا؛ 25 ہزار نے غیر متحارب حیثیت میں خدمات انجام دیں؛ 213 مذہبی مسالک سے 11,996 مرد 151 سویلین پبلک سروس کیمپوں میں کام کرنے پر راضی ہوئے (ضمیمہ ڈی)؛ اور 6086 مرد جنہوں نے ہر نوع کے حربی تعاون سے انکار کر دیا تھا، جیل میں ڈال دیے گئے۔ تین چوتھائی قید افراد یہوواہ شاہدین فرقے سے تعلق رکھتے تھے (اینڈرسن 2-1:1994ء؛ موسکوس اور چیمبرس 8-37:1993ء؛ کونی اور میخالوفسکی 5-94:1987ء؛ گارا اور گارا 1999ء)۔

امریکی سماج میں ہلاکت گریز امکان جوہری عہد کی ''سرد جنگ'' (91-1945ء) کے دوران ایک بار پھر ظاہر ہوا جب دوسری عالمی جنگ، خانہ جنگی اور پہلی عالمی جنگ اور __ ویتنام (75-1964ء) اور کوریا (53-1950ء) میں __ امریکی تاریخ کی انتہائی خونیں چوتھی اور پانچویں جنگوں کے بعد ہلاک شدگان اور زخم خوردہ افراد کو واپس لایا گیا۔ ریاست ہائے متحدہ، سوویت یونین اور ان کے اتحادیوں کے درمیان ہونے والی سرد جنگ کے دوران تقریباً دو کروڑ افراد عالمی طور پر قربان کیے گئے۔ یہ سب انقلاب، ردِ انقلاب اور جغرافیائی سیاست کی ریاستی ہلاکت خیزی کا شکار ہوئے۔ جنگ کوریا میں تقریباً 22,500

جبری طور سے بھرتی کیے جانے والے امریکیوں نے قتل کرنے سے انکار کیا۔ جنگ ویتنام کے خلاف متاثر کن مزاحمت ہوئی اور قتل کرنے سے انکار کرنے والے مردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان میں سے بیشتر نے سیکولر بنیادوں پر قتل کرنے سے انکار کیا (موسکوس اور چیمبرس 43-39:1993ء)۔ 1972ء میں جبری بھرتی کیے جانے والوں کے مقابلے میں اعتراض داخل کرنے والوں کو زیادہ تعداد میں اصولی معترض کا درجہ دیا گیا۔ جنگ ویتنام کے خلاف مزاحمت کرنے والوں نے اندراج سے گریز کیا، جیل گئے، یا جلاوطنی اختیار کر لی، ان لوگوں نے امریکہ کی جانب امن پسند تارکین وطن کے تاریخی بہاؤ کا رخ پلٹ دیا جو اپنے وطن میں جبری بھرتی سے نجات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ویتنام میں قتل عام کے دوران ہلاکتوں پر اصولی معترضین جنہوں نے محاذ جنگ کے اگلے مورچوں پر طبی خدمات جیسے غیر قاتلانہ شعبے میں خدمات انجام دینے پر رضامندی ظاہر کی تھی وہ جنگ کو مسترد کرنے میں زیادہ پُرعزم ہو گئے (جیوگلیو 1989ء)۔

سرد جنگ کے دھندلکے میں عراق کے خلاف خلیجی جنگ (1991ء) کے دوران ہلاکت گریز مسلک ایک بار پھر نمایاں ہو کر ابھرا۔ اس دفعہ شہریوں کی جانب سے جنگ میں شرکت کی مزاحمت کا معاملہ نہیں تھا کیونکہ جبری بھرتی لاگو نہیں ہوئی تھی، بلکہ یہ معاملہ فوجی خدمات سرانجام دینے والے اور ریزروفوجیوں کا تھا جنہوں نے قتل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اصولی اعتراض کرنے والے پچاس بحری فوجیوں کا کورٹ مارشل کیا گیا اور وہ جیل میں ڈال دیے گئے (موسکوس اور چیمبرس 44:1993ء)۔

امریکی تاریخ میں ہلاکت گریزی کی صلاحیت سزائے موت کے خاتمے کی کوششوں سے ثابت ہے۔ مشی گن کے علاقے میں (1846ء) نوآبادیاتی دور میں وطن سے غداری کو چھوڑ کر سزائے موت کے خاتمے کی مہم اس کے متقاضی جرائم میں کمی کے ساتھ شروع ہوئی اور رہوڈ آئی لینڈ (1852ء) اور وسکونسن (1853ء) میں سزائے موت کے مکمل خاتمے پر منتج ہوئی، اس وقت پچاس میں سے بارہ ریاستیں بشمول ضلع کولمبیا مظہر ہیں کہ یہاں رہنے والے امریکی سماجی زندگی میں بحیثیت مجموعی نیز انفرادی طور پر جنگ میں انسانی جان لینے سے انکار کر سکتے ہیں۔ تاہم، وفاقی سطح پر ابھی سپریم کورٹ کو اس بات کا حتمی فیصلہ کرنا ہے کہ شہریوں کو سزائے موت دینے سے امریکی آئین کی خلاف ورزی ہوتی ہے (زمرنگ اور ہاکنس 1986ء)۔

امریکہ میں ہلاکت گریزی کے امکان کی دیگر بنیادیں ہیں: ان میں سے ایک جوہری اسلحے سے پاک سماج کی جدوجہد (سورڈز اِن ٹو پلوشیئرز موومنٹ)، مفلسی کے عسکری تشدد سے پاک سماج کے لیے جدوجہد (کیتھولک ورکر موومنٹ)، خواتین کے خلاف تشدد کے مردانہ تسلط کی ثقافت کے خاتمے کے لیے جدوجہد (ویمنز موومنٹ)، اور ایک آزاد اور انصاف پسند سماج میں افریقی نژاد امریکیوں اور تمام نسلوں کے مساوی ہونے کو تسلیم کرنے کے لیے جدوجہد (غیر متشدد سماجی تبدیلی کے لیے کنگ نواز تحریک)۔ 1936ء میں افریقی امریکیوں سے ملاقات کے دوران، گاندھی کو بتایا گیا کہ ان کے عدم تشدد کے پیغام کی زوردار بازگشت ''نیگرو روحانی گیتوں'' میں سنی جا رہی ہے اور یہ کہ افریقن امریکی اسے قبول کرنے

پر آمادہ ہیں۔ گاندھی نے جواب میں کہا ''یہ سیاہ فاموں کے ذریعے ہی ممکن ہوسکتا ہے کہ عدم تشدد کا خالص پیغام دنیا تک پہنچایا جائے'' (کیور 90-89:1992ء)۔ اس طرح گاندھی نواز، کنگ نواز، اور عدم تشدد پر مبنی دنیا کی دیگر تحریکوں کے درمیان ہم آہنگیوں اور امریکہ کی مقامی اور تارکین وطن کی صلح جو بنیادوں کے سبب __ امریکہ میں عدم تشدد کی روایت دنیا کی ہلاکت گریز تاریخ سے لاینحل طور پر جڑی ہوئی ہے۔

تشدد آمیز تہوار منانے کے سیاسی رواج کے غلبے کے باوجود، نوآبادیاتی دور سے اب تک احترامِ زندگی پر مبنی ضابطۂ اخلاق کے کچلے نہ جاسکنے والے رویے میں ہلاکت گریز امریکی سماج کی بنیادیں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ اس دعوے کے شواہد جنگ میں ہلاک کرنے سے انکار؛ سزائے موت کی مخالفت؛ اسقاطِ حمل پر اعتراض؛ تخفیف اسلحہ کے مطالبات؛ عسکر سازی اور عالمی قوت کے پُرتشدد اظہار کے خلاف مزاحمت؛ معاشیات، نسلی تعلقات، خواتین کے حقوق، اور ثقافتی شناخت میں ساختیاتی تبدیلی کے لیے غیر متشدد اقدامات؛ اور مذہبی، فنکارانہ، اور ادبی اسلوب بیان میں دیکھے جاسکتے ہیں (ٹرو 1995ء)۔ غیر متشدد وطن پرستی یا ''غیر متشدد قوم پرستی'' بن سکنے والے تاریخی عناصر کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، اس کی ایک مثال ویلش صلح جو سیاسی پارٹی Plaid Cymru کے بانی، گونفور ایوانز کے ویلز کے لیے دیے جانے والے فصیح دلائل ہیں (ایوانز 1972ء)۔ اس کا قومی نغمہ ''دل ربا امریکہ''، اس کا پیش قدمی کا گیت ''ہم فتح مند ہوں گے''، اور اس کی مناجات ''خدا غیر متشدد امریکہ کی اور دنیا میں عدم تشدد کی حفاظت کرے'' ہونا چاہیے۔

ہلاکت گریز زندگیاں

ہلاکت گریز سماج کی جڑیں بنیادی طور پر بنی نوع انسان کی سرگزشت میں موجود ہیں۔ سماجی تبدیلی کی مثبت جستجو کے ساتھ جان نہ لینے کے عہد سے وابستہ گذشتہ اور آج موجود مرد اور خواتین، تنہا یا اجتماعی طور پر، مشہور یا گم نام، ہلاکت گریز سماج کے امکانات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جو کام کچھ لوگ کر سکتے ہیں، وہی دوسرے بھی کر سکتے ہیں۔

میوسی ڈی آرٹ ماڈرن ڈی لاول ڈی پیرس کے داخلی دروازے پر راول ڈونے کی بنائی ہوئی ایک عظیم دائرہ نما دیواری تصویر ہے جس میں قدیم فلسفیوں سے لے کر جدید سائنس دانوں اور موجدوں کی شبیہیں ہیں، جنہوں نے بجلی کی دریافت اور استعمال میں حصہ لیا۔ اسی طور پر ہم ہلاکت گریز سیاسیات سے وابستہ علماء اور محققین کے ایک بہت بڑے سلسلے کا تصور کر سکتے ہیں جنہوں نے عدم تشدد کی روح، نظریے اور عمل کے لیے کام کیا۔ بائیوگرافیکل ڈکشنری آف ماڈرن پیس لیڈرز میں اس عالمی میراث کی ایک جھلک دیکھی جاسکتی ہے (جوزف سن 1985ء) اس کتاب میں 39 ممالک کے ان 717 افراد کی زندگیوں کا احاطہ کیا گیا ہے جو 1800ء سے 1980ء کے عرصے تک عدم تشدد کی تحریک سے وابستہ رہے۔ شروع سے آخر تک اس کے 1,134 صفحات کا مطالعہ کریں تو اس میں ہلاکت گریز دنیا کی جستجو کے حوالے سے لبرل فنون کی تعلیم میں ایسے پیشوں اور طریقہ کار کا تذکرہ موجود ہے۔ اقدار کا دائرہ تشدد کو عارضی طور پر قبول کر لینے سے لے کر ہلاکت گریز اصولوں سے مکمل

وابستگی تک پھیلا ہوا ہے۔ تاریخی، جغرافیائی، ثقافتی طور پر، اور ہم عصر زندگی میں اس نوع کی تحقیقات کی توسیع ہلاکت گریز جرأت اور اس سے پیمانِ وفا کی عالمی میراث کو سامنے لاتی ہے اور دوسروں میں بھی اس بات کی تحریک پیدا کرتی ہے کہ ہلاکت گریز زندگی کی دریافت اور ان کا حصہ بننا ایک عالمی ضرورت ہے۔

ہلاکت گریزی کے فلسفلے سے جڑی ہوئی زندگیاں ثقافتوں اور زماں و مکاں کی حد بندیوں سے آزاد ہوکر ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی اور بازگشت پیدا کرتی ہیں۔ ایسی مثالیں قدیم حکمرانوں نے بھی قائم کی ہیں: نوبیا میں پیدا ہونے والے مصری فرعون شابکا (c.760-c.695B.C) سزائے موت کا خاتمہ کردیتا ہے (بینٹ 1988:11ء)۔ ہندوستان میں، بدھ مت کا پیروکار حکمران اشوک کالنگا کی فتح کے ساتھ ہی جنگ اور جانداروں کی ہلاکت سے دست برادری اختیار کرلیتا ہے (c.262 B.C) کالنگا کی جنگ میں ایک لاکھ افراد ہلاک، ڈیڑھ لاکھ جلاوطن، اور بے شمار بے گناہ ہلاک اور مصیبتوں میں گرفتار ہوئے تھے (چودھری 1997:52ء)۔ ہلاکت گریز روحانی پیشواؤں کی مثالیں نسل درنسل تخلیقی رشک پیدا کرتی ہیں: مہاتما بدھ، مہاویر، حضرت عیسیٰ، حضرت محمدؐ، جارج فاکس، گرونانک، بہاءاللہ اور ان ہی جیسے دوسرے افراد جب ہلاکت خیزی سے ہلاکت گریزی کی راہ اپناتے ہیں تو، ان میں سیکولر اور روحانی بنیادوں پر، ڈرامائی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ فوجی امن پسند بن جاتے ہیں (کروزیر 1938ء؛ ٹنڈولکر 1967ء؛ خان 1997ء؛ بوبالٹ، گوچارڈ، اور مولر 1986ء؛ روزیل 1997ء)۔ انقلابی ہلاکت خیزی ترک کردیتے ہیں

(نارائن 1975ء؛ بیندنا 1998ء)۔ اصول پرست افراد جبری فوجی بھرتی کی مزاحمت کرتے ہیں (موسکوس اور چیمبرس 1993ء)۔ نیوزی لینڈ کا آرچی بالڈ بیکسٹر حیران کن جرأت کے ساتھ ہلاکت گریزی پر اصرار کرتا ہے اور پہلی عالمی جنگ میں جبری بھرتی کی مزاحمت کرتا ہے اور اذیتیں برداشت کرتا ہے (بیکسٹر 2000ء)۔ بائبل کا حافظ آسٹریائی کسان، فرانز جیگر سٹیٹر، ہٹلر کے لیے لڑنے سے انکار کرنے پر سرقلم کروالیتا ہے (زاہن 1964ء)۔ یہودیوں کو ہٹلر کے قتل عام سے بچانے کے لیے ہلاکت گریزی سے وابستہ افراد اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں (فوگل مین 1994ء؛ ہیلی 1979ء)۔ بہت سے افراد برسرجنگ جدید فوجی صنعتی ریاستوں کے لیے اخلاقی، مادی، اور تعاون اور ایسی ریاستوں کے لیے کام کرنا بند کردیتے ہیں (ایوریٹ 1989ء)۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کو ناکارہ بنانے کی براہ راست کوشش کرتے ہیں (نارمن 1989ء؛ پولنر اور اوگریڈی 1997ء)۔

لاکھوں گمنام افراد پانچ فٹ چار انچ کے چھوٹے قد والے، موہن داس کرم چند گاندھی کی غیر متشدد قیادت کی پیروی کرتے ہیں۔ ثقافتی طور پر تشدد پسند پٹھان، عبدالغفار خان کی غیر متشدد مسلم قیادت کی پیروی کرتے ہیں (بنیر جی 2000ء؛ ایشورن 1999ء)۔ گاندھی نواز معلم، ڈاکٹر جی راما چندرن نے اس بات کی نشاندہی کی ہے، ''عدم تشدد کے غیر معروف ہیرو اور ہیروئنیں معروف لوگوں کے مقابلے میں زیادہ اہم ہیں'' (راما چندرن 1983ء)۔ امریکہ میں گاندھی نواز اصولوں پر تربیت یافتہ، کالج کے طلبا کے ایک چھوٹے

سے امریکی افریقی گروپ نے شہری حقوق کی تحریک کا آغاز کیا جس کے نتیجے میں ریورینڈ ڈاکٹر مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کی قیادت سامنے آئی (ہالبراسٹام 1998ء)۔عدم تشدد پر عمل پیرا اینڈن بلاؤ اور ہنری ڈیوڈ تھوریو جیسے امریکی، ٹالسٹائی پر اثر انداز ہوتے ہیں (کرسچین 1978:588ء)؛ ٹالسٹائی گاندھی کو متاثر کرتا ہے؛ گاندھی کنگ پر اثر ڈالتے ہیں؛ یہ تمام لوگ جرمن گرین پارٹی کے سربراہ پیٹرا کیلی (کیلی 1989ء) کو اور عالمی سطح پر دوسرے بہت سے لوگوں کو متاثر کرتے ہیں۔اردن کے دارالحکومت عمان میں یونائیٹڈ نیشنز یونیورسٹی کی انٹرنیشنل لیڈرشپ اکیڈمی کے پہلے دو تربیتی پروگراموں میں ساٹھ سے زیادہ ملکوں نے شرکت کی، جن کے دوسو سے زیادہ نوجوان رہنماؤں نے 1997ء اور 1998ء میں گاندھی کو دنیا کے پسندیدہ ترین رہنما کا درجہ دیا۔ان کی اس پسندیدگی میں عالمی نوآبادیاتی نظام کے انہدام کے بعد آنے والے تحریکِ آزادی کے بہت سے رہنماؤں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

عدم تشدد کا پرچار کرنے والے رہنما دنیا بھر میں تواتر کے ساتھ ابھر رہے ہیں: ان میں کمبوڈیا کے مہا گھوسانندا، کوریا کے ہیم سوک ہان، نائیجیریا کے کین سارو۔ویوا، سری لنکا کے اے ٹی آریارتنا، تھائی لینڈ کے سولاک سوارسکا، فرانس کے لانڈوڈیل واسٹو اور جنرل جیکس ڈی بولارڈیئر، برطانیہ کے رونالڈ میلوں، اٹلی کے آلڈو کپی تینی، ہندوستان کے این رادھا کرشن، برازیل کے ڈوم ہیلڈر کمارا، امریکہ کے اے جے مسٹی شامل ہیں۔یہ درست ہے کہ نوبل پیس پرائز دینے والوں نے گاندھی سے تاریخی غفلت برتی، لیکن اب نوبل پیس پرائز کی

جانب سے عدم تشدد سے نمایاں وابستگی رکھنے والے رہنماؤں کو تسلیم کیا جا رہا ہے: اس کے نتیجے میں جنوبی افریقہ کے البرٹ جے لتھولی اور ڈیسمنڈ ٹوٹو، شمالی آئرلینڈ کے میریڈ کوریگن میگوائر، ارجنٹائن کے ایڈلفو پیریز السکیویل، برما کی آنگ سان سوکی، تبت کے دلائی لامہ، نوبل انعام کے حق دار ٹھہرے۔

دنیا بھر میں خواتین اپنی اپنی داستان کو لے کر جرأت مندی کے ساتھ آگے بڑھیں اور انہوں نے سماج کی تشدد پر مبنی صورتحال کو عدم تشدد کے رویوں کے ساتھ چیلنج کیا: آسٹریا کی برتھا وان سٹنر؛ بالی کی گڈا نک باگوس اوکا؛ ہندوستان کی مدھا پاٹکر؛ امریکہ کی ڈوروتھی ڈے، باربرا ڈیمنگ، اور جین ٹومر (اسٹین فیلڈ 49:1993ء)۔ دوسری عالمی جنگ میں برطانیہ کی 1,704 خواتین جبری بھرتی کے خلاف اصولی اختلاف کا دعویٰ کیا اور 214 خواتین جنہوں نے غیر لڑاکا یا شہری خدمات کے ذریعے جنگ میں تعاون سے انکار کیا، قید کر دی گئیں (ہریز۔جین کنس 77:1993ء)۔عورتوں نے اجتماعی طور پر انسانی حقوق کی انتہائی ظالمانہ خلاف ورزیوں کے خلاف (مدرس آف دی پلازہ ڈی مایو، بوئنس آئرس)، نسلی قتل عام کے خلاف (ویمن ان بلیک، سربیا)، جوہری جنگ کی تیاری کے خلاف (گرینہم کامن ویمنز پیس کیمپ، برطانیہ)، ماحولیاتی تباہی کے خلاف (چپکو، ہگ دی ٹریز موومنٹ، ہندوستان) آواز بلند کی اور دوسری بہت سی ناانصافیوں کے خلاف ان خواتین نے پُرزور اقدامات کیے (میک ایلسٹر 1988ء، 1982ء؛ مورگن 1984ء؛ فوسٹر 1989ء)۔ وہ عالم اور محققین جو سماج کی عدم تشدد پر مبنی تبدیلی کے علم کو فروغ دیتے اور آگے بڑھاتے ہیں،

ان میں جون دی بونڈورانٹ (1969ء)، ایلائس بولڈنگ (1992ء؛ 1980ء)، اور پیرینائس اے کیروا (1998ء) سرفہرست ہیں۔ کالج میں زیرِ تعلیم جوڑے خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ، عدم تشدد پر مبنی مزاحمتوں میں باہمی مدد فراہم کرتے ہیں: کستور با اور موہن داس گاندھی، کوریٹا اسکاٹ اور مارٹن لوتھر کنگ جونیئر، ڈولورس ہورٹا اور سیزر چاویز، ڈوروتھی ڈے اور پیٹر مورین، فرانسس مے ودراسیون اور چارلس ریخت، ایلیز بیتھ میک السٹر اور فلپ بیری گن اس کی سامنے کی مثالیں ہیں۔ 1986ء کے فلپین میں عدم تشدد پر مبنی جمہوری مداخلت میں دونوں صنفوں کی عوامی قوت عظیم الشان ثابت ہوئی، جب نئیں، پادری، عام خواتین اور عام مرد آمریت اور ردِ انقلاب کی فوجی خونریزی کے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے متحد ہو گئے (سانتیاگو، اے ایس 1995ء)۔ عالمی طور پر نوعِ انسان کی یہ غیر متشدد تاریخ اس بات کا اعتماد پیدا کرتی ہے کہ خواتین اور مرد ہلاکت سے پاک ایک ایسا منصفانہ سماج تخلیق کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، جہاں سب کی ضرورتوں کا خیال رکھا جا سکے۔

ایک ہلاکت گریز سماج کے لیے صلاحیتیں

ایک ہلاکت گریز سماج کے امکان کی جڑیں انسانی تجربے اور تخلیقی صلاحیتوں میں موجود ہیں۔ انسانوں کی وسیع اکثریت نے نہ قتل کیے ہیں اور نہ قتل کرتی ہے۔ یہ درست ہے

کہ ہم قتل کرنے کی قدرت رکھتے ہیں، لیکن فطری طور پر ہم قتل کرنے پر مجبور نہیں ہیں۔ عظیم روحانی روایات پر عمل خواہ کتنے ہی ناقص طور پر کیا جائے لیکن وہ ہمیں یہی سکھاتی ہیں کہ: زندگی کا احترام کرو، قتل مت کرو۔ اس تعلیم کے حوالے سے، انتہائی پُرتشدد موقعوں پر بھی انسانوں نے اس تعلیم کو اپنے ذہنوں میں رکھا ہے اور اس سے وابستگی کا پُرخلوص کا مظاہرہ کیا ہے۔ جب کوئی ہلاکت کا واقعہ ہوتا ہے کہ تو اس کی وجوہ کو سمجھنے، ان اسباب کو کس طرح دور کیا جائے اور خود کو اور سماج کو ہلاکت آفرینی سے نجات دلانے میں کس طرح مدد کی جائے کے حوالے سے سائنسی تخلیقیت بے مثال امید افزا امکانات پیدا کرتی ہے۔

ایک ہلاکت گریز سماج کے ابتدائی اجزا ماضی اور حال کے عالمی تجربے میں پہلے سے موجود ہیں۔ یہ کسی غیر حقیقی تصور کی پیداوار نہیں ہیں۔ ہلاکت گریز اصولوں پر مبنی روحانی، سیاسی، معاشی، سماجی اور ثقافتی ادارے اور رواج انسانی تجربات میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ فوج سے، سزائے موت سے، اور فی الحقیقت اسلحے سے پاک سماج موجود ہیں۔ نوع انسانی کی بقا اور فلاح کے لیے خطرہ بننے والے مسائل کے حل کے لیے وقف عدم تشدد کے اصولوں پر مبنی تنظیمیں اور تحریکیں موجود ہیں۔ ہلاکت گریزی کا تاریخی تجربہ موجودہ اور مستقبل کو منقلب کرنے والے اقدام کی تقویت کے لیے علم و دانش مہیا کرتا ہے۔ عدم تشدد کو ماننے اور اس پر عمل کرنے والی ماضی اور عصرِ حاضر کی زندگیوں اور افراد کا عظیم ورثہ موجود ہے جن کی جرأت اور جن کا کام ہمیں تحریک دیتا اور ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

اگر کچھ لوگ پہلے سے موجود عالمی انسانی تجربے میں ہلاکت گریزی سے جڑنے،

مطابقت پیدا کرنے، اور اس کے اجزا میں تخلیقی طور پر اضافہ کرنے کا فیصلہ کرلیں تو ایک ہلاکت گریز سماج کا قیام آج بھی ہماری پہنچ میں ہے۔ اس بات کے امکان پر زور دینا اس کے یقینی ہونے کی ضمانت فراہم نہیں کرتا لیکن پہلے جو بات ناقابلِ تصور تھی اسے ممکن بنانے اور اس اعتماد کو تقویت پہنچانے کا سبب بنتا ہے کہ ہم انسان ایک ہلاکت گریز عالمی قلبِ ماہیت کے لائق ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

تیسرا باب

سیاسیات کے لیے مضمرات

عدم تشدد نہ صرف مذہب کا معاملہ ہے۔

عدم تشدد نہ صرف سماج کا معاملہ ہے۔

عدم تشدد بالادستی کی سائنس ہے۔

جی۔راماچندرن

ہلاکت گریز سماجوں کی تشکیل کی صلاحیت کے وہ کیا مضمرات ہیں جو علم سیاسیات پر مرتب ہوتے ہیں؟ اگر ہلاکت خیزی کی ناگزیریت کے مفروضے کی جگہ ہلاکت گریزی کا تصور پیش کر دیا جائے تو اس کی صلاحیتوں کے بارے میں ماہرین سیاسیات کس نوع کی سائنس تخلیق کرنے کی کوشش کریں گے؟ کون سی اقدار ہمارے کام کو تحریک اور رہنمائی فراہم کریں گی؟ ہم کن حقائق کو جاننے کی سعی کریں گے؟ ہم کون سی وضاحتی اور پیش گوئی پر منحصر مفروضوں کی تحقیق کریں گے؟ دانش کے کس کس طرح استعمال کو ہم آسان بنائیں گے؟ ہم خود کو اور دوسروں کو کس نوعیت کی تعلیم و تربیت فراہم کریں گے؟ ہم کون سے ادارے تعمیر کریں گے؟ اور ایک ہلاکت گریز دنیا کو وجود میں لانے کے لیے ہم ایک ہلاکت گریز سماج

کے حوالے سے دوسروں کے ساتھ دریافت، اختراع، شراکت اور علم کو رواج دینے کے لیے کس طرح مصروف عمل ہوں گے؟

اگر ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ ایک ہلاکت گریز سماج کا قیام ممکن ہے تو پھر اسکا مطلب یہ ہے کہ ہم ہلاکت گریز تخلیقیت کے نظام کو اختیار کریں۔ اس کے ساتھ ہی ویبر کا یہ نظریہ بھی زیرِ بحث آ جاتا ہے کہ سیاسیات کے لیے تشدد (ہلاکت) کو تسلیم کرنا لازمی ہے، اور یہ کہ ہلاکت گریزی کی اخلاقیات ذرا بھی سیاسیات سے میل نہیں کھاتی۔ اس طرح پہلے جو بات ناقابلِ تصور تھی وہ کم سے کم ممکن الوقوع ہو سکتی ہے۔

ہلاکت گریز سیاسی تجزیے کی منطق

سیاسی گریز سیاسیات کے نمونے میں تبدیلی، ہلاکت گریز سیاسی تجزیے کو چار حصوں میں تقسیم کرنے کا تقاضہ کرتی ہے۔ ہمیں ہلاکت اور ہلاکت گریزی کی وجوہ؛ ہلاکت اور ہلاکت گریزی کے درمیان عملِ تغیر کے اسباب؛ اور مکمل طور پر ہلاکت گریز سماج کی صفات جاننے کی ضرورت ہے۔

یہ بات خلافِ قیاس سمجھی جائے گی کہ ہلاکت گریز سیاسیات کے لیے ہلاکت کو سمجھنے کی ضرورت تشدد پر مائل نظام کو سمجھنے سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ یہ نمایاں خصوصیت اس ماحول سے حاصل ہوتی ہے جو ہلاکت گریز ذرائع کا ہدف ہے اور جہاں ہلاکت خیزی اور اس سے

نسبت رکھنے والی چیزیں موجود نہیں ہوتیں۔ جہاں ذاتی اور اجتماعی مقاصد کے لیے ہلاکت کو ناگزیر اور قابلِ قبول سمجھا جاتا ہے، وہاں خود اپنی اور دوسروں کی اور باہمی ہلاکت آفرینی کی وجوہ کو سمجھنے اور اس سے پیچھا چھڑانے کی زیادہ جلدی نہیں ہوتی۔ مبہم ہی سہی، اس تصور میں تحفظ کا احساس ہے کہ آخری تجزیے میں ''میں/ ہم تمہیں قتل کردوں گا/ کردیں گے۔'' جہاں یہ سوچ غائب ہے وہاں بقا اور فلاح کے لیے ہلاکت کی وجوہ کا سمجھنا اور انہیں دور کرنا اشد ضروری ہے۔ تعلیل یعنی سبب اور اثر کے درمیان ربط کا تصور ہلاکت گریز تجزیہ کا مرکزہ ہے۔ ہلاکت جہاں واقع ہوتی ہے __ قتل سے نسل کشی اور جوہری تباہی تک __ وہاں معاملہ کتنا ہی پیچیدہ اور ایک دوسرے سے مربوط ہو، ہمیں سبب اور اثر کے طریقِ عمل کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہلاکت کا ہر واقعہ فی البدیہہ تشریح کا طالب ہے۔ ہمیں جاننا چاہیے کہ کون کس کو، کیسے، کہاں، کب اور کیوں ہلاک کرتا ہے اور کن سابقہ واقعات، منظری حالات، انفرادی اور سماجی وجوہ، اور اثرات کے ساتھ۔ یقیناً ہمیں اس شدید، تنگ دل، صنفیاتی تشریح کے لیے مہلک سانحے کے امر واقعہ کے آڑے ترچھے نقوش دریافت کرنے کی ضرورت ہے۔

اسی طرح ہمیں ہلاکت گریزی کی وجوہ کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ انسان قتل کیوں نہیں کرتے؟ انسانوں کی زندگیوں میں ہلاکت گریزی کا تصور کیوں ابھرا؟ انسان نے خود پر ہلاکت گریز اصولوں کو کیوں لاگو کرلیا؟ پوری تاریخ میں بعض لوگوں نے __ تضحیک، سماجی مقاطعہ، جلاوطنی، محرومی، قید، تشدد، قطع اعضا اور قتل، سزائے موت اور اجتماعی طور پر نیست و نابود کیے جانے تک کی دھمکیوں کے باوجود زندگی کو ہلاکت خیزی پر ترجیح کیوں دی؟ انہوں

نے ہلاکت گریز ذرائع سے ہلاکت گریزی پر مبنی نتائج حاصل کرنے کے لیے ضوابط کیوں بنائے، رواج اور ادارے کیوں تخلیق کیے؟

مزید برآں، انفرادی اور اجتماعی طور پر، ہلاکت خیزی سے ہلاکت گریزی تک ___ اور ہلاکت گریزی سے ہلاکت خیزی کو اختیار کرنے کی کیا وجوہ ہیں؟ کسی کی جان لینے کے لیے تیار ہونے اور جان لینے سے انکار کا مرحلہ کیسے آیا اور قاتلوں میں یہ تبدیلی کیسے واقع ہوئی؟ ایسا کیوں ہوا کہ فوجی امن پسند بن گئے، انقلابیوں نے ہلاکت خیزی ترک کر دی اور قاتلوں نے ہلاکت گریزی سے وابستگی اختیار کر لی؟ تصورات، افراد، رہنما، تنظیمی ادارے اور ان کی پالیسیاں عدم تشدد کی طرف کیسے مائل ہوگئیں؟ پہلے ہلاکت گریزی پر کاربند افراد خونریزی میں حصہ لینے اور اس کی حمایت کرنے پر کیوں آمادہ ہو گئے ___ مثلاً بعض ملک سزائے موت منسوخ کرتے اور اسے دوبارہ نافذ کرتے ہیں اور بعض امن پسند مخصوص جنگوں کی وقتی طور پر حمایت کرتے ہیں؟ ہلاکت گریزی پر مبنی تجزیہ نا قابل مراجعت سمت اختیار نہیں کرتا۔ واقعے کو، اس کی شدت، اور مقاصد کے درمیان تغیر کی وجوہ کو اور ہلاکت گریز تبدیلی سے پہلے تذبذب کی کیفیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ ساختیاتی عناصر کے ذریعے توجہ کا رخ افراد سے پورے سماج کی جانب ہو جاتا ہے۔

ہلاکت گریز سیاسی تجزیے کی چوتھی ضرورت یہ ہے کہ سماجوں کے درمیان قیاسی طور پر بے انتہا تنوع رکھنے والے قتل سے قطعاً پاک سماجوں کی خصوصیات سے آگہی حاصل کی جائے۔ انسانی اختراعیت کی موجودگی میں یکسانیت کا ہونا لازمی نہیں ہے۔ یہ چوتھا اقتضا

استدلال کے طور پر انتہائی تخلیقی فریضہ پیش کرتا ہے، درحقیقت تو سب ہی قضیے مکمل خلاقیت کا تقاضہ کرتے ہیں۔ پہلے تین قضیے تاریخی یا ہم عصر سیاق وسباق سے اخذ کردہ نتائج کی توثیق کرتے ہیں اور چوتھا ترقی پسندانہ تحقیق سے حاصل ہونے والی معلومات کو اخلاقی طور پر قابلِ قبول، امکانی طور پر قابلِ حصول اور بعض اوقات مفروضے کے طور پر انفرادی، سماجی، اور عالمگیر زندگی کے تصور میں متشکل کرتا ہے۔ امریکی شاعر والٹ وہٹمین کی طرح یہ ہمیں چیلنج کرتا ہے، ''دوسری جانب پھلانگنے کے لیے، اور بھی نزدیک لاؤ'' (وہٹمین :1977 71 (1855)ء)۔

یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ اب تک کوئی بھی سماج ہلاکت کی طرف مائل ہونے کی خصوصیات کے باوجود انسانی اہلیت کے مطابق ہلاکت گریزی کی تمام صفات کا مکمل مظاہرہ نہیں کرسکا ہے۔ تاہم عالمگیر پیمانے پر تاریخی اور ہم عصر تجربات کی روشنی میں اور اس حوالے سے ظاہر کردہ صلاحیتوں پر قیاس کرتے ہوئے کسی بھی سماج کے لیے نئے ہلاکت گریز امکانات اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ مزید براں، تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر بصیرت کو ''خالص نظریات'' کی تلاش میں استعمال کرنا چاہیے تاکہ ہلاکت گریز سماجوں کی مطلوبہ صفات کی نشان دہی ہوسکے اور موجودہ حالات میں ان کا حصول ممکن ہوسکے۔

اب تک عملی اطلاق میں کام آنے والے خالص نظریہ کی حوصلہ افزائی کرنے والی سائنس کے برعکس (مثلاً ریاضی، طبیعیات، اور معاشیات) سیاسیات قیاسی مفروضات پر مبنی تصور قبول نہیں کرتی۔ جہاں تک تشدد کا تعلق ہے، یہ بالکل سچ ہے۔ تشدد کی طرف مائل

سیاسیات غیر متشدد تخلیقیت کی حوصلہ شکنی کرتی ہے۔ سیاسیات کی عملی تربیت کے دوران، ہلاکت گریزی کو ''یوٹو پیائی''، ''مثالی''، اور ''غیر حقیقی'' انحراف قرار دے کر سیاسیات کی دانش کو ہلاکت خیزی تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ ہلاکت گریز تخلیقیت نجات کا مژدہ سناتی ہے۔

ہلاکت گریزی کے بنیادی علم کے تجزیے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے متبادل کے طور پر استعمال کرنے کی خاطر ہلاکت خیزی کو ایک قیف تصور کرتے ہوئے اس قیف کو پانچ منطقوں میں تقسیم کیا جائے۔

شکل نمبر 1

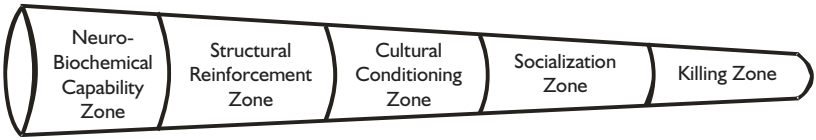

ہلاکت کا منطقہ ایک فرد کے قتل سے قتل عام تک پر مشتمل ہے۔ سماجی میلانات کے منطقے سے مراد ہے جہاں لوگ براہ راست تربیت کے ذریعے یا مختلف واقعات کے مشاہدے کے ذریعے، قتل کرنا سیکھتے ہیں۔ ثقافتی انحصاریت کے منطقے میں ہم ہلاکت کو ناگزیر اور جائز تسلیم کرنے پر مائل کر دیے جاتے ہیں۔ ہمارے ذہنوں کی تربیت میں مذاہب، سیاسی

''نظریات''، فتح اور دہشت انگیزیوں کے جشن، خاندانی رواج، قانون، ابلاغ عامہ، اور فنون سب ہی شامل ہیں۔قتل کا رجحان پیدا کرنے اوراس رجحان کی تائید کے لیے ساختیاتی کمک رساں منطقہ سماجیاتی معاشی تعلقات، ادارے اور مادی ذرائع فراہم کرتا ہے۔ اعصابی حیوی کیمیائی منطقہ طبیعیاتی، عصبیاتی اور ذہنی عمل کے عناصر کاراورطریق عمل پر مشتمل ہے جوانسانوں میں غارت گری یا بقائے ذات کے لیے ہلاکت آفرینی، اور ہلاکت گریزی کے رجحان کی استعداد پیدا کرنے میں مدد دیتے ہیں (لوپیز۔ ریز 1998ء: مورٹن 2000ء)۔

ہلاکت گریز قلب ماہیت کا تصور اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب ہلاکت کی قیف کو ہلاکت گریز پنکھے کے متبادل کے طور پر کھولا جائے اور ہر منطقے کے اندر اور باہر مقصدی کوششیں کی جائیں (شکل نمبر 2)۔ یہ تبدیلیاں غیر مہلک سماجیت کاری اور ثقافتی انحصاریت کے ذریعے ہلاکت کے منطقے میں مذہبی اور غیر مہلک اعلیٰ ٹیکنالوجی کی مداخلت سے سماجی اقتصادی حالات کی تعمیرِ نو تک تاکہ وہ اس صورت حال کو قائم رکھنے یا اس میں تبدیلی کے لیے نہ ہلاکت آفرینی پیدا کریں نہ انہیں اس کی طلب ہو، اور یہ طبی ادویہ سازی، طبیعیاتی اور تغیراتی فکر انگیز اور حیاتی بازافزائش تک کا احاطہ کرتی ہیں جو قتل کرنے کے حیاتی رجحان سے آزادی دلاتی ہے۔

شکل نمبر 2

ہلاکت گریز متبادل حالتوں کا سامنے آنا

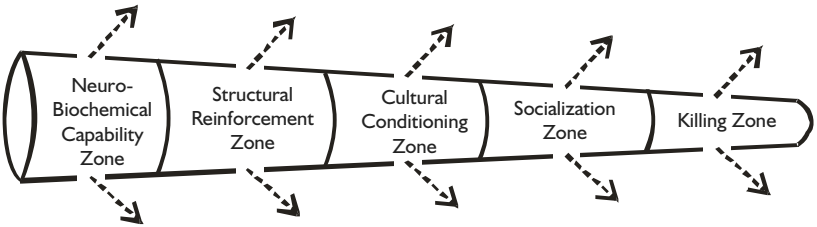

ہلاکت گریزی کے عملی اصول

عدم تشدد پر مبنی سیاسی تجزیے کی منطق کے لیے جس علم وفہم کو جاننے کی ضرورت ہے، وہ ہلاکت کے منطقوں کے متبادل غیر متشدد رویوں کی تشکیل کے لیے لازمی ہے۔ ایک ہلاکت گریز مثالی نمونے پر عمل کے لیے اعلیٰ اقدار پر مبنی اصولوں کی ضرورت ہوتی ہے جو روزمرہ سے لے کر عالمی سیاست کے معاملے میں بھی افراد کی رہنمائی کر سکیں۔ انہیں تجرباتی جواز کا انداز نظر اختیار کر کے ترقی دی جا سکتی ہے جو عملی تجربات اور تفتیش کے لیے کیے جانے والے تجربات کو یکجا کرتی ہے۔ فوجی۔ انسانی کمپیوٹر اور 'ورچوئل ریلیٹی' پر مبنی دو بدو مقابلے پہلے ہی بہت ترقی یافتہ ہیں۔

بیسویں صدی کی نمایاں سرگرمیوں میں (مثلاً گاندھی اور کنگ کی تحریکوں میں) ابھرنے والے عدم تشدد کے اصولوں میں سے یہ اصول توجہ کے مستحق ہیں:

زندگی کے احترام سے متعلق وجدان سے قوت حاصل کرو، خواہ وہ مذہبی ہوں یا انسان دوست۔

خود اپنی زندگی اور دوسروں کی زندگیوں کا احترام کرو۔

سب کا بھلا چاہو۔ تشدد پھوٹ ڈالتا ہے؛ عدم تشدد یکجا کرتا ہے۔

تنازعہ کی صورت میں، شروع سے آخر تک تذلیل، حقارت، تباہی اور غارت گری کے بجائے مصالحت کی کوشش کرو۔

ضرورت مندوں کو مصیبتوں سے نجات دلانے کے لیے تعمیری خدمات میں حصہ لو۔

تخلیقی صلاحیت کے حامل بنو۔ ٹیکنالوجی اور ساختیاتی تشدد کی موجودہ حالت تک پہنچنے میں انتہا درجے کی تخلیقیت صرف ہوئی ہے۔ عدم تشدد کے اصولوں پر مبنی کایا پلٹ کے لیے اس سے کہیں زیادہ تخلیقیت کی ضرورت ہوگی۔

تبدیلی کے لیے ایک تجرباتی انداز نظر اختیار کرو۔

کامیابیوں اور ناکامیوں سے سبق حاصل کرتے ہوئے، ہلاکت گریز سماجوں کا درست اندازہ لگانے کی کوشش کرو۔

انفرادی اور بڑے پیمانے پر کیے جانے والے سماجی اقدامات کا احترام کرو، اس میں (انفرادی) اخلاقی مثال سے لے کر عدم تشدد کی عوامی طاقت، سب ہی شامل ہیں۔

تخلیقی طور پر حوصلہ مند بنو۔ تشدد کی حمایت ترک کردو اور اسے عدم تشدد پر مبنی متبادل کو طاقت پہنچانے کے لیے وقف کردو۔

زمین پر آہستگی کے ساتھ قدم رکھو۔ فطرت پر اور اپنے جیسے انسانوں پر جو ہلاکتوں میں تعاون کرتے ہیں، تقاضے کم کردو۔

ہر شخص جو عدم تشدد سے متعلق انکشاف اور سرگرمی کے عمل میں شریک ہوتا ہے، وہ عالمی زندگی میں ہلاکت گریزی کے حوالے سے زیادہ ان اعلیٰ اصولوں اور مہارتوں کو ارتقائی طور پر تشکیل دینے میں مدد دے سکتا ہے جو خاص مواقع اور حالات کے لیے مناسب ہوں۔

ہم عصر سیاسیات کے سیاق و سباق میں، ہلاکت گریز سماجوں کے قیام کو حقیقت

بنا دینے کا امکان ہمارے نظم و ضبط کے ہر پہلو پر سوال اٹھاتا ہے۔ عمومی طور پر تشدد کی ناگزیریت اور اس کا قانون کی رُو سے درست سمجھے جانے کو سماج کے دیگر ارکان کی طرح سیاسیات سے وابستہ ماہرین خود کو الگ الگ طریقوں سے مندرجہ ذیل خیالات پر مائل پاتے ہیں: تشدد کے حامی __ ذاتی طور پر یا تہذیب کے لیے ہلاکت کو اثباتی طور پر مفید سمجھنا؛ مائل بہ تشدد __ افادیت کے پیش نظر ہلاک کرنے یا ہلاکت کی حمایت پر مائل؛ تشدد کے حوالے سے دونوں رجحانات کے حامل یعنی قتل کرنے یا نہ کرنے کی حمایت اور مخالفت دونوں پر مائل؛ تشدد سے گریزاں __ قتل اور اس کی حمایت نہ کرنے کا رجحان رکھنا تاہم اس کے لیے تیار رہنا؛ عدم تشدد پر مائل __ قتل نہ کرنے اور ہلاکت آفرینی کے لیے معاون حالات تبدیل کرنے کا عہد کیے ہوئے۔ مجموعی طور پر پہلی چار حالتوں کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ وہ تشدد پر مائل یا تشدد تسلیم کرنے والی سیاست اور سیاسیات کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ آخری حالت یا کیفیت، ہلاکت گریز سیاسیات کی تخلیق کا مطالبہ کرتی ہے، جس کا فریضہ سائنس اور سماج کو غیر متشدد تبدیلی میں مدد فراہم کرنا ہے۔

ہم عصر سیاسیات کو غالب طور پر ''تشدد پسند'' قرار دینے کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ فوجی ڈرل سارجنٹوں اور افسروں کی طرح تمام ماہرین سیاسیات کلاس روم میں اپنے طلبا کو ''قتل کرو! قتل کرو!'' کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ نہ ماہرین سیاسیات کی اس تشدد گریز مدد کو نظر انداز کرنا چاہیے جو وہ جمہوری اداروں کو متبادل فراہم کرنے کے لیے کرتے ہیں (مثلاً سیاسی جماعتوں کے مقابلے، انتخابات، قانون ساز ادارے اور قانون) تاکہ خانہ جنگی اور عالمی جنگ کو

روکا جا سکے۔ تاہم موجودہ قواعد وضوابط کی تشدد پسند فطرت کی توثیق اور ہلاکت گریز متبادل کا امکان اخلاقی۔ حسیاتی اور حسیاتی۔ اخلاقیاتی برتری کی امید دلاتا ہے۔ یہ اس ضرورت کو اجاگر کرتا ہے کہ قواعد وضوابط کے معیاری حسیاتی اور حسیاتی معیاری قالب میں ہلاکت گریزی کے ساتھ آزادی، مساوات، عدل اور جمہوریت کے معاملات کو بھی جگہ دینا چاہیے۔

غیر متشدد سائنسی انقلاب

ہلاکت گریز سماج کے قیام کے امکان کو تسلیم کرنے کا مطلب ہے کہ سیاسیات میں ایک غیر متشدد سائنسی انقلاب۔ باہم انحصار رکھنے والے جن انقلابات کی ضرورت ہے ان میں سے سات ذیلی انقلابات یہ ہیں: ہلاکت کو تسلیم کرنے سے لے کر اس کو مسترد کرنے تک ایک معیاری انقلاب؛ ہلاکت گریز سماجی تبدیلی کے لیے سازگار عناصر کی شناخت کرنے کے لیے حقیقت پر مبنی انقلاب؛ ہلاکت گریز تبدیلی کی وجوہ اور طریق عمل سے آگہی کے لیے ایک نظریاتی انقلاب؛ ہلاکت گریزی کی قلبِ ماہیت کے لیے آگہی اور مہارتیں فراہم کرنے کے لیے ایک تعلیمی اور تربیتی انقلاب؛ عمل میں ہلاکت گریز آگہی کو شامل کرنے کے لیے اطلاقی انقلاب؛ ہلاکت گریز تبدیلی میں آسانی پیدا کرنے کے لیے تنظیموں کی قلبِ ماہیت اور تخلیق کے لیے ایک ادارہ جاتی انقلاب؛ اور ہلاکت گریز قلبِ ماہیت کے مقاصد کے لیے انتہائی سازگار تحقیق، تجزیے اور عمل کے طریقے تخلیق کرنے اور مطابقت پذیر بنانے کے لیے

طریقیاتی انقلاب۔

میعاری انقلاب۔

معیاری انقلاب کے تصور میں یہ نکتہ کارفرما ہے کہ قتل کرنا ضروری اور ناگزیر نہیں ہوتا بلکہ قتل نہ کرنا ضروری اور ناگزیر ہے۔ اس عمل کے وقوع پذیر ہونے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اخلاقی اور تجربی انکشافات کو یکجا کیا جائے اور باہمی تبادلے سے ان کے اندر ایک نئی فکر یا قدر پیدا کر دی جائے۔ اخلاقی طور پر اس نقطہ نظر میں ارتقائی فکر کا یہ عمل شامل ہے کہ جس کے پہلے مرحلے میں قتل کے لازمی ہونے پر سوال اٹھایا جاتا ہے اور پھر ہلاکت گریزی کا مفروضہ قابلِ دریافت ٹھہرتا ہے۔ اس کے بعد ہلاکت گریزی پیمانِ وفا ٹھہرتی ہے۔ ہلاکت گریز سماجوں کے لئے متوازی ارتقائی عمل کے دوران جن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے، اس میں ایک یہ ہے کہ ہلاکت گریز سماج ناممکن ہے۔ اگلا مرحلہ یہ ہے کہ وہ دشوار ہے۔ اس کے بعد ہلاکت گریز سماجوں کی حقیقی اور مفروضی دریافت کا مرحلہ آتا ہے ، اور اس کے بعد علم کے حصول کے ذریعے اس سائنسی پیمانِ وفا کی تخلیق کا مرحلہ آتا ہے، جس کے تحت ایک ہلاکت گریز دنیا میں ہلاکت گریز سماجوں کی تشکیل ممکن ہو سکتی ہے۔

اخلاقی چیلنج اور تجربی ردعمل۔ تجربی چیلنج اور اخلاقی ردعمل کے باہم نفوذ کر جانے سے عدم تشدد کے اصول اور متشدد سیاست کے درمیان وہ بر کی ناقابل رسائی رکاوٹ کے مفروضے

کوعبور کیا جاسکتا ہے۔اس طرح احترام زندگی کے نا قابل مصالحت نقط نظر کو''شہادت اور استدلال کے اصولوں کو نا قابل مصالحت پیمانِ وفا کے ساتھ جوڑا جاسکتا ہے''۔ (المنڈ 1996:89)اوراسے ہم عصر علم سیاسیات کی مشترک اخلاقی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے۔

شکل نمبر 3

معیاری عمل غیر مہلک صفائی کا طریق عمل

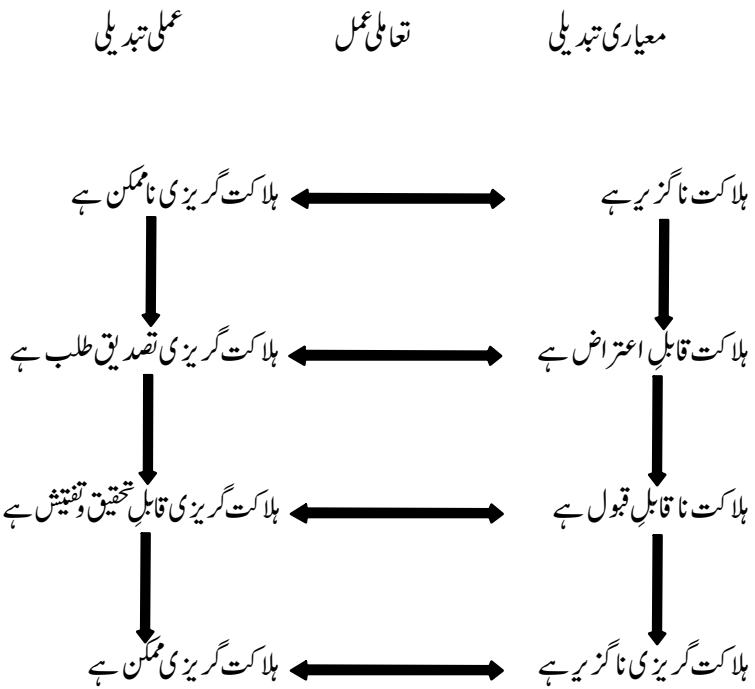

حقیقت پر مبنی انقلاب۔

درحقیقت ایک ہلاکت گریز تبدیلی سے یہ مراد ہے کہ ہلاکت گریز انسانی صلاحیتوں

کے لیے ثبوت کی مقصدی بازیافت اور تحقیق جسے تشدد پسند مفروضوں کے ذریعے نظر انداز کرنے یا غیر اہم بنانے کا رجحان ہے۔ ان حقائق کا دائرہ اعصابی سائنس سے غیر مہلک اعلیٰ ٹیکنالوجی تک ہوسکتا ہے۔ مختلف طور پر تاریخی اور ثقافتی صورت حال میں عدم تشدد کا اظہار، خصوصی دلچسپی کا طالب ہے۔ مثال کے طور پر 399 قبل مسیح میں ایتھنز کے 500 میں سے اندازاً 140 سینیٹروں نے سقراط کو سزائے موت دیے جانے کے خلاف ووٹ دیا (اسٹون 1989:187ء)۔ جاپان میں بدھ مت کے ہیان عہد کے دوران (1192-794) ، ''تقریباً تین سو پچاس برس تک سزائے موت پر عمل نہیں کیا گیا'' (ناکامورا 1967:145ء)۔ 4 اور 6 اپریل 1917ء کو امریکہ میں 6 سینیٹروں (8) اور 50 نمائندگان (9) نے جرمنی سے اعلانِ جنگ کے خلاف ووٹ دیے۔ 23 اکتوبر 1917ء کو روس میں مرکزی کمیٹی کے کم از کم دو اور ممکنہ طور پر 5 یا 6 بالشویکیوں نے لینن کی مسلح انقلاب کی پالیسی کی منظوری کی مخالفت کی (شب 1976:271ء)۔ اواخر جولائی 1945ء میں امریکہ میں ایٹم بم کی ایجاد میں مدد دینے والے مین ہٹن پروجیکٹ کے 150 سائنسدانوں میں سے 19 نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی حملوں سے قبل ان ہتھیاروں کے کسی طور بھی فوجی استعمال کی مخالفت کی تھی (جیوونتی اور فریڈ 1965:168ء؛ لیپر ووٹز 1995ء)۔ غیر ہلاکت آفریں ہتھیاروں کی تحقیق، تیاری، اور حصول کے لیے دفاع کے تمام محکموں اور دیگر حکومتی سرگرمیوں سے تعاون کرنے کے لیے 1996ء میں امریکی میرین کارپس ''ایگزیکٹو ایجنٹ'' بن گئی (لیور اور سکوفیلڈ 1997:45ء)۔ یہ رویہ ہلاکت گریز حفاظتی فکر کی جانب سفر کا نقیب (پیش

خیمہ) بنتا ہے، حالانکہ آج کل اس نوع کے ہتھیار ہلاکت آفرین ٹیکنالوجی سے وابستہ ہیں اوراب بھی معذوراور ہلاک کر سکتے ہیں۔

ایک ہلاکت گریز حقیقی تبدیلی پر سماج میں غیر مہلک رجحانات کے ماضی اور حال کے مظاہر کو تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

نظری انقلاب

بامعنی نظری انقلاب سے مراد عملی اور معیاری نظریات کی تخلیق ہے جو ہلاکت گریز تجزیے کی منطق کے لیے مطلوب علم کو ترقی دیتے ہیں اور انفرادی فیصلوں، سول سوسائٹی کی فعالیت اور حکومتی پالیسیوں میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ مثلاً نظری خود بینی کے تین پیش رو ماخذ __ اصولی، دخل انداز اور قابلِ عمل __ کا امتزاج ہلاکت گریز سیاسی قوت کی قلبِ ماہیت کے امکان میں غیر معمولی بصیرت حاصل کرنے کی امید پیدا کرتا ہے۔ سب سے پہلا تقلیدی طور پر نظر انداز کردہ حق کے متلاشی (انصاف کے متلاشی) انفرادی اور اجتماعی اعمال میں زندگی کے احترام کی روحانی قوت کی اہمیت ہے جس پر گاندھی نے اصرار کیا، مثال کے طور پر، جس طرح گاندھی کی ستیاگرہ کی سائنس میں وضاحت کی گئی ہے (1970ء)۔ گاندھی کے خیال میں __ خدا پر غیر متزلزل اعتماد (ایمان) تمام مذاہب پر محیط __ سچائی، پیار، اور عدم تشدد کی غیر متشدد قوت کا ناقابلِ تسخیر منبع ہے۔ عدم تشدد کی روح اور اصلیت، انسانی زندگی کا بنیادی قانون ہے؛ تشدد اس کی ہتک اور خلاف ورزی ہے۔

دوسرا، غیر متشدد قوت کا نظریہ ہے جسے جین شارپ کی تصنیف ''غیر متشدد عمل کی سیاست'' (1973ء) میں پیش کیا گیا ہے۔ سیاسی قوت کی تابع فرمان فطرت کے معاملہ فہم تجزیے پر مبنی، شارپ غیر متشدد جدوجہد کے لیے تاریخی طور پر ثابت شدہ اسلوب کا وسیع خزانۂ فن پیش کرتا ہے اور غیر متشدد سیاسی قلبِ ماہیت کی حرکیات کا ایک تذویراتی تجزیہ مہیا کرتا ہے۔ شارپ کا مفروضہ ہے کہ غیر متشدد سیاسی عمل واضح اور نتائج کے اعتبار سے طاقتور ہے: اور اس کے لیے روحانی، مذہبی، یا امن پسند اصولوں سے ترجیحی پیمانِ وفا کی ضرورت نہیں ہے۔ ہلاکت گریز نظری تصور کو چیلنج کرنے کا تیسرا ذریعہ جان برٹن کا تشدد کے ماخذ کا ضروریات سے محرومی کا تجزیہ اور ہلاکت گریز قلبِ ماہیت کے لیے ضرورتوں کو شراکت کے ذریعے تسکین دینے والے عمل کی تشخیص ہے۔ برٹن کا نظریہ ''مسائل حل کرنے کا طریق عمل'' (1979ء) اور دیگر تصانیف (1984ء، 1996ء، 1997ء) میں پیش کیا گیا ہے__ برٹن کا مفروضہ ہے کہ قتل سے جنگ تک ہلاکت آفرینی کی تمام حالتوں کا ماخذ انسانی خواہشات کی خلاف ورزی ہے، ان میں سے اولین شناخت اور وقار کا ادراک ہے۔ اس اصول کی خلاف ورزی کرنے والے اور خلاف ورزی کا شکار ہونے والے یکساں ضروریات رکھتے ہیں۔ خلاف ورزی کی صورت میں، نہ تو اقدار سے امداد طلبی اور نہ تہدیدی بندش، ہلاکت آفرینی کو کچل سکتی ہے لیکن مسائل کے حل کے طریقِ عمل کی فراہمی جس میں خلاف ورزی کے شکار تمام افراد اپنے اطمینان کی جستجو میں شریک ہو سکتے ہوں، ایک غیر متشدد دنیا میں تشدد سے پاک سماج کے قیام پذیر ہونے کی امید پیدا کرتی ہے۔

روحانی قوت، سرگرم اثر انگیزی اور شراکتی بنیادوں پر مسئلے کے حل کی یہ بصیرتیں غیر متشدد نظریے کے عناصر سے آگاہی دیتی ہیں جنہیں عمومی طور پر تاریخ، ریاست، طبقہ، معیشت، اداروں، صنف، نسل، گروہ، مذہب، ثقافت، ماحولیات، مستقبل کی پیش بینی اور مقامی اور عالمی حالات کے دیگر پہلوؤں کے سیاق وسباق کے طور پر شامل کیا جاسکتا ہے۔ غیر متشدد نظریے میں تخلیقیت کی بنت کاری اور ترقی دینے کے اہم معاملات رابرٹ جے بروز (1996ء)، بیرینائس اے۔ کیرول (1998ء)، جوہن گال ٹنگ (1996ء)، برائن مارٹن (1989ء) اور کیٹ میک گوینیس کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔

اطلاقی انقلاب:

مجموعی معیاری اور مبنی برحقیقت، نظری تبدیلی سے مراد ہے ہلاکت گریز سیاسیات کے لیے نئے اطلاقی بیان۔ معیاری تبدیلی کا مطلب ہے ہلاکت گریز خیال، افراد، تنظیموں، تحریکوں، پالیسیوں اور اداروں کے لیے نئی دلچسپی اور تعمیری (لیکن غیر تنقیدی نہیں) حمایت۔ شارپ کا نظریہ پر تشدد جابر حکومتوں کی غیر متشدد قلبِ ماہیت میں مدد دینے کے صریح عہد کا خیال پیش کرتا ہے جسے دردنا آشنا جمہوری نظاموں پر اثر پذیر ہونے یا تبدیل کرنے تک وسیع کیا جاسکتا ہے۔ برٹن کے نظریے کے مطابق سیاسیات کا اطلاقی کردار اور انسانی ضرورت کے مطابق غیر متشدد طور پر دردآشنا سماجی اور سیاسی مسئلے کے حل کے شراکتی طریق عمل کے ذریعے مدد کرنا ہے۔ گاندھی کا نظریہ، اخلاقیات، طریقوں اور ضروریات زندگی سے محرومی سے حساسیت کو آمیز کر کے غیر مبہم طور پر سیاسی، سماجی اور سماجی ساختیاتی تشدد کے بدلتے

ہوئے حالات کی مدد کرنے کے عہد کا مشورہ دیتا ہے جو ہلاکتوں اور ہلاکت کی دھمکیوں دونوں کی پیداوار اور پیدا کار ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ گاندھی اور کنگ جیسے رہنما جو ہلاکت گریز روحانی اصولوں سے متاثر تھے، انتہائی عمیق طور پر غیر متشدد ساختیاتی تبدیلی سے مخلص تھے۔

ہلاکت گریز تجزیے کی منطق کو مطلوب علم پر مرکوز کرتے ہوئے، اور ہلاکت کی قیف کو ہلاکت گریزی کے وسیع متبادل کے طور پر سامنے لاتے ہوئے ہلاکت گریز سیاسیات کو مقامی اور عالمی قلب ماہیت میں مدد دینے کا چیلنج درپیش ہوتا ہے۔ ''جمہوری سیاست'' اور ''آزاد منڈیوں'' کی ہم عصر شرائط کے تحت انفرادی اور اجتماعی ہلاکت آفرینی کا وجود اس خیال کو جنم دیتا ہے کہ موجودہ قائم شدہ رواج کے حوالے سے یہ انسانی فلاح کے مشکوک محافظ ہیں۔ یہ حالات ''غیر جمہوری سیاست'' اور ''آزادی سے محروم منڈیوں'' کے ساتھ باہمی عمل میں جڑ کر، ہلاکت گریز سیاسیات کی تخلیقیت کے لیے چیلنج بن جاتے ہیں۔

تعلیمی انقلاب

ہلاکت گریز سیاسیات کی جانب بڑھنے کا مطلب ہے سیاسیات کے ماہرین کی پیشہ ورانہ تربیت میں اور سماج کے دیگر ارکان کو دی جانے والی تعلیمات میں تبدیلیاں۔ صریحاً یا معنی کے اعتبار سے، ہلاکت آفرین رواجوں اور شرائط کی عکاسی اور ادعا کرنے کی بجائے، سیاسیات کی تعلیم کو ہلاکت گریز عالمی تبدیلی کا نمایاں ممد و معاون بننا چاہیے۔ ہلاکت گریز

سماجوں کا بالکل سامنے کا نصب العین رہنماؤں اور شہریوں کی تعلیم و تربیت کرتا ہے۔ اُنہیں درپیش چیلنج، ہلاکت گریز بصیرت کی دریافت، بازیافت اور شراکت کے ذریعے __ تحقیق، تدریس، مشاورت، رہنمائی، شہری سرگرمیوں، اور تنقیدی سوچ بچار کے لیے صلاحیتیں پیدا کرنے کا ہے۔ ہلاکت گزیر سیاسیات کی تربیت کے لیے شرکا میں غیر معمولی خود آگہی کی ضرورت ہوگی __ جو ماہرینِ نفسیات اور روحانی صلاح کاروں میں پائی جاتی ہیں۔ تشدد اور عدم تشدد کی جانب ہمیں اپنے عقاید، رجحانات اور جذبات کے سرچشموں اور مضمرات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ عدم تشدد پر مبنی سماجی تبدیلی کے لیے خود آگہی شرطِ اول ہے۔ استغراق کے سائنسی طریقوں کی تربیت حاصل کرتے ہوئے متنوع روحانی انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ باہمی مفاد اور مدد کے لیے ذاتی اور پیشہ ورانہ نمو کی عملی بصیرتوں میں شراکت کے مواقع فراہم کیے جانے ضروری ہیں۔ دیگر معاملات میں ہم کتنے ہی مختلف ہوں، لیکن ہلاکت گریز سیاسی ماہرین کو ساری زندگی پر محیط اور ایک دوسرے کے اشتراک ساتھ آگے بڑھنے اور زندگی کیلئے ہمہ گیر احترام کے اظہار میں ذاتی اور مجلسی طور پر، جستجو کرنا چاہیے۔ یہ احتیاجات سماج کے دیگر ارکان کی احتیاجات سے مختلف نہیں ہیں۔

مشاورتی اور اطلاقی کرداروں کی تیاری میں، ہلاکت گریز ماہرین سیاسیات کو اس نوعیت کی اعلیٰ مہارتیں حاصل کرنے کی ضرورت ہے جس کی ہم طبی محققوں، ڈاکٹروں اور ڈاکٹروں کے استادوں سے __ اور زندگی اور موت کے دیگر شعبوں میں کام کرنے والوں سے توقع رکھتے ہیں۔ ہلاکت گریز سماجوں کے لیے ماہرین سیاسیات کا کام، انفرادی اور

عوامی صحت کے لیے کام کرنے والے ڈاکٹروں اوراس پیشے سے منسلک دوسرے افراد کے مقابلے میں کم نہیں ہونا چاہیے۔ یہ دونوں جدید اعلیٰ بصیرت پر مبنی تشخیص، تجویز اور معالجے کی اہمیت کے حسابوں یکساں ذمہ داریاں رکھتے ہیں اور دونوں کو زندگی اور موت سے متعلق مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دریں اثناء، سماج کا ہر رکن ہلاکت گریز عالمی قلبِ ماہیت میں مددگار ہوسکتا ہے۔ ہلاکت گریز سیاسیات کا تعلیمی مقصود ذاتی نشوونما، بصیرت اور مہارتوں کے حصول کے لیے ہر شریک کار کو ہر سطح پر مواقع فراہم کرنا ہے جو غیر متشدد رہنمائی اور شہریت کی افزائش میں ساری زندگی مدد کرے گی۔ سب سکھائیں؛ سب سیکھیں۔

تعلیم میں، نصاب کی تشکیل کرتے ہوئے جن چیزوں سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے اُن میں ہلاک گریز تجزیہ، قتل کے رجحانات کو ہلاکت گریز متبادل مہیا کرنے کی اطلاقی مہارت کی ضرورت، اور انفرادی اور سماجی سرگرمی کی رہنمائی کرنے والے اصولوں کو مکمل ترین تشکیل دینے کی ضروت ہوتی ہے جو انفرادی اور سماجی سرگرمیوں کی رہنمائی کرسکیں۔ ایک تعارفی کورس یا مرکزی سیمینار میں شرکا کے سامنے وضاحت کے ساتھ ہلاکت آفرینی کی تاریخی اور عہد حاضر کی انسانی استعداد کا انتہائی لرزہ خیز ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے۔ پھر ہم زندگی بھر کے ایک چیلنج کا مقابلہ کرتے ہیں: ہماری تربیت کا مقصد انسانی ہلاکت کے خاتمے میں مدد دینا ہے۔ دوسرا تعلیمی تجربہ بالکل اسی طرح وضاحت کے ساتھ ہلاکت گریزی کی انسانی صلاحیت کے لئے عالمی سطح پر ثبوت وشواہد فراہم کرنا ہوگا۔ تیسرا جز انفرادی اور سماجی

قلب ماہیت اور تغیرات کو متعارف کراتا ہے ۔ چوتھا بنیادی تجربہ مطلوب سماج میں سماجی اداروں کی تعمیر کے لیے انسانی اختراعیت کا جائزہ لیتا ہے اور ہلاکت گریز سماج کی خصوصیات اور ان امکانی طریقوں پر بحث کرتا ہے جن کے ذریعے سیاسیات اس بارے میں اُن کی مدد کرسکتی ہے ۔ ہر جز میں مقامی تا عالمی بصیرت اور تقاضوں، نیز عالمی ۔ مقامی ربط و رابطے کو متعارف کرایا گیا ہے۔

اس نوع کی بنیادوں پر، ہلاکت گریز تعلیمی اختراعات تعمیر کی جاسکتی ہیں ۔ ہلاکت گریز متبادل سیاسی معاملات پر ایک انڈر گریجویٹ کورس کی مثال سامنے کی ہے کہ اس میں ہر طالب علم کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ذاتی تشویش کے حوالے سے تشدد کے ایک پہلو کا انتخاب کرے؛ پھر اُس کی نوعیت اور وجوہ پر موجودہ تحریروں کا جائزہ لے؛ اس نوع کے تشدد سے براہ راست واسطہ رکھنے والے مقامی افراد سے واقعات رجحانات، وجوہ اور متبادل صورتحال کے بارے میں مشورہ کرکے؛ ایک طالب علم دوسرے کے ساتھ اپنے تجزیوں اور مسئلے کے حل کے بارے میں تخلیقی طور پر غور فکر کرے اور متبادل تجاویز پیش کرے؛ اور پھر گروپ کے درمیان تبادلہء خیال کرے اور پھر ان تجاویز پر سماجی اتفاقِ رائے کی کوشش کرے۔

طریقیاتی انقلاب

طریقیاتی بنیادوں پر ایک ہلاکت گریز سماج کو اختیار کرنے کے لئے ریسرچ، تعلیم،

اطلاقی سیاست اور اداروں کی تعمیر کے طریقوں میں جدید انداز سے سوچنے کا چیلنج پیش کرتا ہے۔ اس وقت جو چیلنج درپیش ہے وہ ہلاکت گریزی کے لئے نئے طریقے دریافت اور ان کے اطلاق کے موجودہ طریقے اختیار کرنا؛ بہ وقتِ ضرورت نئے طریقے وضع کرنا؛ اور نیورو سائنس جیسے دیگر علوم اور شعبوں کو ہلاکت گریز قلبِ ماہیت کے لئے اپنے طریقے استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی کرنا۔ ہلاکتی منطقے میں ریسرچ اور مداخلت کاری کے طریقوں کا تقاضہ، اس کے علاوہ ایک دوسرے کے لئے موزوں اور باہم ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے ہلاکت آفرین منطقوں کا تجزیہ کرنا۔

ہلاکت گریز سیاسیات تحقیق وتفتیش کے طریقوں کے مسلسل وسیع ہوتے ہوئے اُفق سے رجوع کرسکتی ہے جس میں کم از کم اب فلسفیانہ، تاریخی، اداری، اور قانونی تجزیہ؛ معلوماتی مکالمہ؛ مشترک مشاہدہ؛ کیس اسٹڈیز؛ تقابلی تجزیہ؛ اجمالی تجزیہ؛ متن کی تفسیر؛ گیم تھیوری؛ عوامی پسند کا تجزیہ؛ شماریاتی استدلال؛ سروے ریسرچ؛ لیبارٹری اور شعبہ جاتی تجرباتی عمل؛ انسان اور کمپیوٹر کی بناوٹ؛ اور مقصد کے مطابق ان کے مختلف امتزاجات شامل ہیں۔ تعلیم کے طریقے روایتی لیکچروں، مطالعاتی مشاہدہ اور تبادلۂ خیالات سے ریسرچ اپرنٹس شپ اور انٹرن شپ کے علاوہ کمپیوٹروں کے ذریعے علم کی وسیع دنیا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ سیاسی اطلاقات میں دستوری خاکہ کشی، تنازعہ حل کرنے کا عزم، تنظیمی مشاورت، انتخابی مشورت، میڈیا کمنٹری، حفاظتی پالیسی کا اعلان اور سماجی فیصلہ سازی کے عمل میں رہنما۔ شہری کی براہ راست شرکت شامل ہے۔ دانش اور مہارتوں کی اس وسیع صف بندی کو جس بنیادی

سوال کا سامنا ہے وہ یہ ہے ''پرانے اور جدید طریقے انسانی مزاج سے ہلاکت آفرینی کے خاتمے میں کس طرح مدد کر سکتے ہیں؟''

ادارتی انقلاب

ادارتی طور پر ہلاکت گریز نمونے کی تبدیلی سے مراد یہ سوالات ہیں مثلاً سیاسیات کو کس طرح منضبط کیا جائے اُس کی ذیلی شاخیں کون سی ہیں اور ان کی دوسرے شعبوں اور اداروں کے ساتھ کیا نسبتیں ہونا چاہئیں۔اس سے مراد ہے عالمی،قومی،اور مقامی سطحوں سے انضباط کے موجودہ ڈھانچوں کے اندر ہلاکت گریز تناظر کے حوالے سے سوالات اٹھائے جائیں۔اس سے یہ بھی مراد ہے کہ نئے قائم کردہ اداروں میں سیاسیات کے جدید ہلاکت گریز شعبے تخلیق کرنے کا امکان اور یہاں تک کہ ایک جدید ماورائے انضباطی یا مخلوط پیشہ کی تخلیق جو عدم تشدد پر مبنی سماجی تقاضے پورے کر سکے۔

موجودہ صورتحال کے مطابق سیاسیات کے عالمی پیشے کی نمائندگی،1949ء میں قائم شدہ،انٹرنیشنل پولیٹکل سائنس ایسوسی ایشن (آئی پی ایس اے) کرتی ہے۔اس کے بنیادی اراکین کی تعداد تقریباً 35,689 ہے اور یہ لوگ سیاسیات کی 42 قومی انجمنوں سے تعلق رکھتے ہیں،انہیں آئی پی ایس اے کی انتظامی کمیٹی میں ادارے کے طور پر نمائندگی حاصل ہے (ضمیمہ A)۔اس کے اراکین متنوع دلچسپیاں رکھتے ہیں اور عالمی سطح پر سیاسیات کے اٹھارہ خاص شعبوں،38 ریسرچ کمیٹیوں،اور بارہ مطالعاتی گروپوں سے متعلق ہیں (ضمیمہ B)۔

قومی ایسوسی ایشنوں کے ذریعے نمائندگی نہ رکھنے والے ممالک کے ماہرین سیاسیات اور عالموں اوران کے تربیت کردہ بہت سے طلبا کواس میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

سیاسیات کے شعبے کی موجودہ صورتحال کے سروے کے لیے ایک آئی ایس پی اے پروجیکٹ پر کام کیا گیا جس میں 42 مصنفین نے حصہ لیا اوراس کے نتیجے میں A New handbook of political science (گڈن اور کلنگ مان، eds.، 1996ء)، وجود میں آئی۔ دوعشروں میں ہونے والی پیش رفت کی روشنی میں آٹھ اہم ثانوی شعبوں کی شناخت کی گئی اوراُن کا جائزہ لیا گیا ہے: سیاسی ادارے (شعوری انتخاب، قانونی تناظر)، سیاسی رجحان (استدلالی انتخاب اور کثیر الجماعتی نظام، ادارتی اور تجرباتی اندازنظر)، تقابلی سیاست (کلاں۔کرداری تناظر، جمہوریت کاری کا مطالعہ)، بین الاقوامی تعلقات (جدید حقیقت پسندی اور جدید روشن خیالی، مابعد اثباتی اورنسائی تناظر)، سیاسی نظریہ (فلسفیانہ روایت، حسیاتی نظریہ)، حکومتی پالیسی اورنظم ونسق (تقابلی پالیسی تجزیہ، تصورات، مفادات اور ادارے) سیاسی معاشیات (سماجیاتی اور Downsian تناظر)، اور سیاسی طریقیات (ماہیتی طریقے، ریسرچ ڈیزائن اور تجرباتی طریقے)۔آئی ایس پی اے کے صدر نے اس کتاب کو متعارف کراتے ہوئے کہا، ''سیاسیات کونئی صدی میں لیجانے والی اس سے بہتر کتاب نہیں ہوسکتی''۔

تاہم، کامیابیوں کے باوجود، A New Handbook of Political Science ہلاکت گریز انضباطی قلب ماہیت کی ضرورت کوظاہر کرتی ہے۔مثال کے طور پر

اس اشاریے میں ''تشدد'' یا ''عدم تشدد'' کے بارے میں دو اندراجات ہیں ''قتل''، ''نسل کشی''، ''سزائے موت''، ''فوج''، ''دہشت گردی''، یا ''پولیس'' کے بارے میں کوئی اندراج نہیں ہے۔ ''جنگ'' کے لیے ساٹھ اور ''امن'' کے لیے آٹھ اندراج کیے گئے ہیں۔ ناموں کے اشاریے میں ''ہٹلر'' اور ''لینن'' کا تذکرہ تو کیا گیا ہے لیکن ''گاندھی'' اور ''کنگ'' کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ جمہوریت، قومی دفاع اور فوجی انقلاب کی روک تھام کے لیے عدم تشدد سیاسی جدوجہد کے نظریہ اور عمل پر دنیا میں سیاسیات کے سربرآوردہ ماہرین کے نام اور تصانیف کا ذکر نہیں ہے جین شارپ / The Politics of Nonviolent Action (1973ء) __ کا تذکرہ بھی نہیں کیا گیا ہے۔ نہ عدم تشدد پر مبنی تنازعات کے حل کے بنیادی نظریہ داں، جان برٹن (1984ء، 1979ء) کا نام اور اُن کی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح عالمی امن کی شاخ مطالعہ کے ممتاز پیش رو جان گلٹنگ (1996ء) کی تصنیف کا سرسری طور پر تذکرہ کیا گیا ہے۔

آئی پی ایس اے کا وسیع ترین اور قدیم ترین قومی جز، 1903ء میں قائم شدہ امریکن پولیٹکل سائنس ایسوسی ایشن (APSA) ہے جو 13,300 ارکان پر مشتمل ہے۔ ارکان کی دلچسپیاں آٹھ بنیادی شعبوں، چھیانوے ذیلی شعبوں، اور اکتیس خصوصی دلچسپی کے حصوں میں متشکل کی گئی ہیں (ضمیمہ، ملاحظہ کریں)۔ اے پی ایس اے اور آئی پی ایس اے کے دلچسپی کے شعبے عمومی طور پر یکساں ہیں۔ امریکی علم سیاسیات کے بنیادی شعبے یہ ہیں: امریکی حکومت اور سیاست، تقابلی سیاست، بین الاقوامی سیاست، طریقیات، سیاسی فلسفہ اور نظریہ، سرکاری

قانون اور عدلیہ، سرکاری پالیسی اور سرکاری نظم ونسق۔ گو کہ ''تنازعہ کے طریق عمل'' اور ''بین الاقوامی سلامتی اور اسلحہ پر پابندی'' جیسے خصوصی حصے موجود ہیں، لیکن کسی بھی اداری ڈھانچے میں ہلاکت گریز سیاسی تجزیے اور عمل کی منطق کی آگہی اور مسئلہ کے حل کے تقاضوں کو نہیں سمویا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اس میں ''تشدد''، ''عدم تشدد'' یا ''امن'' تک پر خصوصی حصہ نہیں دیا گیا ہے (انٹرنیشنل پیس ریسرچ ایسوسی ایشن سے موازنہ کریں)۔ یوں نظر آتا ہے کہ ہلاکت گریز تمدنی متبادلات کے لئے واضح آئینی اور قانونی کوششوں کی راہ میں، اس تہذیبی مفروضے نے رکاوٹ ڈالی ہے کہ ہلاکت کو روا رکھنے اور اس کا دفاع کرنے والی جمہوریت ہی تمدنی ترقی کے واسطے بہترین اُمید ہے۔

ہلاکت گریزی کی جانب تبدیلی ارو جھکاؤ کا مفہوم یہ ہے کہ امریکی اور بین الاقوامی سیاسیات کی انجمنیں جن موضوعات کی نمائندگی کرتی ہیں، ان میں موجود شعبوں اور ضمنی شعبوں میں اندورنی اور خارجی حوالوں سے سوالات اٹھائے جائیں مثلاً ''آپ ہمیں ہلاکت گریز سماجوں کے امکانات اور اُن کے حصول کے لئے ہلاکت گریز طریقہ کار کے بارے میں کیا بتا سکتے ہیں؟''۔ اس کا مطلب نہ صرف موجود کامیابیوں کا تجزیہ ہے بلکہ نئے عناصر کو متعارف کرانے جیسے دونوں اقدامات شامل ہیں۔ مثال کے طور پر امریکی علمِ سیاسیات کے چار ''روایتی'' میدانوں کے بارے میں سوالات اُٹھانا جو عہد حاضر میں تنوع کے پھیلاؤ سے متعلق ہیں۔ یہ شعبے امریکی حکومت اور سیاست، تقابلی سیاست اور بین الاقوامی تعلقات کے اندر ہیں۔

سیاسی فلسفہ اور نظریہ

سیاسی فلسفے اور نظریے میں ایک ہلاکت گریز تبدیلی کا مطلب ہے جدید ہلاکت گریز تخلیقیت متعارف کرانے اور غیر متشدد بصیرت کی بازیافت کے لیے ہر ثقافت میں سیاسی فکر کے ورثے پر نظر ثانی کرنا۔ مثال کے طور پر، افلاطون کی 'ریپبلک' میں ڈینس ڈالٹن ''عدم گزند'' کا اخلاقی تصور دریافت کرتا ہے جس کی سیاسی رہنماؤں کو آرزو کرنا چاہیے، باوجودیکہ افلاطون جنگ، سزائے موت اور فوجی ثقافت کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ معیار پلوٹارک کے مشاہدے میں منعکس ہوتا ہے جب وہ کہتا ہے ''چاقو سے مدد لینا ایک اچھے معالج یا حکمران کی نشانی نہیں ہے، بلکہ دونوں صورتوں میں اس سے عدم مہارت کا اظہار ہوتا ہے اور حکمراں کے معاملے میں تو اس میں ناانصافی اور سفاکی دونوں کا اضافہ ہوجاتا ہے'' (پلوٹارک 10:249)۔ چینی روایات میں مینشس (C.371-C.289 B.C.E) کہتا ہے: وہ جو، طاقت استعمال کرتا ہو اور پھر نیک ہونے کا دعویٰ کرے وہ ظالم فرماں روا ہے..... وہ جو، نیکی کرتا ہے، اور انسانی رحم دلی کے مطابق عمل کرتا ہے وہ بادشاہ ہے'' (فونگ 1952:112) چین ہی کی روایات میں، موتسو (موتی، (C.468-C.367 B.C.E) جسے جنگ اور ظلم کا چینی نقاد اور ''آفاقی محبت'' کا فلسفی کہا جاتا ہے وہ عالمی بازیافت اور دریافت کی ترغیب دیتا ہے (فونگ 105-1952:76ء)۔

تشدد کی حامی کلاسیکی تحریروں کی ہلاکت آفرینی کو نکال کر ان کی دوبارہ تشریح کی جاسکتی ہے اور اُن کے اندر پوشیدہ عدم تشدد کے رویوں کو اجاگر کیا جاسکتا ہے۔ غیر متشدد اسٹریٹجک دفاع کے اصول اخذ کرنے کے لیے کلاسوئز کی ''ON WAR'' کی نئی تشریح پر مبنی بروز کی نئی تفسیر (1996ء) اور چیواٹ ساتھا آنند کی غیر The Nonviolent Prince (1981ء) میں میکیاویلی کی نئی تفسیر میں اس کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ہندوؤں کی روحانی کلاسیک بھگوت گیتا میں جنگجو ہیرو ارجن کو کرشن بھگوان کی نصیحت سے گاندھی نے عدم تشدد کے جو اصول اخذ کئے، اُس کی جھلک متذکرہ بالا ان دونوں کتابوں میں نظر آتی ہے (گاندھی 1971ء)۔

ماضی کے تشدد پسند کلاسکس حال اور مستقبل کی غیر متشدد تخلیقیت کو چیلنج کرتے ہیں۔ اگر افلاطون فوجی اوصاف کا مظاہرہ کرنے والے رہنماؤں کی حکمرانی والی جمہوریہ تجویز کرسکتا ہے، تو آج عدم تشدد کے اصولوں سے وابستہ جرأت مند رہنما اور شہری ایک غیر متشدد سماج کا خواب دیکھ سکتے ہیں۔ اگر ارسطو جنگ لڑنے والی ریاستوں کے لیے ضابطے بیان کرسکتا ہے، تو آج ہم ہلاکت گریز سماجوں کی معاونت کرنے والے آئین تشکیل دے سکتے ہیں۔ اگر میکیاویلی تشدد پسند حکومت کیلیے مہارتیں تجویز کرسکتا ہے، تو آج یہ ممکن ہے کہ ہم غیر متشدد سیاسی قوت کے لئے حکمت عملی اور طریقہ کار مرتب کرسکیں۔ اگر ہوبس تشدد کی اجارہ داری کے ذریعے جبری سماجی امن والی عظیم الشان ریاست تجویز کرسکتا ہے تو ہم انسانی ضرروتوں کے مطابق حکمرانی کے ایسے نئے طریقوں کا کھوج لگا سکتے ہیں جن میں ہلاکت

آفرینی کی ضرورت نہ پڑے۔ اگر استبدادی حکومت کو ہٹانے کے لیے لاک متشدد انقلاب کا خواب دیکھ سکتا ہے تو آج ہم غیر متشدد جمہوری آزادی کی حکمت عملی اور تدبیر کو دائرہ خیال میں لا سکتے ہیں۔ اگر مارکس اور اینگلس تشدد پر مبنی طبقاتی جدوجہد کو بنیادی فیصلہ کار کے طور پر دیکھ سکتے ہیں تو اب ہم معاشی انصاف کی قدیم آرزوؤں کو حقیقت میں ڈھالنے کے لیے غیر متشدد جدوجہد کے خواب دیکھ سکتے ہیں۔ اگر روسو عدم تشدد کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف ہلاکت آفرینی پر مبنی ایک سماجی معاہدہ تجویز کرسکتا ہے اور اگر موجودہ رہنما تشدد پر مبنی ''معاہدوں'' اور ''عہد ناموں'' کی بات کرسکتے ہیں تو اب ہم ہلاکت گریز برادریوں میں پائے جانے والے فلاح کے باہمی پیمانِ وفا کا کھوج لگانے کی ابتدا کرسکتے ہیں۔ اگر کانٹ (1959ء/ 1795ء) جنگ نہ کرنے کے تعلق اور جبری حکم سے اٹل وابستگی کی بنا پر ''دائمی امن'' کا خواب دیکھ سکتا ہے، تو ہم آج ہلاکت گریز لازمے کو عالمی حقیقت میں بدلنے کے لیے ضروری عناصر کی جستجو کرسکتے ہیں۔ اگر امریکی سیاسی روایت، آزادی کا ایک متشدد کلاسیکی اعلان نامہ اور تشدد کی توثیق کرنے والا آئین ورثے میں چھوڑ سکتی ہے تو آج امریکی معاشرتی تشدد سے نجات کے لئے غیر متشدد اعلان نامے اور ایک جدید ہلاکت گریز دستور کا خواب دیکھنا ممکن ہے۔ اور اگر وبیر سیاست کو ایک ایسے رجحان کے طور پر تجویز کرسکتا ہے جسے تشدد کی ناگزیریت کو لازمی تسلیم کرنا چاہیے تو آج ہم سیاست اور سیاسیات میں ایک ایسے رجحان کے طور پر غور کرسکتے ہیں جو تشدد سے نجات کا امکان رکھتا ہے (ارینڈ 1970ء؛ ملر اور سیملین 1995ء؛ اسٹیگر اور لینڈ 1999ء)۔

ہلاکت گریز سیاسی فکر کی جانب تبدیلی کے لئے ضروری ہے کہ فلسفے اور نظریے کے حوالے سے گاندھی کی سیاسی فکر کا سنجیدگی سے تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ چونکہ ماضی میں یہ رویہ اختیار نہیں کیا گیا اسی لیے تشدد کی حامی دنیا میں گاندھی کو نوبل امن انعام کا حق دار نہیں سمجھا گیا۔ اس ضمن میں مواد بکثرت موجود ہے ۔ ہندوستانی مفسرین نے بالخصوص اور غیر ہندوستانی معاونین نے مختلف نظریاتی اور انضباطی تناظر میں بنیادی کام / کئے ہیں (دھون 1957ء، ڈانگے وغیرہ 1977ء، آئیر 1973ء، پارکھ 1989a,1989b، بونڈ وارنٹ 1969ء، ڈالٹن 1993ء، گالٹنگ 1992ء، شارپ 1979ء، اسٹیگر 2000ء)۔

دنیا کی تمام ثقافتوں میں، ماضی اور حال کے، غیر متشدد متبادلات کے حامیوں کے افکار کے ذریعے ہلاکت گریز نظریے کے تخلیقی ارتقاء کے مواقع پیش کئے گئے ہیں۔ آرتھر اور لیلا وین برگ نے 550 قبل مسیح سے ایک سروے مہیا کیا ہے (1963)۔ ٹی کے این انتن اور یوگندر سنگھ کی تحقیق میں کثیر المذہبی بنیادیں واضح کی گئی ہیں (1973)۔ ول مورے، یونان، روسی، یوروپی، امریکن روایات میں قدیم رسموں سے ملح جوئی کی بڑی واضح تنقیدی تخلیق پیش کرتا ہے۔

عالمی سطح پر غیر متشدد سیاسی فکر کے بارے میں تحقیق اور استفسارات کا جو عمل جاری ہے اس کے نتیجے میں بعض تعجب خیز دریافتیں متوقع ہیں۔ ان میں سے ایک ''سیاست'' کی غیر متشدد تعریف ہے جو کوریا کے فلسفی ہوانک، جانگ یاپ نے اپنے اس انٹرویو میں بیان کی تھی جو اس نے 1987 میں پیانگ یانگ میں دیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔ ''محبت اور مساوات کی بنیاد

پر سماج کے تمام ارکان کے مفادات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا مطلب سیاست ہے'' وہ اور انٹرویو کرنے والا دونوں اس وقت ماہر سماجیات سوروکن (1954-1948) کے اس غیر معمولی مطالعے سے بے خبر تھے جو اس نے ''محبت'' اور ''تخلیقی ایثار'' کے موضوع پر کیا تھا اور جسے ارینڈٹ کے (1970) ربط پیدا کرنے ، فیصلہ کرنے ، اور باہم عمل کرنے پر زور اور برٹن (1979) کے انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے عمل پر اصرار کے موضوعات پر کئے جانے والے مطالعوں سے ہم آہنگ کر کے دیکھنا چاہیے۔

یہ تمام باتیں جدید ہلاکت گریز سیاسی نظرے کی بنیاد ہو سکتی ہیں۔

مطالعہ نظمِ سیاست

سیاسی طور پر منظّم سماجوں اور ان کے حصوں (مشمولات) یعنی گاؤں سے قومی ریاستوں اور بالائے قومی وحدتوں تک ۔۔۔ جسے امریکی حکومت اور سیاست کے شعبے کے مجموعی مطالعے میں ہلاکت گریز تجزے کی منطق ایسے سوال اٹھاتی ہے جنہیں جرات مندی کے ساتھ پوچھنے کی ضرورت ہے تا کہ اس مسئلہ پر قابو پایا جا سکے جسے ماہر مستقبلیات ہرالڈلنسٹن نے روایات کی ''مفروضہ رکاوٹ'' کے طور پر بیان کیا ہے۔

سیاسی ہلاکت آفرینی حبِ وطن کے قلعے میں بند ہو کر خود کو جواب دہی (question) سے محفوظ رکھنے کو ترجیح دیتی ہے۔ جہاں نظم حکومت کے دائرے میں سوالات اٹھانا ممکن نہ ہو تو اس دائرے سے باہر سیاسی سائنسدانوں کو یہ سوالات اٹھانے چاہئیں۔

ایک ہلاکت گریز انداز فکر کئی سوالات کے جوابات کا تقاضہ کرتی ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ ہر سیاسی سماج کی تشکیل اور اس کے برقرار رہنے میں ہلاکت نے کیا کردار ادا کیا ہے؟ نظم سیاست کے ذاتی پیکر کا انحصار کس حد تک ہلاکت آفرینی کی قابل تعریف تاریخ پر ہے؟ حکومتی اور غیر حکومتی سطح پر کس نوعیت کی ہلاکتوں کا سلسلہ جاری ہے اور مستقبل میں ان کے کیا امکانات ہیں؟ شہریوں کو قانونی یا ماورائے قانون، موافق یا مخالف حکومت، ملک میں یا بیرون ملک ہونے والی ہلاکتوں میں شریک کرنے یا ان کی حمایت کرنے کے لئے سماجی طور پر کس طرح تیار کیا گیا ہے؟ سیاسی، معاشی، سماجی، اور ثقافتی تصورات، رواج اور ڈھانچے ہلاکت آفرینی میں کس طرح مدد کرتے ہیں؟ ہلاکت دیگر قدروں کی پیروی کے حوالے سے نظم سیاست کی صلاحیت پر کیا اثرات مرتب کرتی ہے؟

دوم، سوسائٹی میں ہلاکت گریز تصورات، رواج، پالیسیوں اور اداروں کی تاریخی بنیادیں کیا ہیں؟ ان کے موجودہ مظاہر اور مستقبل کے امکانات کیا ہیں؟ متشدد سیاسی حکومت کی غیر متشدد مزاحمت کا کیا ریکارڈ ہے؟ غیر مہلک سوسائٹی کو حقیقت بنانے کی جانب تخلیقیت اور تعمیری عمل کا کیا ریکارڈ ہے؟

نظم سیاست کے مطالعے کا تیسرا تقاضہ ہلاکت سے ہلاکت گریزی اور ہلاکت گریزی سے ہلاکت کی جانب تبدیلیوں کے عمل کے ریکارڈ کا جائزہ لینا ہے۔ اس نوعیت کی تبدیلی میں کون سی اہم شخصیات، گروپ اور تنظیمیں شامل رہی ہیں؟ کیا فوجی صلح جو بن گئے؟ کیا قاتل زندگی کا احترام کرنے والوں میں تبدیل ہو گئے؟ کیا متشدد انقلابیوں نے غیر متشدد سماجی تبدیلی

سے وابستگی اختیار کر لی؟ کیا مذہبی شخصیات نے ہلاکت آفرینی کی 'برکتوں' سے دستبرداری اختیار کر لی؟ کیا سماجی شخصیات نے تشدد کو قبول یا رد کرنے کے حوالے سے اپنے رجحانات تبدیل کئے ہیں؟

سزائے موت کے نفاذ، اس کے خاتمے یا اس کے دوبارہ نفاذ سے جرائم کی تعداد میں کیا کمی یا بیشی واقع ہوئی ہے؟ کیا فوجوں کو غیر فعال کیا گیا اور پھر بحال کیا گیا؟ کیا فوجوں کو ختم کر دیا گیا؟ کیا پولیس اور شہری غیر مسلح کیے جانے اور دوبارہ مسلح کیے جانے کے مرحلے سے گزرے؟ کیا سابقہ جانی دشمنوں کے درمیان حقیقی پُر امن مصالحت کے مواقع آئے جن کے بعد دوبارہ ہلاکت آفرینی پھوٹ پڑی؟ کیا تشدد کی حامی معیشتیں غیر متشدد فرد اور سماجی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کلی یا جزوی طور پر تبدیل ہوئیں؟

چہارم، نظم سیاست سے باہم وابستہ سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی عناصر کیا ہیں؟ اگر انہیں یکجا کر دیا جائے تو کیا اس کے نتیجے میں زندگی کے لئے ایک ہلاکت گریز سماج کی تشکیل کی بنیاد فراہم ہوسکتی ہے؟ اس سیاق و سباق میں ایک ہلاکت گریز سماج کے قیام میں مذہبوں، نظریات، قوانین، اداروں، پالیسیوں، فنون، بین نظم سیاست، تعلقات کی کون سی تبدیلیاں مددگار ثابت ہوسکتی ہیں؟ ہلاکت یا ہلاکت کے خطرے کی جانب مراجعت کے بغیر آزادی، مساوات، مادی فلاح اور سلامتی جیسی اقدار کے ارتقا میں کون سے حالات بہترین طریقے سے آسانیاں فراہم کر سکتے ہیں؟

تقابلی سیاست

ایک ہلاکت گریز عبور سے مراد ہے تقابلی سیاسی تحقیق وتفتیش کے مرکز پر غیر متشدد انسانی استعداد کا سوال اٹھانا۔ سوسائٹیوں کے اندر اور آر پار حکومتوں اور شہریوں کی جانب سے دھمکی کی موقوفی یا ہلاکت آفرین قوت کے استعمال سے متعلق تصورات، اداروں، ڈھانچوں، عملیوں اور پالیسیوں کے عالمی تقابل کے ذریعے کیا ادراکات حاصل ہو سکتے ہیں؟ ہلاکت گریز تجزیے کی منطق اور موثر قابلِ تغیر رواجات کی تلاش سے رہنمائی لے کر، تقابلی تحقیق وتفتیش واحد نظم سیاست سے ماورا متبادلات سے آگہی کی جستجو کرتی ہے۔

قتل کرنے یا قتل نہ کرنے کے رجحانات پر سوسائٹیوں کا تقابل اور اُن کی درجہ بندی ہوسکتی ہے جس طرح جمہوری اداروں، انسانی حقوق، خواتین کی حیثیت، بچوں کی بہبود اور معاشی ترقی کی سطحوں کے لیے کیا گیا ہے۔ حکومتی کارندوں اور ریاستی مخالفین کے ذریعے ہلاکتیں، مجرمانہ غارت گری، شہری قتل اور خودکشی، دیگر سوسائٹیوں کے ارکان کے corss-state قتل، قتل کرنے کی پیشہ ورانہ تربیت، ٹیکنالوجیکل استعداد، اور ہلاکت آفرینی کی سیاسی معاشیات کے مادی مظہرات، ہلاکت آفرینی کے اقدامات میں شامل ہیں۔ واحد نظم سیاست کے تجزیے سے اخذ کردہ ہلاکت گریز خاصیتوں کی متوازی درجہ بندی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔ قاتل قوموں اور ہلاکت گریز قوموں کی میعادی تقابلی درجہ بندیوں کو عالمی سیاسی سائنس کی عوامی خدمت کا حصہ ہونا چاہیے۔ ہلاکت آفرینی کی بڑھتی اور

گھٹتی سطحوں اور غیر متشدد قابلِ تغیر استعداد کی نمو یا عدم نمو کی رپورٹوں کو عالمی اسٹاک مارکیٹوں یا کھیلوں کے نتائج کے روزمرہ مشاہدوں کے مقابلے میں کم اہم نہیں سمجھنا چاہیے۔

انتہائی یکساں یا کمترین یکساں حالات کے تحت سوسائٹی کے اجزا کے متضاد نظم سیاست نیز درونِ نظم سیاست کا موازنہ، غیر رسمی اور قابلِ تغیر آگہی میں مدد دینے کے لیے ضروری ہے۔ ان میں مذاہب، نظریات، فنون، جماعتوں، جنس، عصری گروہوں، تعلیمی سطحوں، طبقات، نسلی گروہوں، معاشی انٹرپرائز، یونیورسٹیوں اور پیشوں کے ہلاکت آفریں اور غیر متشدد رجحانات شامل ہیں۔

ہلاکت گریز تقابلی مطالعہ ہم عصر سیاسی سائنس کے اس نظریے کو ترقی دینے کے لیے ضروری ہے کہ استبدادی حکومتوں کے مقابلے میں جمہوری ریاستیں ایک دوسرے سے جنگ نہیں کرتیں اور اپنے شہریوں کو کم سے کم ہلاک کرتی ہیں۔ وہ ساخت میں صدارتی خواہ پارلیمانی ہوں، روشن خیال جمہوریتوں کے اندر اور ان کے ذریعے ہلاکتوں کی برقراری کے ساتھ ساتھ تشدد کی عیاں ثقافتوں سے ہلاکت گریز ساختیاتی اور ثقافتی متبادلات کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر، جیسا باب دوئم میں بتایا گیا ہے، تشدد میں اعلیٰ اور ادنیٰ درجے کے حامل لیکن سماجی معاشی حالات میں یکساں، میکسیکو کے دو دیہاتوں کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوا کہ ثقافتی تصورِ ذات (self image) اُن کی امتیازی خصوصیت ہوسکتا ہے۔ متشدد دیہاتیوں نے خود کو تشدد پر مائل پایا اور اُسے قبول کرلیا۔ غیر متشدد دیہاتیوں نے خود کو پُر امن تصور کیا اور اس پر فخر کیا (فرائی 1994ء)۔ انڈونیشیا کے دو دیہاتوں میں

بچوں کے کھیل کے تقابلی مطالعہ، تشدد میں ایک بلند اور ایک کم تر، سے معلوم ہوا کہ زیادہ متشدد ثقافت انسانوں اور جانوروں کی لڑائیوں کے کھیل کی حامی تھی۔ کم تعداد متشدد و ثقافت انبساطی کھیلوں میں دلچسپی رکھتی ہے، جیسے جھولا جھولنا، اور بالغوں اور جانوروں کے رویوں کی پُرامن نقالی کرنا (رائس 1980ء)۔ یہ نتائج متشدد ثقافت اور باکسنگ، ہاکی، ریسلنگ اور امریکی فٹبال جیسے مسابقتی کھیلوں کے درمیان تعلق کو دیکھنے اور سمجھنے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔

بین الاقوامی سیاست

ہلاکت گریزی کی جانب تبدیلی، بین الاقوامی سیاسیات، بین الاقوامی تعلقات کے حوالے سے اجتماعی اور انفرادی طور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ یہ مصالحانہ اداروں کے لیے رواجی دلچسپی کے ساتھ اجمالی اور خورد بینی تحقیقات کو یکجا کرتی ہے۔ ایک جانب، عالمی نظم سیاست کے اجزا (ریاستی یا غیر ریاستی)، ان کے درمیان تعلقات کے ڈھانچے اور حلِ مسئلہ کے عملیوں کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔ اسکا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اہم تاریخ سے غیر متعلق یا سیاق وسباق سے گریز پا ہو جائیں۔ تاریخ کا تعلق بنی نوع انسان سے ہے۔ سیاق وسباق عالمی اور مقامی حالات کے درمیان باہمی اثر اندازی کا نمونہ ہے۔

دوسری جانب، ایک ہلاکت گریز سماج کی تسلیم کردہ عمل پذیری ہر اس فرد کی بہبود پر

توجہ کی طالب ہے جو پیدائش سے موت تک کرۂ ارض پر زندگی گزارتا ہے جس طرح نسلیں آتی ہیں، آپس میں میل ملاپ کرتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ ہلاکت گریز سیاسی تجزیے کی بنیادی اکائی واحد انسان ہے۔ تنظیمیں، ڈھانچے، اور طریق عمل انفرادی رجحان کے میزان کی پیداوار ہیں۔ عالمی سیاست افراد کی عالمی سیاست ہے۔ ایک ہلاکت گریز عالمی سماج قتل نہ کرنے والے افراد پر منحصر ہے۔ اگر کوئی شخص قتل کرنے یا قتل ہونے والا نہ ہو تو تمام انسانوں کے مفادات کا خیال رکھا جانا چاہیے۔

اس سے مراد ہے مجموعی طور پر عالم انسانیت پر ہلاکت گریز تجزیے اور عمل کی منطق کا اطلاق ضروری ہے۔ تشدد کے ضمن میں اس کا مطلب ریاستی تشدد، ریاست مخالف تشدد، اور جنگ جس میں سماجوں کے اندر اور اُن کے درمیان ہلاکت آفرینی کی تمام اقسام شامل ہیں ۔۔۔ ان پر ریسرچ کی علمِ سیاسیات کی روایات کا دائرہ وسیع کرنا اور عمومی تفہیم کے عالمی نمونوں میں انہیں جمع کرنا ہے۔ عدم تشدد کے حوالے سے، مراد ہے عالمی پیمانے پر سیاسی وجود کے اندر اور آر پار ہلاکت گریز قوتوں کی نشاندہی کرنا۔ غیر متشدد قلب ماہیت کے تعلق سے اس کے معنی ہیں عالمی عمومی نظاموں کے سیاق و سباق میں سوسائٹیوں کے اندر اور آر پار ہلاکت انگیز اور ہلاکت گریز قوتوں کے درمیان باہمی اثر اندازی کے طریقِ عمل کو سمجھنا۔

ایک ہلاکت گریز عالمی سماج کے عملی، امکانی، اور مطلوبہ خدوخال کی جامع آگہی کے لیے، مجموعی طور سے ہلاکت گریزی کے اندر نظری طور پر لامحدود بدلی ہوئی شکلیں اخذ کرتے

ہوئے، ماضی اور حال کے سماجی مظاہر اور امنگوں میں تحقیقات کی ضرورت ہے۔ انفرادی سطح پر، اس کا مطلب ہے افراد کی متشدد اور غیر متشدد میلانات، ان کی غیر متشدد قلبِ ماہیت کی حرکیات، اور اختراعی فرد کے ہلاکت گریز امکان کے طویل المدت اظہار کی مددگار سماجی سیاق وسباق کی خصوصیات کو سمجھنا۔

ہلاکت آفرینی کی قیف کی غیر ہلاکت آفرین متبادلات کے ایک بادگرد میں تبدیل کرنے کے اطلاقی سمت بندی میں، ایک عالمی مظہر سے مراد ہے دبی ہوئی ہلاکت آفریں رواجوں کے جانشین کلیتی ہلاکتی منطقہ کی مداخلت۔ اس کا مطلب ہے عالمی سماج کاری میں مدد دینا اور ہلاکت گریز حل مسئلہ کے لیے قیادت اور شہری کی تربیت۔ اس کا مطلب ہلاکت گریز تبدیلی کے لئے عالمی ثقافتی شراکتوں کی نشاندہی اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ اور اس سے مراد ہے ہلاکت آفرینی کے حامی سیاسی، فوجی، معاشی، سماجی، اور ثقافتی ڈھانچوں میں غیر متشدد عالمی تبدیلیوں کو سمجھنا اور ان کی مدد کرنا۔

ہلاکت گریز علمِ سیاسیات

یہ مفروضہ کہ انسان ہلاکت سے پاک سوسائٹی تخلیق کرنے کا اہل ہے ابتدائی طور پر موجودہ علمِ سیاسیات کے ہر گوشے، ذیلی گوشے اور پہلو کے بارے میں سوالات کو جنم دیتا ہے۔ یہ فرض کرنا کہ سیاسی سائنس، اقدار سے مبرا نہیں ہوسکتی، کیا ہلاکت گریزی ایک قابلِ

قبول انضباطی قدر ہے؟ کیا ہلاکت گریز سیاسی قوت کا نظریہ اور عمل ،متشدد ادراکات اور مظاہر کے خلاف جدوجہد کرتا اور ان کو تبدیل کرسکتا ہے۔ کیا مقامی اور عالمی ہلاکت گریز طور پر جمہوری ادارے ممکن ہیں؟ کیا متشدد قومی سلامتی سے غیر متشدد قومی اور عالمی سلامتی تک عبور حاصل کیا جاسکتا ہے؟ کیا متشدد سیاسی معیشتوں سے غیر متشدد عالمی سیاسی معاشیات تک عبور ممکن ہے؟ کیا تحریک نسواں ،قبیلہ، طبقہ، علاقائیت، زبان اور مذہب جیسے تناظر سے ہلاکت گریز نظریے اور عمل کی مدد کی جاسکتی ہے؟ اور معاشرتی تشدد، غیر متشدد امکانات، تقلیبی عملیوں اور مستحکم لیکن اختراعی طور پر متنوع ہلاکت گریز ماحصل کی اجمالی فہم کے لیے کون سی ضابطہ بندیاں انتہائی مناسب ہیں؟

ان سوالات کا محض یہ مقصد نہیں ہے کہ تمام شعبوں میں سیاسیات کی عدم شراکت کی نشاندہی کی جائے۔ بلکہ یہ اس بارے میں سوچنے کی دعوت ہے کہ اگر اس نے ایک ہلاکت گریز دنیا میں ہلاکت گریز سماجوں کو حقیقت کا روپ دینے کے امکان کو انتہائی سنجیدگی سے اپنالیا تو سیاسی سائنس کیا شکل اختیار کرے گی۔ ایک ایسے امکان کی قبولیت کا مطلب غیر متشدد عالمی حل مسئلہ میں سیاسی سائنس کی سرگرم شرکت ہے۔

☆☆☆☆☆

چوتھا باب

مسئلہ کے حل کے مضمرات

وہ تمام لوگ جو [ناکافی خوراک اور معاشی محرومی سے کروڑوں اموات کی] اس عالمی تباہی کی مذمت اور مزاحمت کرتے ہیں اس رائے پر متفق ہیں کہ اس سانحے کی وجوہ سیاسی ہیں۔

53 نوبل انعام یافتگان کا منشور 1981ء

ہلاکت گریز سیاسیات مسئلے کا جو حل پیش کرتی ہے، اُس کے مضمرات کیا ہیں؟

اس کا مجموعی ہدف عالمی طرز حیات میں ہلاکت آفرینی کا خاتمہ کرنا ہے۔ اس سے مراد ہے ہر انسان کی عمر بھر کی فلاح کے لیے خصوصی دلچسپی رکھنا اور اسے امکانی طور پر شکار ہونے یا شکار کرنے کی صورتحال سے محفوظ رکھنا۔ یہ افراد میں دلچسپی لینا پیدا کرتی ہے اور سیاسیات میں تخلیقی مقصدیت کو فروغ دیتی ہے۔ دوسری جانب اس کا مطلب مسئلے کے ایسے حل میں مشغول ہونا ہے جو ہر روحانی، صنفی، عمر، نسلی، طبقاتی، پیشہ ورانہ، قومی یا سیاسی شناخت کو تسلیم کرتے ہوئے اُس سے ماورا ہوتا ہے۔ اس سے مراد کثیر الجہت وفاداریاں (گیوٹز کوف 1955) جنہیں ماورائے حدود پیمانِ وفا کے ساتھ یکجا کر کے مسائل کے حل کی راہ

تلاش کی جاتی ہے جس سے ہلاکت کی اعانت کے استعمال یا اس کی دھمکی کے بغیر سماج کے مجموعی تقاضے پورے ہو سکتے ہیں۔

ہلاکت گریز علم سیاسیات سے مراد یہ ہے کہ ہلاکت آفرینی کا سبب بننے والے عوامل کو کم اور عدم تشدد کے حامی عوامل کو تقویت دینے کا عزم اور عہد کیا جائے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ ہلاکت آفرینی کی اتصالی قیف کے تمام پانچ منطقوں (شکل نمبر 1) اور ہلاکت گریز متبادلات کے پنکھے (شکل نمبر 2) کے اندر اور مابین مسائل حل کرنے کی جستجو کی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسائل کو حل کرنے کی ذمہ داریوں میں علمِ سیاسیات کے پیشے کو کلی طور پر شامل کیا جائے اور بالواسطہ طور پر دوسروں کی کوششوں سے مدد حاصل کی جائے۔ اس عمل میں یہ بات بھی شامل ہے کہ تحقیق اور تربیت کے ذریعے عوامی اور انفرادی مسائل حل کرنے کے عمل کو تقویت پہنچائی جائے۔ اس کا مطلب یہ بھی کہ مسائل کے حل کے حوالے سے انفرادی اور سماجی سطح پر فیصلہ سازی کے عمل میں اشتراک پیدا کیا جائے۔

مسائل کے حل کے حوالے سے ہلاکت گریز علمِ سیاسیات کے کردار کو تسلیم کرنے کا مطلب علم کل، کلی صلاحیت، اور قدرتِ مطلقہ کے تصور کو قبول کرنا نہیں ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ سماجی زندگی کے تمام شعبوں مثلاً روحانی، جسمانی، مادی اور ثقافتی زندگی میں فلاح اور ترقی سے متعلق عمل کو آگے بڑھایا جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایسا کرنے کے عمل میں مطلق العنانی کا رویہ رکھتے ہوئے مداخلت کی جائے، بلکہ اس امر کو تسلیم کرنا ہے کہ وہ کون سی سیاسی شخصیات، ادارے، حکومتیں اور لوگ ہیں جو اس عمل میں مدد فراہم کر سکتے ہیں اور جن

کے ایسا کرنے یا نہ کرنے کی صورت میں معاشی بہتری کے ذریعے جسمانی بقاء اور اعلیٰ ترین انسانی امنگوں کے حوالے سے دوررس سماجی نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ ہلاکت گریز سماجوں کے فروغ کے لئے علمِ سیاسیات کو وسیع پیمانے پر اعانت اور کردار ادا کرنا چاہیے۔ اسے طب یا صحت عامہ کے پیشوں کی طرح خود کو محدود نہیں کر لینا چاہیے۔

مسائل کی حقیقی نوعیت اور مطلوب صورتحال کے درمیان ناموزونیت پائی جاتی ہے۔ مسائل کی تشریح اسی تناظر میں ہونی چاہیے۔ ہر مسئلہ پیچیدہ نوعیت کے ایسے ذیلی مسائل پر مشتمل ہوتا ہے جن کا معیاری (کیا ہونا چاہیے)، عملی (کیا ہے)، اور امکانی (کیا ہوسکتا ہے) حوالے سے تعین نہیں کیا جاسکتا۔ ہر مسئلہ، نظام سے متعلق پیچیدگیاں رکھتا ہے باہمی انحصار کی فیڈ بیک (باز افزائش) کے عمل، اور ماضی۔ حال۔ مستقبل کے زمانی اجزا مزید موجود ہوتے ہیں۔ لیکن نسلیاتی، فلسفیانہ یا عملی طور پر مسائل کیسے ہی مشکل اور پیچیدہ ہوں، ہلاکت گریز سیاسیات نوع انسانی کی بقا اور بہبود کے لیے خطرہ پیدا کرنے والے مسائل کے حل کی کوششوں میں صریح شرکت سے قطع تعلق نہیں کرتی۔ ہلاکت گریز سیاسیات کرداری تشدد کا خاتمہ کرنے، ساختیاتی تشدد کے حالات تبدیل کرنے، اور اُن دونوں کی باہمی اثر پذیری سے ابھرنے والے مسائل حل کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتی ہے۔ یہ ہلاکت آفرینی کی حمایت ختم کرنے، ہلاکت گریز خدمات کے موجودہ اداروں کی مدد کرنے اور نئی ہلاکت گریز پالیسیاں اور ادارے تخلیق کرنے کی جستجو کرتی ہے۔

علم سیاسیات کا اطلاقی سائنس، اطلاقی سماجی علوم اور مسائل کے حل کے حوالے سے

ایک کردار تسلیم کرتے ہوئے یہ سمجھنا کہ مسائل کے حل پیشگی معلوم ہوسکیں گے، ایک غیر منطقی بات ہوگی۔ یہ مفروضہ کہ امراض نا قابلِ علاج ہیں یا یہ کہ تشخیص، تجویز، اور علاج سے قبل دوا کا علم ہونا چاہیے بنیادی اور اطلاقی طبی سائنس میں ارتقا کو روکتا نہیں ہے۔ سیاسیات بھی جو بنیادی طور پر زندگی اور موت کا معاملہ ہے، اس سے مختلف نہیں ہوسکتی۔

یہ توقع کرنا عقلمندی نہیں کہ جو مسائل تشدد پسند سیاست اور سیاسیات حل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی، ہلاکت گریز سیاسیات ان کے فوری حل پیش کردے گی۔ تشدد کو تشدد کے ذریعے دبانے کے لیے بڑے پیمانے پر سائنسی، انسانی اور مادی وسائل کا استعمال کیا گیا لیکن اس کے نتیجے میں نا قابل یقین حد تک خونریزی ہوئی اور عالمی ہلاکت آفرینی ختم نہ ہوسکی، جنگ، نسل کشی، قتل اور ہلاکتوں کا سلسلہ جوہری طاقتوں کے دارالحکومتوں میں جاری رہا۔ ہلاکتوں کے لئے بے پناہ تخلیقی قوت وقف کی جاچکی ہے۔ ہلاکت گریز متبادلات کو عمل میں لانے کے لئے اتنی ہی زیادہ قوتِ اختراع درکار ہوگی۔

انسانی ہلاکت آفرینی کے عہد کو ختم کرنا، درحقیقت، صرف سیاسیات کا مقصود نہیں ہے۔ اس میں تمام سائنسی علوم، سماجی علوم، پیشے اور افراد شریک ہیں۔ لیکن یہ ایسا مقصد ہے جس میں علم سیاسیات پیش قدمیاں کرسکتی ہے نیز دوسروں کی پہل کاری میں مدد کرسکتی ہے۔ ترجیحی طور پر ایسے خوفناک مسائل کو حل کرنا ضروری ہے جو ہلاکت گریز علم سیاسیات کی تخلیق کے امکانات کی نفی کرتے ہیں جس کے ذریعے ایک ہلاکت گریز دنیا کا وجود عمل میں آسکتا ہے۔ ان مسائل کی تین عمومی قسمیں ہیں: ہٹلر اور تباہ کاری، انقلابی ساختیاتی تبدیلی، اور فرد

سے قومی ریاست تک کی سلامتی کے مسائل۔

ہلاکت گریزی، ہٹلر اور قتلِ عام

سیاسی قیادت اور ہلاکت آفرینی کے مسئلے کی ایک مثال ہٹلر اور عالمگیر تباہی ہے لیکن یہ مظہر صرف اس مثال تک محدود نہیں ہے۔ اس مسئلے کا براہ راست مقابلہ کرنا ہوگا اور اطلاقی سائنس کے ذریعے مسائل کے حل کی خاطر بنیادی اور پائیدار کوششیں عمل میں لانی ہوں گی۔ نسل کشی، جارحیت، بڑے پیمانے پر طبقاتی بیخ کنی اور شہری بربادی کی ہولناک مثالوں کو ہلاکت گریز سائنسی تخلیقیت کو مفلوج کرنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہئے۔ بصورت دیگر، ظاہری یا باطنی طور پر علم سیاسیات اس خونریزی اور سفاکی کا مقابلہ کرنے میں ہمیشہ کے لئے ناکام ہو جائے گی جو اس نسل کش آمر، انقلابی طبقے کے تباہ کار یا شہروں اور دیہاتوں کو تقدس کے نام پر تباہ کرنے والوں کے تشدد کے مقابلے میں کہیں بڑی ہوگی۔

ابتدا کرنے کا عملی طریقہ یہ ہے کہ سیاسی قیادت کی تعلیم کے موجودہ پس ماندہ شعبے میں بینِ الکلیاتی کام کو تیز کیا جائے۔ اس کا مطلب ہلاکت آفرینی پر مائل کردار اور نظام کی تغیر پذیریوں کی شناخت کرنا اور ایسی تبدیلیاں عمل میں لانا ہے جس کے ذریعے ہلاکت گریز قیادت اور اس کے پیروکار وجود میں آسکیں۔ اس ضمن میں چند با مقصد اور ہلاکت گریز تغیر پذیریوں کی نشاندہی پہلے کی جا چکی ہے۔ ان میں قیادت کے تشدد پر مائل تصورات، شخصیت

کے طرزِ عمل کی شرائطِ اولین؛ کرداری قوتیں؛ تنظیمی معاونتیں؛ توقعاتِ کار ہدف یا نمایاں قدری خصوصیات؛ ٹیکنالوجیکل صلاحیتیں؛ اور قتل کے لیے معاشی، سماجی اور ثقافتی کمک رسانی شامل ہے (پیج 1977ء)۔

بیسویں صدی کا تجربہ انحراف کے کچھ نکات تجویز کرتا ہے۔ ہلاکت پر مائل پیروکاروں کے حمایت یافتہ ہلاکت پر مائل رہنماؤں کے متعلقہ ابھار کو روکنے کے لیے، تاریخ کے بعض مرحلوں پر انسانوں کو چاہیے کہ وہ واضح طور پر قتل کرنے سے انکار کر دیں اور جو نظام قتل کرتے ہیں ان سے تعاون سے انکار کر دیں۔ بصورتِ دیگر کینہ پرور مغلوب اور زخمی فاتحین کے درمیان ہلاکت آفرینی کا چکر چلتا رہے گا۔ یہ سادہ پرکار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ماضی پر نظر ڈالنے اور بیسویں صدی کی سنگدلیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اواخر انیسویں صدی میں امن کے حامی جنہوں نے جنگ کے خاتمے کی خواہش کی تھی وہ بالکل درست تھے۔ جنگِ عظیم اول سے جنگِ عظیم دوم تک، جنگ عظیم دوم سے سرد جنگ تک اور اس سے بھی آگے کی سنگدلیوں کے درمیان واضح ربط ہے۔ ایک امتناعی سیاسیات کا فریضہ یہ ہے کہ اس سے پیشتر کہ انتقامی دشمنیاں چاہے حالیہ ہوں یا قدیم، سنگدلی کا رنگ اختیار کر لیں، وہ ان کی شناخت کرے اور مفاہمت کرنے میں مدد کرے۔ دشمنوں کی منتقمانہ تباہی کا جشن منانے والے رہنماؤں اور ان کے پیروکاروں کے ابھار کو روکنے کے لیے، علمِ سیاسیات کو ہلاکتوں کے روکنے، کینہ پروروں میں مفاہمت پیدا کرنے اور ہلاکت گریز زندگی کے حالات پیدا کرنے کا واضح عہد کرنا چاہیے۔

ممکنہ ہٹلروں، اسٹالنوں، ماؤوں، امینوں، پول پاٹوں، یا جوہری بم مارنے والے ٹرومینوں کو ابھرنے سے روکنے کے لئے ضروری ہے کہ سیاسی قیادت کی تعریف ازسرنو متعین کی جائے جس کے تحت ہلاکت آفریں کمانڈر کے بجائے ایسی ہلاکت گریز سیاسی قیادت کا تصور سامنے آئے جو سماجی مسائل کے حل میں آسانی فراہم کر سکے؛ ازسرنو تعریف کے مطابق قیادتیں جارحانہ، تشدد پر مائل شخصیت کے حامل رہنمائی کے آرزومندوں کی قبل از وقت شناخت اور ان کی حمایت سے دستبرداری کی جستجو کریں؛ رہنمایانہ کردار کے فرائض سے ہلاک کرنے پر آمادگی کے امکانات اور دوسروں کو ہلاکت کا حکم دینے کا اختیار ختم کریں؛ رہنماؤں کو فرمانبرداری کی پابند اور افزوں انداز میں ہلاکت آفریں ہتھیاروں سے مسلح پیشہ ور قاتل تنظیمیں مہیا نہ کی جائیں؛ قتل پر مائل تنظیموں کی مذہبی، کاروباری، مشقتی، سائنسی اور فن کارانہ مدد سے دستبرداری اختیار کریں اور ہلاکت گریز متبادلات سے وابستگی اختیار کریں؛ تنازعے کا حاجت روائی پر مبنی حل پیش کرنا، سیاسی رہنماؤں اور شہریوں کا متوقع ابتدائی فریضہ ہونا چاہیے؛ قومی فخر اور شناخت کے ایک بنیادی جز کے طور پر عدم ہلاکت کی قدر سے وابستگی کا ادعا کریں؛ کسی گروپ کی ایسی تشریح کو مسترد کر دیں جو انسانی معیار سے پست ہو یا اتنی بُری ہو جو استیصال کو جائز قرار دے؛ باہمی بہبود کے لیے گروپوں کے درمیان مساوی مکالمے کی جستجو کریں؛ تشدد کے ذریعے تسکین کے طالب افراد یا گروپ براہ راست یا بالواسطہ جن سماجی، معاشیاتی اور دیگر ساختیاتی حالات کی جانب مائل ہوتے ہیں انہیں تبدیل کریں؛ ہلاکت کی معاشیات کو بدل کر زندگی کا اثبات کرنے والے انسانی تقاضوں کا خادم بنا دیں؛

اورفنون اورعلوم کے ذریعے ہلاکت گریز ثقافتوں کی تخلیق میں مدد کریں۔

غیر ہلاکتی اطلاقی تخلیقیت کے سامنے ہلاکتی زون کی مداخلتیں، ہٹلر جیسی سفاکیوں سے کہیں زیادہ بڑا چیلنج ہیں۔ یہ ٹیکنالوجی کی ترقی کا ایک بے مثال دور ہے لہٰذا یہ مداخلتیں ناقابل تصور نہیں ہیں۔ مسئلے کے حل کی خاطر رہنما اور اُن کے پیروکار، روحانی اور نفسیاتی، غیر ہلاکتی صلاحیتیں اور مزاحمت جیسے نہ نظر آنے والے اور کمیتی ابھار کے تناظر میں ادعائی اقدامات پر غور کرنا اور انہیں آزمانا ہوگا۔ قتل کرنے (جو صرف متاثرین کی ذمہ داری نہیں ہے) کی عالمی سطح پر مزاحمت، اُس کی حمایت سے دستبرداری اور مزاحمت: تیز رفتار انخلا کے ضابطے؛ جدید ترین ٹیکنالوجی سے لیس خلائی، فضائی، بحری اور زمینی ذرائع سے مدافعت کرنے والی افواج، اور قتل کرنے والے آزاد گروپوں اور ٹیکنالوجی کو ناکارہ بنانے جیسے اقدامات کرنے ہوں گے۔ ہلاکت آفرینی کے ذرائع جن کو روکنے کی نشاندہی ہو چکی ہے ان پر، براہ راست، کثیر الطرفہ، منفی اور مثبت ہنگامی مداخلتی دباؤ کے لیے توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔

ہٹلر جیسی تباہ کاری کے بعد کے عرصے میں، زندہ بچ رہنے والے قاتلوں، متاثرین، اور رشتے داروں کے درمیان ہلاکت گریز انسانی صلاحیتوں کا تغیر پذیر اثبات تلاش کرنا چاہیے۔ سفاکی کی ذمہ داریوں، بحالی، مفاہمت کی شناخت کے لیے، اور انتہائی ضروری طور پر ایک ہلاکت گریز دنیا میں ہلاکت گریز سماجوں کے قیام کی حامی مزاحمتی اور ساختی تبدیلیوں کے طریق عمل کی تخلیق میں علم سیاسیات کو شریک ہونا چاہیے۔ روح، سائنس، اور روایت کے ہر ماخذ پر استنباط کرتے ہوئے ___ ہلاکت گریزی کو لوگوں کے درمیان مستقبل کی ثقافتی

شناخت اور فخر کے طور پر شہرت دینا چاہیے۔ اس امر کو یقینی بنانے کے لیے کہ ایسی سفاکیاں آئندہ کبھی واقع نہیں ہوں گی، عملی عہد و پیمان کیے جائیں۔

نسلی صفائی سے جنگ تک، وسیع سفاکیوں کے عہد کا خاتمہ کرنے کے لیے، علم سیاسیات کو اطلاقی سائنس کے تین فریضوں میں شریک ہونا چاہیے: تدارک، مداخلت، اور مابعد جراحتی ہلاکت گریز قلبِ ماہیت۔ اسے خود کو تخلیقی خدمت میں مزاحم اس رکاوٹ سے آزاد کرانا چاہئے جو اس روایتی تصور کی پیدا کردہ ہے کہ ہلاکت گریز اصولوں کے ذریعے اس نوع کی سفاکیوں کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا۔

ہلاکت گریزی اور متشدد انقلاب

مسئلے کے حل کی کوششوں کو بروئے کار لانے کے حوالے سے ایک دوسرا اہم مسئلہ متشدد انقلاب اور ردِّ انقلاب کا ہے۔ فوجی کارروائیاں جوابی کارروائیاں، دہشت گردی، جوابی دہشت گردی، گوریلا جنگ، اور وسیع پیمانے پر خانہ جنگی اس سے تعلق رکھتی ہیں۔ روایتی علمِ سیاسیات اس نوع کے انقلابات اور ان کے استبداد کو قبول کرتی ہے اور تشدد کے حوالے سے ابہام رکھتی ہے۔ اچھی حکومتوں کے خلاف نہیں بلکہ بری حکومتوں کے خلاف تشدد قابلِ ستائش ہے۔ برے انقلابیوں کے خلاف، نہ کہ اچھے انقلابیوں کے خلاف جوابی تشدد قابلِ قبول ہے۔ سیاسی تبدیلی لانے یا روکنے کے لیے دونوں صورتوں میں تشدد بظاہر ناقابلِ علاج اور

اکثر سیاسی زندگی کی قابلِ ستائش حقیقت ہے۔ مثال کے طور پر بعض امریکی اسکالروں کے درمیان معروف دلائل یہ رہے ہیں کہ معاشی اکابرین چونکہ جائیداد وحکومت سے پُر امن طور پر دست بردار نہیں ہوں گے لہٰذا انقلابی تشدد جائز ہے۔ تاہم، نجی جائیداد کے استحصال کے نظاموں کو تبدیل کرنے کی کوشش کرنے والے باغیوں کے خلاف دیگر اسکالر جوابی تشدد کی حمایت کرتے ہیں۔ امریکہ کی انتخابی جمہوریت میں بھی یہ خیال موجود ہے کہ فرد کو ہمیشہ انقلابی ہلاکت آفرینی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ بعض لوگوں کا اصرار ہے کہ ریاست کے مقابلے میں اپنی آزادی کے دفاع کے لئے شہریوں کو ہتھیار رکھنا چاہئے۔

لیکن استبدادی سیاسی حکومتوں اور سماجی معاشی ساختی تشدد کی ناروا حالتوں کو تبدیل کرنے کے تقاضوں کو تسلیم کرتے ہوئے، ہلاکت گریز علم سیاسیات غیر متشدد انقلابی متبادلات کی شناخت میں تعاون کرسکتی ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ اس مفروضے کو چیلنج کیا جائے کہ انقلابات لازمی طور پر متشدد ہونے چاہئیں اور موثر غیر متشدد متبادلات کا شعور مہیا کرنے کی ضرورت ہے جن میں اصول، حکمت عملیاں، فنی چالیں، تنظیمی طریقے، اور نفاذی مہارتیں شامل ہیں۔

سرد جنگ کے آخری نصف حصے میں، امریکہ، سوویت یونین اور چین سے متعلق دنیا کی تین سب سے بااثر متشدد انقلابی روایات کے تناظر میں سیاسی نظریہ دانوں کی جانب سے غیر متشدد انقلاب کے امکان کے تین نمایاں تصورات سامنے آئے۔ امریکہ میں جین شارپ نے (1973) غیر متشدد سیاسی انقلابات کے نظریے اور عمل کا ایک مثالی تصور پیش کیا جس

میں سیاسی طاقت کے مراکز کا گہرا تجزیہ کیا گیا تھا اور وسیع تر تاریخی تناظر میں موثر غیر متشدد جدوجہد کی مثالیں پیش کی گئی تھیں۔ شارپ نے غیر متشدد اقدامات کے تقریباً 198 طریقوں کی نشاندہی کی ہے جس میں سماجی، معاشی، اور سیاسی عدم تعاون کے ذریعے احتجاج اور ترغیب سے لے کر براہ راست غیر متشدد مداخلت تک کے اقدامات شامل ہیں۔ اس کے بعد اس نے ''تغیر، مطابقت پذیری، اور مزاحمت'' کے طریق عمل کو شامل کرتے ہوئے تمام طریقوں کو غیر متشدد قلب ماہیت کے ایک حرکی نظریے میں مربوط کرنا شروع کیا اور بعدازاں اس میں ''ٹوٹ پھوٹ'' کے عنصر کا اضافہ کر دیا۔ سوویت یونین میں، ای جی پل ماک اور وائی ایف کریاکن (1979ء) نے انقلاب کی یہ تشریح کی کہ یہ ریاستی اقتدار کی ایک طبقے سے دوسرے طبقے کو منتقلی ہے جو ''عوام کی وسیع تعداد کی زندگی میں تیز رفتار تبدیلی'' پیدا کرتی ہے۔ بعدازاں انہوں نے مارکسی۔لیننی نظریے اور مابعد جنگ عظیم دوم کے نوآبادیت سے آزادی اور جمہوری تجربے کی بنیاد پر دلیل پیش کی کہ پُرامن اشتراکی انقلابات ممکن ہیں۔ انہوں نے ''مسلح جدوجہد، خانہ جنگی، اور مسلح ردِ انقلابی مداخلت سے پاک'' ایک پُرامن اشتراکی انقلاب کی توضیح پیش کی ہے۔ اُن کی دلیل کے مطابق جدید تاریخی حالات میں ماضی کی ناکامیوں سے پُرامن انقلابات کی کوششوں میں رکاوٹ نہیں پڑنا چاہیے، انہوں نے اصرار کیا کہ ''پُرامن انقلابی ارتقا'' کے امکانات کی ''..... ہر پہلو سے احتیاط پسندی اور معروضیت کے ساتھ تحقیق ہونا چاہیے''۔ چین میں، ژانگ پی پنگ (1981ء: 79)، مارکسی نظریے اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں قومی آزادیوں کی کامیاب غیر متشدد جدوجہد__ خصوصاً

ہندوستان میں گاندھی کی تحریک کی ظاہر کردہ عظیم عوامی ابھار پیدا کرنے کی صلاحیتوں پر ___ اپنی بحث کی بنیاد رکھتے ہوئے دلیل پیش کرتا ہے: ''وہ طرزِ فکر جو یک طرفہ طور پر وقت، مقام، اور حالات کا خیال کیے بغیر پُرتشدد انقلاب کی وکالت کرتی ہے، اور غیر متشدد انقلاب کو ناپسند کرتی ہے نظری طور پر غلط اور عملی طور پر نقصان دہ ہے۔'' اس طرح پیچیدہ عالمی انقلابی اور ردِ انقلابی خونریزی کے عہد میں، تین پُرتشدد روایات سے ابھرنے والے سیاسی تجزیہ کاروں نے ___ آزادانہ اور بہ ظاہر ایک دوسرے سے ناواقف ___ غیر متشدد انقلابی نظریے اور عمل کے حوالے سے کام کو آگے بڑھانے کے لئے سائنسی بنیاد فراہم کردی ہے۔ ان کے درمیان ایک قابلِ توجہ مشترک عنصر ہندوستان میں گاندھی کی غیر متشدد تحریک تھی جس کا مقصد نہ صرف سیاسی آزادی بلکہ سماجی معاشی اور ثقافتی تبدیلی بھی تھا۔

اس وقت تک غیر متشدد انقلابی نظریہ چاہے وہ ''سرمایہ دارانہ'' نقطۂ نظر سے ہو یا ''اشتراکی'' بڑی حد تک مظلوموں کے تناظر میں تشکیل دیا گیا ہے۔ غیر متشدد انقلابی عمل کو تشدد کے ذریعے کچلنے کے خلاف غیر متشدد اشرافیہ کے جوابی عمل پر مبنی ہم پلہ نظریات تشکیل نہیں پاسکے ہیں بلکہ اس کی جگہ شارپ کے تجزیے کا استرداد پیش کیا گیا ہے۔ کیا دولت مند جائیداد رکھنے والے، نسلی بالادست، سیاسی رہنما، پولیس، اور فوج ___ ان غریبوں، زمینوں سے محروم، مجبوروں، اقلیتوں یا اکثریتوں کا ___ غیر متشدد اور غیر مسلح طور پر مقابلہ کرنے کا نظریہ اور ہمت رکھتے ہیں جو اپنے انسانی حقوق اور معاشی انصاف کے مطالبات کو غیر متشدد انداز میں حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ کیا مراعات یافتہ لوگ، تبدیلی، مفاہمت اور خونریزی کے بغیر مزاحمت کی

جستجو کے عمل میں توقیر اور قدر شناسی کے لیے اپنے جوابی دعوے پیش کر سکتے ہیں؟

مزید براں، ''غیر متشدد کشمکش'' یا ''غیر متشدد طبقاتی کشمکش'' کے اطلاقی نظریے سے سابقہ استبدادی اور مراعات یافتہ اور استبداد کے شکار اور غیر مراعات یافتہ طبقات کے باہمی تعلقات میں تسلی بخش تبدیلی قرین قیاس نظر آتی ہے۔ انسانی فطرت میں موجود ہلاکت گریز عناصر کو بیدار کر کے ایسا کرنا ممکن ہے۔ پُر امن تبدیلیوں کے حامیوں کے خلاف تشدد پسند اشرافیہ اور ان کے تشدد پسند حریفوں کی جانب سے استبدادی دشمنی ظاہر کرنے والوں پر اس کا اطلاق کر کے یہ نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ہر جنگجو، غیر متشدد عمل کے حامیوں کو اس لیے کچلنا چاہتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس طرح کے تصورات اس کے حامی طبقات پر اثر انداز ہو سکتے ہیں جس کے نتیجے میں ان کی جنگجویانہ حمایت کا دائرہ اثر کمزور ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، سرد جنگ کی محاذ آرائی کے دوران امریکی اور سوویت اشرافیہ اور میڈیا دونوں امن پسند آوازوں کو بے اثر کرنے یا ان کا گلا گھونٹنے میں تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے تھے، اور جواز یہ پیش کرتے تھے کہ ہلاکت گریز تصورات قبولیت حاصل کر لیں گے اور ان کے دشمن کو کمزور کرنے کے بجائے خود ان کی عسکریت پسندی کو حاصل حمایت کی بیخ کنی کر دیں گے۔ اسی طرح مسلح مزاحمتی تحریکوں کے حامی نظریہ داں اور سرگرم عمل افراد مظلوموں کے درمیان ہلاکت گریز متبادلات کی مقبولیت کے خوف کے سبب غیر متشدد انقلابی متبادلات کی تحقیق کی مذمت میں تیزی دکھاتے ہیں۔ اس طرح اگر ظالموں اور مظلوموں دونوں کے اندر ہلاکت گریز اصولوں اور رواجوں کے لیے قبولیت پائی جاتی ہے تو ایک ہلاکت گریز طبقاتی جدوجہد

قابلِ تصور ہے۔اس سے مراد مسئلے کے ہلاکت گریز انقلابی حل کے عمل کو آسانی فراہم کرنے کے لیے علم سیاسیات کا ایک اطلاقی کردار ہے۔سماجی تبدیلی کے لیے غیر متشدد کشمکش کے ہر مرحلے پر مخالفین کے ساتھ ''مفاہمت'' کے حتمی نصب العین کے حصول کے لیے گاندھی اور کنگ کے اصول اور نظریات صحیح سمت اختیار کرنے کا ایک عملی رُخ مہیا کرتے ہیں۔حتیٰ کہ میکیاویلی تک یہ نظریہ پیش کر چکا ہے کہ سیاسی نظام میں ''استبداد سے آزادی'' یا اس کے بر عکس بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں ''بغیر خونریزی'' کے عمل میں لائی جاسکتی ہیں،اگر ''ریاست کو عظیم بنانے والے شہریوں کی عمومی تائید اور حمایت'' حاصل کر لی جائے (خطبات تیسری جلد، ساتواں باب)۔

ہلاکت گریزی اور سلامتی

ہلاکت گریز علم سیاسیات کو چاہیے کہ وہ انفرادی، مقامی، قومی اور بین الاقوامی سطحوں پر ہلاکت آفریں جارحیت کے مقابلے میں قابلِ اعتبار سلامتی کے متبادلات کی بہم رسانی کے مسائل حل کرے۔روایتی سلامتی کا نظریہ اور عمل حتمی طور پر ہلاکت آفرینی کے خوف سے اخذ کیا جاتا ہے: ''میں/ ہم تمہیں مکمل طور پر یقین دلاتے ہیں کہ میں/ ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔'' تاہم، ہلاکت گریز سلامتی مخالف اصول سے گریز اختیار کرتی ہے: ''میں/ ہم تمہیں پوری یقین دہانی کراتے ہیں کہ میں/ ہم تمہیں قتل نہیں کریں گے۔اور تم بھی اس امر کو مکمل طور پر یقینی

بناؤ کہ تم مجھے/ہمیں قتل نہیں کرو گے۔'' مختصراً،''ہمیں ایک دوسرے کو مکمل طور پر یقین دہانی کرانا چاہیے کہ ہم ہلاک نہیں کریں گے۔'' جب تک کوئی ایک شخص بھی انہیں قتل کرنے کا ارادہ رکھتا ہے کوئی بھی محفوظ نہیں ہے۔ ہلاکت آفریں ہنرمندی ہر ڈھال، بکتر بند، خندقوں، دیواروں، اور قلعوں سے ایٹم بموں کی پناہ تک ہر نوع کے دفاع پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ جارحانہ ہلاکت آفرینی، ہلاکت آفریں دفاع کی ہر قسم پر حاوی آ جاتی ہے مثلاً برچھیوں پر تیر، توڑے دار بندوق پر مشین گن، پیدل فوج پر توپ بردار فوج، گھڑ سوار فوج پر ٹینک، ٹینکوں پر راکٹ، جنگی جہازوں پر آبدوزیں، فضائی اور میزائل فورسز تقریباً ہر شے پر، جوہری، جراثیمی، اور کیمیائی ہتھیار تمام ہتھیاروں پر۔ بندوقوں سے بھرے ہوئے بکتر بند گھر میں رہائش سلامتی کی ضامن نہیں: مداخلت کار کے پاس بکتر شکن میزائل، بھاری توپ خانہ اور زیادہ بڑی لڑاکا مہارت ہوسکتی ہے ___ یا واضح طور پر ہوا، خوراک یا فراہمیِ آب کو زہریلا بنانے کی صلاحیت۔ واحد یقینی سلامتی قتل کرنے کے عزم کی عدم موجودگی ہے۔

غیر ہلاکت آفریں سلامتی تک پہنچنے کے عبوری مرحلے میں علم سیاسیات کا کردار یہ ہے کہ وہ ہلاکت آفریں قوت کی دھمکی یا اس کے استعمال کے خلاف نظریے اور عمل کے قابل اعتماد متبادلات کی تشکیل میں مدد فراہم کرے جس میں امکانی مخالفوں کے درمیان قتل کرنے کے عزم کی غیر ہلاکت آفریں قلبِ ماہیت بھی شامل ہے۔ گو کہ آج تک روایتی علم سیاسیات میں نمایاں نہیں ہے تاہم ادب اور تجربے کا روز افزوں ذخیرہ وہ بنیاد فراہم کرتا ہے جہاں سے آگے بڑھا جاسکتا ہے۔ نازی نسل کشی کی شہری مزاحمت میں تحقیق و تفتیش (ہیلی 1979ء؛

فوگل مین 1994ء؛ سیملین 1994ء)؛ مافیائی جرائم کے خلاف ڈونیلو ڈولسی کی غیر متشدد کمیونٹی مزاحمت (اماٹو 1979ء؛ چودھری 1998ء)؛ انسانی حقوق کے کارکنوں کے لیے غیر مسلح محافظین (مہونی اور ایگورین 1997ء)؛ فوجی بغاوتوں کے خلاف غیر متشدد مزاحمت (رابرٹس 1975ء؛ شارپ 1990ء؛ 1993ء)؛ غیر متشدد قومی، شہری، معاشرتی دفاع (بوسرپ اور میک 1974ء؛ شارپ 1990؛ مارٹن و دیگر 1991ء؛ رینڈل 1993ء؛ بروز 1996ء)؛ روایتی مسلح افواج کے غیر ہلاکت آفریں استعمال (کیز 1982ء)؛ متبادل غیر متشدد قوتیں (بینرجی 2000ء؛ ویبر 1996ء؛ موزر۔ پوانگ سووان اور ویبر 2000ء)؛ اور غیر ہلاکت آفرین ہتھیاروں کا ارتقا (لیور اور شوفیلڈ 1997ء) کی تحقیقات اس چھان بین کا حصہ ہیں۔

ہر چند کہ روایتی فوجی وسائل کے تکملے کے طور پر، متعدد حکومتیں غیر متشدد شہری دفاع کی عمل پذیری کا جائزہ لے چکی ہیں۔ ان میں سویڈن، ناروے، ڈنمارک، نیدرلینڈز، فرانس، لٹویا، لتھوانیا، ایسٹونیا، آسٹریا، سوئٹزرلینڈ اور فن لینڈ شامل ہیں (شمڈ 1985ء؛ شارپ 1990ء؛ رینڈل 1994ء: 37-121)۔ تھائی لینڈ میں، وہاں کے 1997ء کے نئے آئین کے آرٹیکل 65 میں مستقبل کے فوجی انقلابوں کے خلاف قانونی طور پر غیر متشدد مزاحمت کے حوالے سے ایک منفرد، شفعی شق شامل کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''عوام کو حق حاصل ہے کہ وہ اقتدار پر قبضہ کرنے کے ایسے کسی بھی اقدام کی پرامن طور پر مخالفت کریں جس کی آئین میں صراحت نہ کی گئی ہو۔''

پولیس اور فوج کے استعمال کے لیے غیر ہلاکت آفرین ہتھیاروں پر تقریباً 1965ء سے امریکہ میں ریسرچ شروع کی گئی اور 1990ء کی دہائی میں اس میں تیز رفتاری آئی۔ لیزر، بصری، صوتیاتی، برقی مقناطیسی ارتعاش، کیمیائی، حیاتیاتی اور درجنوں دیگر ہتھیاروں سمیت وسیع پیمانے پر ٹیکنالوجیز دریافت کی جا چکی ہیں۔ بعض ٹیکنالوجیز پولیس میں اور سمندر پار فوجی کارروائیوں میں پہلے ہی استعمال کی جا چکی ہیں (لیور اور شوفیلڈ 1997ء)۔ سماجی دفاع میں حکومتی دلچسپی کی طرح، ہلاکت گریز ہتھیاروں میں دلچسپی کو آج کل روایتی ہلاکت آفرین صلاحیتوں کے خراج تحسین کے طور پر لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت کہ پُرتشدد سلامتی میں روایتی ماہرین ہلاکت گریز متبادلات کو سنجیدگی سے اپنا رہے ہیں، علم سیاسیات کے ذرائع اس سے کم سنجیدہ نہیں بلکہ زیادہ جدید جامع کوششوں کی ہمت افزائی کریں گے۔ مکمل طور پر ہلاکت گریز صورتحال کی جانب عملِ تغیر کے مسائل حل کرنے کا چیلنج درپیش ہے۔ غیر ہلاکت آفریں سلامتی کی جانب حرکت پذیری کا ایک مزید اشارہ جان لیوا تنازعہ کے تدارک پر کارنیگی کمیشن کی حتمی رپورٹ (1997ء) میں موجود ہے جس میں ''اسٹرکچرل تدارک یعنی جان لیوا تنازعہ کی بنیادی وجوہ دور کرنے کی حکمت عملیوں'' نیز ''تدارک کی ثقافت'' تخلیق کرنے کے لئے کہا گیا۔ ہلاکت گریز انفرادی اور عالمی سلامتی کی جانب مزید پیش قدمی کرنے کے امکان کو ظاہر کیا گیا ہے۔ ایک عالمگیر غیر متشدد امن فوج منظم کرنے کی تجویز اس کی ایک مثال ہے۔ (www.nonviolentpeaceforce.org)۔

ہلاکت گریز یعلم سیاسیات کو غیر متشدد سماجوں کے قیام میں اب تک ناقابلِ عبور سمجھی

جانے والی رکاوٹوں کے مسئلے کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ اسے جارحانہ جسمانی تشدد کے ذریعے نسلی معدومی کے راست خطروں پر قابو پانے کے لیے غیر معمولی توجہ دینی چاہیے۔ اول، اس لیے کہ زندہ رہے بغیر کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ دوم، اس لئے کہ ہلاکتوں سے مسلسل وابستگی ساختیاتی اور ماحولیاتی تشدد کے لیے معاون ثابت ہوتی ہے جن سے انفرادی، معاشرتی اور ارضی بہبود کے لیے خطرہ پیدا ہوتا ہے۔

معاشرتی مسئلے کے حل کے لیے عدم ہلاکت کو ایک طرز فکر کے طور پر سمجھنے سے مندرجہ ذیل سوالات سے سامنا ہوتا ہے: ہلاکت گریزی پر کیوں توجہ مرکوز کی جائے جبکہ جسمانی ہلاکت آفرینی کے مقابلے میں نفسیاتی بدسلوکی، جسمانی تشدد، نسل پرستی، جنس پرستی، معاشی استحصال اور آمریتیں زیادہ اذیت اور اموات کا باعث ہوتی ہیں؟ ان سوالات کے یہ معنی ہوئے کہ یہ مسائل صرف اس صورت میں حل کیے جاسکتے ہیں جب ہم قتل کرنے کا استحقاق برقرار رکھیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ عزم، استعداد، اور ہلاکت کی ثقافت، قتل کرنے والی سماجی معاشرتی ساختیاتی نا برابری اور وقتی طور پر قتل کے عمل کو روک دینے والی نفسیاتی بدسلوکیوں کی ایک اہم بنیادی وجہ ہے۔ اگر موت کا خوف اور موت کا خطرہ نہ ہو تو بدسلوکی، جسمانی تشدد، نسل پرستی، خواتین پر جبر و استبداد، معاشی استحصال اور آمریتیں کیسے قائم رہ سکتی ہیں؟ انسانی تجربے سے اگر قتل عمد سے جنگ تک، ہلاکت آفرینی کا خاتمہ ہو جائے تو روحانی، نفسیاتی، مادی، جمہوری اور ماحولیاتی سمیت نوع انساں کو درپیش دیگر مسائل کے حل ہونے میں معقول حد تک مدد ملے گی۔

ہلاکت گریزی سے وابستگی کا مطلب یہ ہے کہ انسانی بقا اور بہبود کے لیے خطرہ بننے والے ہر عہد کے مخصوص مسائل کے حل میں مدد کے لیے علمِ سیاسیات کو شامل کیا جائے ۔ دیہاتیوں سے گفتگو کرتے ہوئے، گاندھی اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیوں پر: اچھوتوں کے لیے مساوات؛ معاشی آزادی کے لیے سوتی کپڑے کی خود پر انحصار کرنے والی دھاگہ سازی؛ منشیات اور شراب سے پرہیز؛ ہندو مسلم دوستی؛ اور خواتین کی برابری جیسے مسائل کے حل کے اہم ترین فریضوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ کہتے تھے ''اور کلائی عدم تشدد ہے'' (ایش 1969ء: 243)۔ اس کی مطابقت میں ہم پانچ مسائل کو شامل کر سکتے ہیں جو آج عالمی طور پر نمایاں ہیں: جاری ہلاکتیں اور تخفیف اسلحہ کی ضرورت؛ افلاس کی تباہ کاری اور معاشی مساوات کی ضرورت؛ شرف انسانی کی خلاف ورزی اور انسانی حقوق کے باہمی احترام کی ضرورت: کرہِ ارض کی بربادی سے بچاؤ اور ارضی زندگی کے تحفظ کی ضرورت؛ اور دیگر نزاع انگیزی سے اجتناب جو مسئلے کے حل کے تعاون میں مزاحم ہوتی ہے۔

فرد، خاندان، برادری، قوم اور مجموعی طور پر پوری بنی نوع انسان کے لیے یہ پانچ مسائل مشترک ہیں۔ ہم سب کے لیے، قتل ہونے سے، معاشی محرومیوں سے، زہریلے ماحول سے اور شرف انسانی کی محرومی سے آزادی، ان اور دیگر مسائل کے حل میں ناکامی سے بچنے کی ضرورت ہے۔ یہ مسائل ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ان کے حل کے حوالے سے ہلاکت آفرینی پر مسلسل انحصار سے ان مسائل میں شدت پیدا ہوتی ہے۔ ہم قتل کرنے اور قتل کرنے کے لیے مسلح ہو کر سلامتی کی جستجو کرتے ہیں، اس طرح جوابی قتل کا خطرہ پیدا کرتے

ہیں؛ قتل کرنے کے لیے مسلح ہونا معاشی محرومی کا سبب بنتا ہے اور ساختی نابرابری کو تقویت دیتا ہے؛ اثباتِ دعویٰ میں ہلاک کرنا اور انسانی حقوق سے انکار کا گھاؤ گہرا ہوتا ہے اور بدلہ لینے کے کا رجحان فروغ پاتا ہے۔ ہلاکت آفریں جنگ اور فوجی صنعت کاری، ماحولیات کو تباہ کر دیتی ہے؛ مخاصمتی رہائشی علاقوں میں خوف زدہ کر دینے والی تقسیم کاری مسئلے کے حل کے درکار تعاون کی نشوونما کو روک دیتی ہے جو سب کے لیے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

مسئلے کے ہلاکت گریز حل کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ محض ہلاکتوں کی نفی اور مخالفت کی جائے بلکہ اس کے لیے درکار ضروری تبدیلی کے عمل میں شرکت بھی کی جائے۔ اس کا مطلب اور مفہوم یہ ہے کہ لگی لپٹی رکھے بغیر جنگ اور اس کے ہتھیاروں کے خاتمے، غربت کے خاتمے، انسانی حقوق اور فرائض کے غیر متشددانہ اظہار اور پائیدار ماحولیاتی نظام کے فروغ کی جدوجہد میں شرکت کی جائے نیز ان مسائل کے حل کے عمل میں شریک ہوا جائے جو انسانی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور جن کے ذریعے نہ صرف افراد بلکہ پوری بنی نوع انسان میں لامحدود تخلیقی امکانات اور جوہر بیدار ہوتے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ اس طرح کا ایجنڈا غیر عملی نظر آئے۔ لیکن یہ ایجنڈا چند انتہائی عملی تجربہ رکھنے والے اس عہد کے سیاسی، فوجی، معاشی، سائنسی، ثقافتی اور سول سوسائٹی کے رہنماؤں نے ورثے میں چھوڑا ہے (ایک جدید عالمگیر عہد میں قدیم انسانی فکرمندیوں کی بازگشت پیدا کرتے ہوئے)۔ ماہرین سیاسیات کو اس امر پر توجہ دینا انتہائی ضروری ہے کہ اقوام متحدہ یا دیگر تنظیموں کے زیر اہتمام منعقدہ مسئلے کے حل کے لیے ہونے والی ہر اہم کانفرنس دراصل دنیا

بھر کی قوموں سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ مطلوبہ تبدیلی لانے کے لیے ''سیاسی عزم'' پیدا کرنے میں مدد کریں۔ یہ اپیل نہ صرف حکومتوں بلکہ مسئلے کے حل کے لئے امداد باہمی کے عمل کے تمام ذرائع سے کی جاتی ہے: جن میں سیاسی جماعتیں، غیر سرکاری تنظیمیں، کارپوریشنیں، انجمنیں، یونیورسٹیاں، میڈیا، مذاہب اور فنون لطیفہ شامل ہیں۔ جوں جوں زندگی کو دہشت زدہ کرنے والے عالمگیر مسائل میں شدت پیدا ہوتی ہے اور عمل کرنے میں موجودہ ناکامی سے مستقبل کے تباہ کن اثرات کی آگہی بڑھتی ہے تو مزید عجلت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ان مسائل میں ہتھیاروں کا پھیلاؤ؛ تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادیاں اس کے ساتھ قوموں کے اندر اور مابین بڑھتی ہوئی معاشی ناہمواریاں جو رواداری کی مادی اور نفسیاتی حدود توڑنے کی کا خطرہ پیدا کرتی ہیں؛ زندگی کے لیے خطرہ بن جانے والا قدرتی وسائل کا بلا روک ٹوک صنعتی اور زرعی استحصال؛ خواتین، دیسی قوموں، جبر کا شکار اقلیتوں، اور بے شمار ثقافتی شناختوں سے تعلق رکھنے والوں کے لیے زندگی کا قابلِ قبول معیار قائم کرنے کے حوالے سے برابر کی شرکت کے دعوؤں کا پاس کرنے میں خود شکستگی اور ناکامی جیسے مسئلے شامل ہیں۔ لوگ جو عالمی حالات کے بارے میں انتہائی باخبر ہیں اور صرف واحد قومی ریاست کے تناظر میں عالمی حالات کو نہیں دیکھتے ان میں یونیسکو کے ڈائریکٹر جنرل، فیڈریکو میئر بھی شامل ہیں۔ ان کی نظر میں یہ ایک ''غیر رواجی عمل'' کا ایک عجلت پسند عہد ہے (میئر 1995ء: 93-83)۔ کیا علم سیاسیات کے لیے یہ کم عجلت کا باعث ہونا چاہیے؟

ہلاکت گریزی اور ترک اسلحہ

نہ حل طلب مسائل اور نہ ان کا جواب فراہم کرنے کے لیے ابھرنے والی غیر متشدد تحریکیں علمِ سیاسیات کی نظری ایجاد ہیں۔ عہد حاضر کی عالمی طرز سیاست انہیں منظر عام پر لائی ہے۔ علمِ سیاسیات کو چاہیے کہ وہ ان مسائل کے حل کے لیے خود کو وقف کر دے۔ ترکِ اسلحہ پر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اولین خصوصی اجلاس کی (یو این جنرل اسمبلی 1978ء) حتمی رپورٹ میں مسئلے کے حل کے عمل کے حوالے سے ایک واضح چیلنج موجود ہے جن میں ''موثر بین الاقوامی کنٹرول کے تحت عام اور مکمل ترکِ اسلحہ'' کا مطالبہ کیا گیا۔ 159 ممالک میں سے ایک ملک (البانیہ) غیر حاضر تھا، 158 ملکوں نے اتفاق رائے سے تمام جوہری ہتھیاروں کی تباہی؛ تمام بائیو کیمیکل اور عام تباہی کے دیگر ہتھیاروں کی تباہی؛ تمام بیرونی فوجی اڈوں سے واپسی؛ سرحدی دفاع کے مقاصد تک محدود مسلح افواج میں کمی؛ روایتی ہتھیاروں میں کمی؛ اور معاشی طور پر زیادہ یا کم ترقی یافتہ ممالک میں معاشی اور سماجی ضروریات پوری کرنے کی خاطر مادی اور انسانی وسائل کی منتقلی کے ذریعے عالمگیر فوجی اخراجات میں ''اصرافِ بے جا'' ختم کرنے کی ضرورت کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی بہت سی متعلقہ سفارشات پیش کی گئیں۔ بالا دست متشدد ممالک کی جانب سے غیر متشدد عمل تغیر کی حمایت میں یہ ایک مستند اعلان ہے جو، بدقسمتی سے علمِ سیاسیات کے اکثر طالب علموں کے علم میں نہیں ہے۔

اسلحے سے پاک سماجوں کے قیام کی جانب ارتقا کو یقینی بنانے کے لیے سرکاری اور سول سوسائٹی کی سطح پر جو پہل کاریاں ہورہی ہیں ہلاکت گریز علمِ سیاسیات خود کو ان کی مدد کی کوششوں سے الگ نہیں رکھ سکتی۔ ان مہموں میں ہینڈ گنوں، حملے کے ہتھیاروں، بارودی سرنگوں اور اسلحے کی تجارت پر پابندی؛ دیہاتوں اور شہروں میں اسلحے سے پاک امن کے علاقوں کا قیام؛ اور کرۂ ارض پر جوہری ہتھیاروں سے پاک علاقوں کی تخلیق شامل ہے۔

ہلاکت گریزی اور معاشی محرومی

مسئلہ حل کرنے کے عمل کی ایک اور مستند اپیل ترین نوبل انعام یافتگان کا وہ ''منشور'' ہے جس میں کیمیا سے طبیعیات تک کے شعبوں سے تعلق رکھنے والی ان قابل شخصیات نے قابلِ تدارک معاشی محرومی سے ہونے والی اموات کو ''قتل عام'' قرار دے کر اسے بند کرنے کا مطالبہ کیا ہے (نوبل انعام جیتنے والے 1981ء: 3-61)۔[10] انہوں نے اعلان کیا: ''اس عالمگیر تباہی کی مذمت اور مزاحمت کرنے والے تمام افراد میں اس امر پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ اس المیے کی وجوہ سیاسی ہیں۔''

> شہریوں اور سیاستدانوں پر لازم ہے کہ اپنی اپنی سطح پر، انتخابات میں، پارلیمنٹ میں، حکومتوں میں یا بین الاقوامی سطح پر، نئے قوانین، نئے بجٹوں، نئے منصوبوں اور نئے اقدامات کا انتخاب کریں اور ان کے لیے ووٹ دیں جن کی تشکیل کا مقصد کم خوراکی اور پسماندگی سے اربوں افراد اور بھوک سے اموات کا شکار ہونے والے ہر عمر کے کروڑوں

افراد کو بچانے کے لیے فوری عمل درآمد کرنا ہے(62)۔

انہوں نے ''جانداروں کی حفاظت کرنے، قتل اور نیست و نابود نہ کرنے کی ضرورت'' کا اظہار کرتے ہوئے'' جس میں ''بے عملی، قدم اٹھانے میں ناکامی یا لاتعلقی کے باعث قتل یا نیست و نابود کرنا بھی شامل ہے،'' مکمل تبدیلی لانے والے غیر متشدد معاشی انقلاب کا تقاضہ کیا ہے:

> گو کہ اس دنیا کے ذی اقتدار افراد پر عظیم ترین ذمہ داری عائد ہوتی ہے تاہم وہ تنہا نہیں ہیں۔ اگر لاچار افراد اپنا مقدر اپنے ہاتھوں میں لے لیں، اگر وہ بڑی تعداد میں بنیادی انسانی حقوق کے علاوہ کسی بھی قانون کی اطاعت کرنے سے انکار کر دیں، ان (بنیادی انسانی حقوق) میں زندہ رہنے کا حق انتہائی بنیادی نوعیت کا حامل ہے، اگر کمزور خود کو منظّم کر لیں اور محدود اور مناسب مقاصد کو اپنائیں اور ان کے لیے خود کو دستیاب چند لیکن طاقت ور ہتھیار مثلاً گاندھی کے پیش کردہ مثالی غیر متشدد اقدامات بروئے کار لائیں: اگر ایسا ہو جائے تو یہ ایک یقینی امر ہے کہ اس تباہی کو ہماری زندگی میں ختم کیا جا سکتا ہے(63)

اس منشور کے آخر میں تریہن نوبل انعام یافتگان کہتے ہیں،''اب وقت ہے عمل کرنے کا، اب وقت ہے تخلیق کرنے کا، اب ہمارے لیے وقت ہے ایسی زندگی گزارنے کا جو دوسروں کے لیے حیات بخش ہوگی۔''

معاشی ہلاکت آفرینی، تشدد اور ماحولیاتی تباہ کاری پھیلانے میں برابری، آبادی میں اضافہ اور عسکریت کاری کا ایک تفاعلی کردار ہوتا ہے۔ عالمی بینک نے 1991ء میں تخمینہ لگایا تھا کہ فی الحقیقت زیادہ سے زیادہ 1.5 ارب افراد ''مطلق افلاس'' کی زندگی بسر کر رہے ہیں جن کی یومیہ آمدنی ایک ڈالر سے کم ہے۔ اس کے ساتھ 3 ارب افراد روزانہ دو ڈالر سے کم پر

گزارا کر رہے ہیں۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ صرف ہندوستان میں 1980ء کے عشرے کے اواخر کے بعد سے مطلق مفلسوں کی تعداد 300 ملین افراد سے بڑھ کر 340 ملین تک پہنچ گئی ہے (عالمی بینک 1999ء)۔ اس عمل کے ساتھ آمدنی میں نابرابری بڑھتی ہے۔ عالمی بینک کے طارق حسین نے جون 1997ء میں اقوام متحدہ کی یونیورسٹی انٹرنیشنل لیڈرشپ اکیڈمی کے پہلے پروگرام میں نوجوان لیڈروں کے لیے جو خلاصہ تیار کیا تھا اس کے مطابق:

> 1990ء کے عشرے کے وسط میں ..... دنیا 1980ء کے مقابلے میں زیادہ متضاد حصوں میں بٹ گئی ہے..... کرۂ ارض کے 20 فیصد مفلس ترین لوگ عالمی آمدنی میں اپنے حصے میں گذشتہ 30 برسوں کے دوران 2.3 فیصد سے 1.4 فیصد تک کمی ہوتے دیکھ چکے ہیں۔ دریں اثنا، امیر ترین لوگوں کے لیے یہ آمدنی 70 فیصد سے 85 فیصد تک پہنچ گئی۔ اس طرح امیر ترین اور غریب ترین افراد کے حصوں کا تناسب دوگنا ہو کر 30:1 سے 61:1 ہو گیا ہے..... اب دنیا کے 360 ارب پتی افراد کے مجموعی اثاثے دنیا کی 45 فیصد آبادی رکھنے والے ممالک کی مجموعی سالانہ آمدنی سے آگے نکل چکے ہیں (حسین 1997ء:13)۔

عالمی بینک کے صدر جیمس ڈی۔ وولفنسن اور مہاتما گاندھی متفق ہیں کہ نابرابری تشدد کی راہ ہموار کرتی ہے۔ عالمی بینک کے صدر کا مشاہدہ ہے ''نابرابری عدم استحکام پیدا کرتی ہے۔ افلاس جنگ کو جنم دیتا ہے'' (حسین 1997ء:6)۔ جبکہ مہاتما انتباہ کرتے ہیں، ''جب تک چند امیروں اور لاکھوں بھوکوں کے درمیان وسیع خلیج حائل رہے گی عدم تشدد کا نظامِ حکومت بالکل ناممکن ہے..... اگر دولت اور اختیار سے رضا کارانہ علیحدگی اختیار نہیں کی جاتی اور ان کو عام بھلائی کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا تو ایک دن متشدد اور خونریز انقلاب یقینی

ہے‘‘ (مجموعۂ تصنیفات 75 (1941ء): 158)۔ صدر اور مہاتما گاندھی کی بصیرتوں کو یکجا کرتے ہوئے، امریکہ کی ایک نوجوان امن کارکن، بیٹسی ڈورین نے، جس نے اپنی اکثر وراثتی دولت خیرات کر دی تھی، یہ بات کہی: ’’دولت کی دوبارہ تقسیم کے ذریعے سے ہی ہم دیرپا امن حاصل کر سکتے ہیں۔ افلاس، جنگ اور مصیبتیں ان لوگوں کی پیدا کردہ ہیں جو اپنے حصے سے زیادہ دولت کے مالک ہیں اور اس پر قبضہ برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں‘‘ (موگل اور سلیپیان 1992ء: 100)۔ صدر، مہاتما اور نوجوان امریکی کے تصورات ہلاکت آفرینی اور نابرابری کے تعلق پر 2300 برس قبل ارسطو کے تجزیے کی بازگشت ہیں:

> یاد رکھنے کی ضروری بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو اثر و رسوخ استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، چاہے وہ افراد حکومت کا حصہ ہوں یا قبائل کا، آپ جو بھی ہوں، بڑے یا چھوٹے، یہی وہ لوگ ہیں جو انتشار پیدا کر کے انقلاب کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ ایسا وہ بالواسطہ طور پر اس وقت کر سکتے ہیں جب ان کی حکومت کے حاسدین انقلاب کا آغاز کرتے ہیں، لیکن یہ عمل وہ اس وقت براہ راست بھی کر سکتے ہیں جب وہ خود اتنی برتری حاصل کر لیتے ہیں کہ دوسروں کے ساتھ برابری کے اصولوں پر زیادہ دیر قائم نہیں رہتے (ارسطو 1962ء: 199)۔

1950ء میں 2.5 بلین سے 2000ء میں تخمیناً 6.1 بلین اور 2050ء میں 8.9 بلین تک عالمی آبادی میں تیز رفتار اضافہ، مسئلے کے غیر متشدد حل کے عمل کو چیلنج کرتا ہے۔

یہ پیش گوئی کی گئی ہے 2050ء میں، ہندوستان (1,529,000,000)، چین (1,478,000,000)، امریکہ (349,000,000)، پاکستان (345,000,000) اور انڈونیشیا (321,000,000) دنیا کے انتہائی گنجان آبادی والے ملک ہوں گے۔ ورلڈ واچ انسٹی ٹیوٹ کے لیسٹر آر۔ براؤن اور ان کے ساتھیوں کے تجزیے کے مطابق، ہر سال

تقریباً 80 ملین افراد کا غیر مثالی اضافہ، کرۂ ارض پر زندگی کا بوجھ برداشت کرنے کی صلاحیت پر تباہ کن دباؤ ڈال دیتا ہے۔ تشویش اور خطرے کے حامل 19 شعبوں میں آب رسانی، اناج کی پیداوار، توانائی، قابلِ کاشت زمین، جنگلات، حیوی تنوع (BioDiversity)، موسمی تبدیلی، بیماری، شہر کاری، تعمیرات، تعلیم، روزگار، اور ملکوں کے اندر اور ان کے مابین تنازعے شامل ہیں (براؤن، گارڈنر، اور ہال ویل 1999ء)۔

چونکہ آبادی میں کمی کے روایتی ہلاکت آفریں طریقے مثلاً جنگ، نسل کشی، اور اسقاط حمل نیز قحط سالی اور طاعون ناپسندیدہ ہیں، لہٰذا ہلاکت گریز علم سیاسیات کو غیر متشدد متبادلات کی دریافت اور نفاذ کے عمل میں مدد کرنے کا چیلنج درپیش ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاشی مسئلے کے حل کے حوالے سے سیاسی نظریے اور عمل میں، انسانی زندگی کے معیار اور زندگی کے لیے حیات بخش ماحول کا احترام پیدا کیا جائے۔

قتل کے پیشے سے وابستہ، دنیا کے چند نامور فوجی رہنما، معاشی عدم عسکریت کاری کے تقاضے کے حوالے سے تیز فہم بصیرت کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے جنرل ڈوئیٹ ڈی۔ آئزن ہاور ان میں سے ایک ہیں جو امریکہ کے صدر بنے (1961ء۔ 1953ء)۔ قتل کرنے سے عملی وابستگی اور معاشی اسٹرکچرل تشدد کے درمیان تعلق کے حوالے سے ان کے جامع اور طاقتور تجزیے پر کوئی بھی امن پسند سبقت حاصل نہیں کر پایا ہے:

> بنائی گئی ہر بندوق، سمندر میں اتارا گیا ہر جنگی جہاز، داغا گیا ہر راکٹ، حتمی معنوں میں، ان لوگوں سے سرقہ کی علامت ہے جو فاقہ کشی کرتے ہیں اور جنہیں خوراک نہیں ملتی، جو سردی برداشت کرتے ہیں اور لباس سے محروم رہتے ہیں۔ ہتھیاروں کو دوست رکھنے والی

> یہ دنیا صرف دولت خرچ نہیں کر رہی ہے۔ یہ اپنے مزدوروں کا پسینہ، اپنے سائنسدانوں کی دانش، اپنے بچوں کی امیدیں صرف کر رہی ہے..... کسی بھی حقیقی مفہوم میں، یہ مطلق طور پر ایک طرز زندگی نہیں ہے۔ دہشت انگیز جنگ کے بادلوں کے نیچے، انسانیت فولادی صلیب سے لٹکی ہوئی ہے۔ (امریکن سوسائٹی آف نیوز پیپر ایڈیٹرز سے خطاب، 16 اپریل 1953ء)۔

''فولادی صلیب سے لٹکتی ہوئی'' انسانیت کی ایک وجہ 1940ء سے 1996ء تک امریکہ کے جوہری ہتھیاروں کے پروگرام کی لاگت کے ذریعے ''سرقہ'' ہے جس کا تخمینہ 5.821 ٹریلین ڈالر لگایا گیا ہے (شوارٹز 1998ء)۔ اس سے عالمی فوجی اخراجات کے اس ''عظیم اور ناقابل یقین اسراف'' کی وضاحت ہو جاتی ہے ان اخراجات کی اوسط 1990ء کے عشرے میں ''500 بلین ڈالر سالانہ سے زیادہ'' نکالی گئی ہے (سیوارڈ 1996ء: 7)۔ ہلاکت گریز علم سیاسیات سے مراد، عالمی عسکریت کاری کی پیدا کردہ معاشی محرومی کے تسلسل کو تسلیم کرنے سے انکار ہے۔ ہلاکت گریز علمِ سیاسیات غربت کی ''تباہ کاریوں'' کے خاتمے کے لیے ''فولادی صلیب'' سے انسانیت کو آزاد کرانے کی کوششوں میں تعمیری شمولیت کو تسلیم کرتی ہے۔

ہلاکت گریز انسانی حقوق اور فرائض

حقوقِ انسانی کا عالمی منشور (1948ء) اور اس کے بعد جاری کردہ سول اور سیاسی،

سماجی اور معاشی حوالے سے نفاذی عہد ناموں نے، مسئلے کے حل میں شمولیت کے سامنے ناگزیر چیلنج پیش کر دیا ہے۔ ہر ایک ماہر سیاسیات اور عالمی شہری کو اس کے بنیادی متن سے واقف ہونا چاہیے۔

بہر حال انسانی حقوق کی تشریح کے حوالے سے یہ بحث موجود ہے کہ انسانی حقوق کی نوعیت چونکہ عالمگیر ہے لہٰذا مخصوص ثقافتی اقدار سے اس کا ٹکراؤ ہے۔ لیکن اس امر سے قطع نظر ہلاکت گریز علمِ سیاسیات انسانی حقوق کے نفاذ اور دفاع کی پابند ہے۔ مزید براں، اس کا ہدف ہے کہ وہ عالمگیر سطح پر قتل نہ کیے جانے اور دوسروں کو قتل نہ کرنے کی ذمہ داری جیسے حقوق کو تسلیم کرائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انسانی حقوق کے عالمی منشور اور عالمی سطح پر عملدرآمد کے حوالے سے درج ذیل ضابطے کو شامل کیا جائے:

> دفعہ 3 (2)۔ ہر فرد کا یہ حق ہے کہ اُسے قتل نہ کیا جائے اور یہ اُس کی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسروں کو قتل نہ کرے۔

ہلاکت گریز علمِ سیاسیات کو ہر سطح پر یہ چیلنج درپیش ہے کہ وہ انسانی حقوق کے تحفظ اور ارتقا کی سعی کرنے والے افراد اور تنظیموں کے لیے تحقیق، تربیت، مشاورت اور سرگرمی کے لیے اپنے وسائل مختص کرے۔ مثال کے طور پر 1995ء کی بیجنگ ویمینز کانفرنس میں خواتین اور لڑکیوں کے خلاف تشدد کی تمام شکلوں کے خاتمے کے لیے عملی اقدامات کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس اہم ایجنڈے کے عملی نفاذ کا عہد ایک چیلنج ہے (اقوام متحدہ 1996ء)۔

علمِ سیاسیات کے لیے ایک دوسرا چیلنج یہ ہے کہ 1961ء میں قائم ہونے والی ایمنسٹی

انٹرنیشنل انسانی حقوق کے لیے جو جدوجہد کر رہی ہے اُس کے غیر متشدد دفاع کے لیے بھرپور کام کیا جائے۔ اس کے کام کی بنیاد عالمی منشور کے اصولوں پر ہے مثلاً ''کسی فرد کو تشدد یا ظالمانہ، غیر انسانی یا ذلت آمیز سلوک یا سزا کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا'' (دفعہ 5)؛ ''کسی فرد کو بے وجہ گرفتاری، حراست یا جلاوطنی کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا'' (دفعہ 9)؛ اور ''ہر فرد کو رائے اور اظہار کی آزادی کا حق حاصل ہے؛ اس حق میں بغیر مداخلت خیالات اپنانے اور کسی بھی میڈیا کے ذریعے اور سرحدوں سے بے نیاز اطلاع اور تصورات وصول کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کی جستجو کرنے کی آزادی شامل ہے'' (دفعہ 18)۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل عالمی طور پر سزائے موت کے خاتمے، تشدد کے خاتمے، سب کے لیے منصفانہ عدالتی کارروائی، اور ضمیر کے ان تمام قیدیوں کی فوری رہائی کی جستجو کرتی ہے جنہوں نے نہ تو تشدد کی تبلیغ کی ہے اور نہ وہ تشدد میں ملوث رہے۔ غیر متشدد سیاسی عمل کی تمام شکلیں ان طریقوں میں شامل ہیں۔

انسانی حقوق کے جن دیگر کاموں میں ہلاکت گریز علمِ سیاسیات کا تعاون درکار ہے اُن میں، 1991ء میں قائم کردہ ان ریپریزینٹڈ نیشنز اینڈ پیپلز آرگنائزیشن (یو این پی او) کا کام بھی شامل ہے۔ یو این پی او پانچ براعظموں پر بسنے والی پچاس سے زیادہ قدیم قوموں کے اجتماعی انسانی حقوق کو تسلیم کرانے کی جدوجہد کرتی ہے۔ ارکان، یو این پی او کے عہد نامے کا تحریری طور پر اقرار کرتے ہیں جس میں ''پالیسی اقرار نامہ کے طور پر عدم تشدد کے فروغ اور دہشت گردی کو مسترد'' کرنے کا عہد درج ہے۔ یو این پی او ''حکومتوں، بین الاقوامی تنظیموں، این جی اوز اور ان کے قائدین'' پر زور دیتی ہے کہ وہ ''تشدد کے استعمال

میں کمی کے لیے شفاف اور اصولی پالیسیاں اختیار کریں۔'' ان میں درج ذیل پالیسیاں ضرور شامل کی جائیں:

> ان کے حجم، ان کی ثقافت یا مذہب سے بے نیاز ہوکر، تمام قوموں اور اقلیتوں کے مساوی حقوق کی قدر شناسی اور احترام کرنا؛ نمائندگی سے محروم قوموں اور قومیتوں کی احتیاجات اور طرز افکار کا سنجیدہ ادراک کرنا؛ نمائندگی سے محروم قوموں اور اقلیتوں کے خلاف تشدد کی تمام ناحق کارروائیوں اور انسانی حقوق کی مجموعی خلاف ورزیوں پر اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کرنا اور ان کی مذمت کرنا؛ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے پُرامن اور جمہوری طریقے استعمال کرنے والی تحریکوں یا حکومتوں کا جواز تسلیم کرنا؛ ایسی تمام تحریکوں اور حکومتوں کے ساتھ شفاف اور سنجیدہ مذاکرات میں شمولیت اختیار کرنا اور عدم تشدد پر ان کی وابستگی پر انعام سے نوازنا؛ (اور) قوموں، عوام اور اقلیتوں اور ان پر حکمرانی کا دعویٰ کرنے والی ریاستی حکومتوں کے درمیان تنازعات کے پُرامن حل کی حوصلہ افزائی اور عملی تعاون کرنا (یو این پی او 1998ء:8)۔

مزید برآں، یو این پی او'' کارپوریشنوں اور مالیاتی اداروں سے ان وسائل کا جن پر قوموں کی بقا کا انحصار ہے، بے دریغ استحصال ختم کرنے، اور اسلحے کی غیر ذمہ دارانہ تجارت کے ذریعے تشدد کے فروغ اور میڈیا میں اور اپنی مصنوعات میں تشدد کا بیوپار بند کرنے'' کا مطالبہ کرتی ہے (9)۔ قتلِ عام، نسلی تباہی اور ماحولیاتی تباہی سے متاثرہ قوموں کی غیر متشدد سیاست سے اس نوع کی وابستگی اور حمایت، ہلاکت گریز علمِ سیاسیات کے لیے ایک واضح چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ کرۂ ارض کے قدیم اور اقلیتی عوام کی موجودہ وسیع تعداد اور شناخت کے تقاضوں کے پیش نظر، یو این پی او کی رکنیت واقعتاً اقوام متحدہ کے رکن ممالک کی تعداد سے بڑھ سکتی ہے۔

ہلاکت گریزی اور ماحولیاتی نمو پذیری

ہلاکت گریز علمِ سیاسیات سے مراد ماحولیاتی ہلاکت آفرینی سے نوع انسانی کی نجات میں مدد ہے۔ ہم ماحول کو تباہ کرتے ہیں اور ماحول ہمیں تباہ کرتا ہے۔ ایک ہلاکت گریز سماج ایک ہلاکت گریز ماحولیات کا متقاضی ہے۔

بیسوی صدی کے اختتام پر انسانوں کی جانب سے زندگی کو برقرار رکھنے کی کرۂ ارض کی گنجائش کو تباہ کئے جانے کے خطرے کو پہلے سے کہیں زیادہ محسوس کیا جا رہا ہے۔ فوجی صنعت کاری اور جنگ و جدل کی صورت میں کرۂ ارض پر حملہ اس کی غارت گری میں حصہ دار ہیں۔ 28 اکتوبر 1982ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں 111 ارکان کی جانب سے منظور کردہ ورلڈ چارٹر فار نیچر نے یہ اعلان کیا کہ ''جنگ و جدل اور دیگر معاندانہ سرگرمیوں کے ذریعے پیدا کی جانے والی تنزلی کے خلاف کائنات کو محفوظ بنانا ہوگا'' (آرٹیکل 1، سیکشن 5)۔ المناک خلاف ورزیوں میں: جنگِ ویتنام میں امریکیوں کی جانب سے جنگلات کی کیمیائی بربادی؛ عراق کی جانب سے جنگِ خلیج میں تیل کے کنوؤں کی آتش زنی شامل ہے۔ ہلاکت گریز علمِ سیاسیات کو بیری کامنر کے پیش کردہ چیلنج کا سامنا ہے جس کے مطابق: ''کرہ ارض کے ساتھ امن پیدا کرنے کے لیے، ہمیں اس پر بسنے والی قوموں کے درمیان امن پیدا کرنا چاہیے'' (کامنر 1990ء:243)۔

ایک دوسرا چیلنج 1992ء میں ریوڈی جنیرو میں منعقدہ ایک اہم یونائیٹڈ نیشنز کانفرنس

آن انوائرنمنٹ اینڈ ڈیولپمنٹ کے سکریٹری جنرل موریس ایف۔ اسٹرانگ نے پیش کیا جو ایک ایسے ''ماحولیاتی انقلاب'' کا تقاضہ کرتے ہیں ''جو ایک زیادہ محفوظ، پائیدار اور منصفانہ مستقبل کے لیے دنیا کو ایک نئی راہ پر گامزن کرنے کے لیے لازمی ہے'' (اقوام متحدہ 1993ء:1)۔ ایجنڈا 21، عمل کے لیے کانفرنس سے تقاضہ کرتے ہوئے، نشاندہی کرتا ہے کہ ''جنگ و جدل پائیدار ترقی کے لیے خصوصی طور پر تباہ کن ہے'' (بنیادی اصول 24) اور یہ کہ ''امن، ترقی اور ماحولیاتی تحفظ باہمی طور پر مربوط اور ناقابلِ تقسیم ہیں (بنیادی اصول 25)۔ ریاستوں، حکومتوں، شہریوں، خواتین، نوجوانوں اور دیسی قوموں کے مسئلے کے حل کے لئے اقدام کی اپیلیں کی گئی ہیں۔ ان میں فوجوں، فوجی صنعتوں، کارپوریشنوں، لیبر یونینوں اور سیاسیات دانوں کو شامل کیا جا سکتا ہے۔

سلامتی اور بہبود کو درپیش دیگر خطرات کی طرح، ماحولیاتی مسائل پیچیدہ، بین الشعبہ جاتی اور عالمگیر ہیں۔ حکومت کی پالیسی سازی اور نفاذ کے عمل میں تعاون کی غرض سے علم سیاسیات کے وسائل کو ایک ہلاکت گریز تناظر میں استعمال میں لانے کی ضرورت ہے۔ یہ شناخت کرنا علمی فریضہ ہے کہ کون سے ماحولیاتی خطرات بہتر طور پر سمجھ لیے گئے ہیں اور فوری عمل کے متقاضی ہیں، ان میں سے کون سے مسائل فوری تحقیق اور اولیت کے حامل ہیں اور سماجی فیصلہ سازی کے عمل میں جن اقدامات کو فوری طور پر عمل میں لانا ضروری ہے ان میں سائنسی علم کو بہترین انداز میں کس طرح متعارف کرایا جائے۔ رائل سوئیڈش اکیڈمی آف سائنسز کے ذریعے ایک مثالی طرزِ فکر پیش کی جا چکی ہے (1983ء؛ سیبیک 1983ء)۔

ہلاکت گریز سیاسیات سے مراد غیر متشدد ماحولیاتی مسئلے کے حل کے عمل میں مصروف افراد، تنظیموں اور سماجی تحریکوں کی جانب خصوصی توجہ رکھنا اور ان کا مددگار بننا ہے۔ عہدِ حاضر کی نمایاں غیر متشدد ماحولیاتی تحریکوں کی حدود ہندوستان میں درختوں کی حفاظت کے لیے دیہی خواتین کی چپکو تحریک (دیبر 1989ء؛ نوتیال 1996ء)، گرین پیس کی جانب سے حکومتی اور نجی پالیسیاں تبدیل کرنے کے لیے راست اقدام کے ذریعے کوششیں (اسٹیفینسن 1997ء) سے، جرمنی میں ماحولیاتی تحریک اور انتخابی سیاسی پارٹی، ڈائی گرونن (دی گرینز) کے ظہور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

انتخابی جماعت ڈائی گرونن کی ایک بانی، پیٹرا کیرین کیلی (1992ء-1947ء) کی فطری میراث اکیسویں صدی میں ہلاکت گریز علمِ سیاسیات کے لئے مسئلے کے حل کا ایجنڈا پیش کرتی ہے۔ ان کی دعوتِ عمل، ترکِ اسلحہ بذریعے معیشت اور انسانی حقوق سے لے کر، کرۂ ارض کو بچانے کے لیے عالمگیر تعاون تک ہر اہم مسئلے کا احاطہ کرتی ہے۔ وہ ایک ''ماحولیاتی ذمہ داریوں کی عالمی ثقافت'' کا مطالبہ کرتی ہے اور ''تمام ممالک کے درمیان ماحولیاتی تعلقات پر اثر انداز ہونے والے لازمی اصولوں'' کی تیاری پر زور دیتی ہے (کیلی 1992ء: 76)۔ ٹالسٹائی، گاندھی، عبدالغفار خان، اور مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کے ساتھ ساتھ، پیٹرا کیلی کی شخصیت کو آج یعنی بیسویں صدی میں اور اس کے بعد، غیر متشدد عالمگیر تبدیلی کی ایک اہم کردار کے طور پر پہچانا جائے گا اور مستقبل میں اُن کی اس حیثیت کو تسلیم کیا جائے گا (کیلی 1989ء؛ 1992ء؛ 1994ء؛ پارکن 1994ء)۔

ہلاکت گریزی اور مسئلے کے حل میں اشتراک

افراد اور عالمی برادری دونوں کے لیے مسئلے کے پُرامن حل کے عمل کی مدد کرنا ایک عمومی ہدف ہے۔ جن لوگوں کی مدد درکار ہے ان سب کے درمیان احترامِ زیست پر مبنی تعاون کے بغیر سلامتی، معاشی فلاح، انسانی حقوق کا احترام ماحولیاتی نمو پذیری اور زندگی کی دیگر قابل قدر صفات حاصل نہیں ہوسکتی ہیں، اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ علم سیاسیات ہر مسئلہ کا حل پیش کرتی ہے۔ بلکہ اس کی بجائے یہ مسئلے کے حل کے لیے اشتراک عمل اور مدد کی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔ اس سے مراد مطلق العنانیت نہیں ہے: انارکسٹوں کو بھی اپنی آزادیوں کے احترام کے لیے دوسرے انارکسٹوں کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہلاکت گریز طرزِ فکر کا مفہوم اس سیاست کو تبدیل کرنا ہے جس کی بنیاد غلبے کے لیے، ظاہری یا باطنی طور پر تنازعے اور مقابلے پر استوار ہے یا جس میں مخفی طور پر تشدد کا عنصر حتمی اور فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ ہلاکت گریز علمِ سیاسیات سے مراد مسئلے کے حل کے لیے اشتراک اور تعاون کے دائروں کو وسیع سے وسیع تر کرنا ہے جس میں زندگی کو خوبصورت بنانے کے لیے باہمی احترام ایک نمایاں عنصر کے طور پر کارفرما ہوتا ہے۔ اس کے برعکس تشدد غلبے اور تقسیم کا جبکہ عدم تشدد تعاون اور اتحاد کا نام ہے۔ لہٰذا ہلاکت گریز علم سیاسیات مردوں اور عورتوں، مذاہب، تہذیبوں، نسلوں، ثقافتوں، طبقوں، برادریوں، ریاستوں، قومی اور قومی حدود سے بالاتنظیموں اور عالمگیر تحریکوں کے درمیان دوطرفہ اشتراک عمل کی سعی کرتی ہے۔ اس کا ہدف

یہ ہے کہ سب کی فلاح کے لیے قتل یا قتل کرنے کی دھمکی کے بغیر مسائل حل کیے جائیں۔اس عمل میں، تنازع کے حل کے نظریہ اور عمل میں بین شعبہ جاتی اور پیشہ ورانہ مفاد کا ابھار اور مذاکرات کے ذریعے تنازعات کے کامیاب حل کی کوشش، آسانی پیدا کرنے کے اہم وسائل مہیا کرتے ہیں (فیشر اور یوری 1981ء؛ برٹن 1996ء)۔

ہلاکت گریز علمِ سیاسیات بڑھتی ہوئی تحقیق کی بنیاد پر تشدد کی حامل ریاستوں اور شہری سماجوں کو ہلاکت گریز سماجوں میں تبدیل کرنے کے عمل میں مدد کرتی ہے۔ یہ چند جدید سیاسی نظامون کے اندر جمہوری ارتقا کے حوالے سے ہونے والی تاریخی پیش رفتوں کو تسلیم کرتی ہے۔تاہم یہ ان کرداری اور ساختی تشدد کے مسائل کے حل کی جستجو بھی کرتی ہے جن کو آزاد سیاست اور آزاد منڈی تنہا حل نہیں کرتیں۔ ہلاکت گریز علمِ سیاسیات بے لگام حکمرانی کو پابند کرنے کے لیے شہریوں کے بنائے گئے دستوروں کی قدر؛ شہری آزادیوں کو محفوظ کرنے کے لیے حقوق کے قانونی مسودوں کی فراہمی؛ انتظامی، قانون ساز، اور عدالتوں شعبوں میں ادارہ جاتی چیک اینڈ بیلنس کے نظام کی افادیت؛ انتخابی مقابلے کو خانہ جنگی کا متبادل بنانے؛ پیشہ ور نوکر شاہی کی خدمات؛ مذہبی آزادی؛ پریس اور اظہار رائے کی آزادی؛ اور رائے دہندگی کے حق کی توثیق کر کے اُس میں عالمگیر شرکت کو ممکن بنانے والے اقدامات کو تسلیم کرتی ہے (فائنر 1997ء؛ گولڈ مین 1990ء)۔فوج اور پولیس کی اعانت ایسے نظاموں کے قیام اور انہیں تقویت دینے میں کردار ادا کرتی ہے۔ ہلاکت گریز علمِ سیاسیات اس صورتحال کا ادراک کرتے ہوئے ان کے متبادلات تلاش کرتی ہے۔

ہلاکت گریز طرز فکر انسانی ضروریات کے تقاضوں کو پورا کرنے میں مسلسل ناکامی اور خرابیوں پر توجہ مرکوز کرتی ہے۔ ان ناکامیوں کے باعث انتہائی ''ترقی یافتہ'' جمہوریتوں میں بھی جسمانی اور ساختی تشدد کا مظہر نظر آتا ہے۔ امریکہ اس کی ایک مثال ہے جہاں ہمیں خاندان اور اسکول میں تشدد اور قتل؛ پُرتشدد گروہوں، منشیات اور خودکشی کی شکل میں نظر آنے والی نوجوانوں کی ناامیدی؛ نفوذ کرتی ہوئی سیاسی بیگانگی، سیاست اور حکومت پر بے اعتمادی جس کا جُزوی اظہار ووٹ ڈالنے والوں کی تعداد میں کمی کی صورت میں نظر آتا ہے؛ غیر پیدا واری فوجی اخراجات کی شکل میں وسائل کا بے پناہ اصراف؛ ناقص غذا، صحت، رہائش (بشمول بے گھری)، تعلیم اور خاندانی انتشار سے متصف، آبادی کا کم از کم بیس فیصد پر مشتمل شدید محرومی کا شکار نچلا طبقہ؛ مسلح ڈکیتی؛ انتقامی جرائم؛ صنفی اور نسلی امتیاز؛ فی الحقیقت دوسری بیس فیصد تعداد پر مشتمل بڑھتی ہوئی دولت کا مالک انتہائی مالدار طبقہ جو اپنے نزدیک ترین درمیانہ طبقات سے جڑ کر، زیادہ پولیس، جیل خانوں، سخت سزاؤں اور فوجی طاقت کے ذریعے اپنی سلامتی کو یقینی بناتا ہے۔ امریکہ میں یہ تمام مظاہر ہمیں پُرتشدد ثقافتی تمثال میں نظر آتے ہیں۔

وہ ممالک جو ایک جمہوری ریاست اور شہری سماج کے حوالے سے کم تر شناخت رکھتے ہیں وہاں تشدد کی شدت زیادہ نظر آتی ہے۔ ان ملکوں میں بے لگام ہلاکت آفریں حکومتوں اور معاشی محرومیوں کے ساتھ تشدد مختلف شکلوں میں روا رکھا جاتا ہے جس کے نتیجے میں ناقابل بیان جسمانی اور اسٹرکچرل مظالم جنم لیتے ہیں۔ سرسری سماعت کے ذریعے سزائے موت،

تشدد، انتخابی قتل، نسل کشی، قتل عام، اسلحے کے زور پر تاوان، دہشت گردی، مسلح انقلابات اور ریاستی پشت پناہی میں معاشی محرومیوں سے کثیر اموات اس کے اشاریے ہیں۔

مقاصد اور ذرائع کے حوالے سے خود کو تشدد کی قبولیت کے حامل مفروضوں سے آزاد کراتے ہوئے، ہلاکت گریز علم سیاسیات کا رہدف یہ ہونا چاہیے کہ وہ مسائل کو حل کرنے کے ضمن میں زیادہ یا کم جمہوری سماجوں کے اندر اور درمیان انسانی ضروریات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے زیادہ بہتر طریق عمل مہیا کرے۔ سائنسی اور انسان دوست اختراعیت کو درپیش چیلنج لامحدود ہے۔ تاہم آج بھی یہ واضح ہے کہ ہلاکت گریز اقدار کے جامع و مانع تعارف، ہلاکت گریز انسانی صلاحیتوں کے بارے میں جدید معلومات کی فراہمی، جمہوری قیادت اور شہریت کی جدید ہلاکت گریز مہارتوں کی پرداخت، پالیسی سازی میں شرکت کو آسان بنانا، اور مسئلے کے جدید غیر ہلاکت آفرین حل کے اداروں کی تعمیر کے ذریعے تبدیلی کے تعمیری طریق عمل میں مدد فراہم کی جاسکتی ہے۔ ان تبدیلیوں میں مدد کے لیے، علم سیاسیات کو سماج کی خدمت کے حوالے سے نقطۂ آغاز کے طور پر بذات خود ہلاکت گریزی سے اپنی وابستگی کی وضاحت کرنا چاہیے۔ فرد اور خاندان سے عالمی نظامِ سیاست تک، پوری نہ ہونے والی انسانی ضروریات کے لیے اسے اداری طور پر جواب دہ ہونا چاہیے۔

☆☆☆☆☆

پانچواں باب

اداری مضمرات

جنہیں ہم ضروری ادارے کہتے ہیں وہ اکثر ان اداروں سے مختلف نہیں ہوتے جن کے ہم خوگر ہو چکے ہیں، اور ..... سماجی تشکیل کے معاملات میں امکانات کا میدان اتنا وسیع ہے کہ مختلف سماجوں میں رہنے والے لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

الیکسی ڈی ٹوکوئیل

کرۂ ارض پر زندگی کو ڈراوا دینے والے مسائل اجتماعی طور پر پیدا کردہ ہیں، وہ ہمیں اجتماعی طور پر متاثر کرتے ہیں، اور انہیں تبدیل کرنے کے لیے ہمیں اجتماعی طور پر سرگرم ہونا چاہیے۔

پٹیرا کے۔ کیلی

علم سیاسیات میں ہلاکت گریز اخلاقی اور تجربی تبدیلی (Shift) کے کیا اداری مضمرات ہیں؟ ان لوگوں کے لیے اس سے کیا مراد ہے جو شعبوں (Desciplne) کو منظّم کرتے ہیں، دوسرے علوم سے اس کا تعلق قائم کرتے ہیں۔ ان مختلف اداروں پر بھی اس تبدیلی کے کیا مضمرات ہو سکتے ہیں جو مقامی کمیونٹی سے لے کر عالمی سطح تک ہلاکت گریز سماجوں کے قیام کے لیے ضروری ہیں؟ اداروں کو ان مقصدی سماجی تعلقات کی ظاہری ہیئتِ سمجھا جاتا ہے جو انسانی ضروریات اور امنگوں کے جواب میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

تہذیب کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ اداروں کی تخلیق اور ترقی کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ مذاہب کے حوالے سے برادریاں، مندر، سنی گاگ، چرچ اور مسجد سے وابستہ ہیں۔ سیاسی عمل میں شرکت کی ضرورت کے حوالے سے سیاسی جماعتوں، انتخابات اور پارلیمنٹ کے ادارے وجود میں آئے۔ سماجی نظم کی ضرورت کے حوالے سے پولیس، عدالتیں اور جیل خانے قائم ہوئے جنگی مقاصد کے لے زمینی، بحری اور فضائی لڑائی کے لیے ٹیکنالوجی سے لیس افواج قائم کی گئیں۔ ریاست فوجی اخراجات کے لیے ٹیکس نچوڑتی (extractirn) ہے لوراس کام کے لیے بیورو کریسی کا ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ (فنر : 1997 16-17-2021)۔ ایٹم بم کی تخلیق کے لیے قومی وسائل کو مین ہٹن پروجیکٹ کے تصرف میں دے دیا گیا۔ نامعلوم اقلیم کی دریافت کے لیے جذبے، سائنس، ٹیکنالوجی، مہارتوں، اور پندرہویں صدی کے جہازراں پرنس ہنری کی بحری مہموں اور بیسویں صدی میں انسان کو چاند پر اتارنے کے اپالو پروجیکٹ کے لئے وسائل کو منظّم اور یکجا کیا گیا۔

ایک ہلاکت گریز سماج تک رسائی میں علم سیاسیات کی جانب سے تعاون کے حوالے سے کس نوع کی اداری تبدیلیاں درکار ہیں؟ عالم گیر حیات کے ہلاکت گریز اطوار کی مقصدی جستجو ان اداری تبدیلیوں کا پتہ دیتی ہے جو عہدِ حاضر کی ابلاغی و اطلاقی ٹیکنالوجی کے عالمگیر پھیلاؤ کے ساتھ وابستہ افراد کے حدِ عمل میں نفوذ پذیر ہیں۔ ایک ہلاکت گریز تناظر قدیم ڈھانچوں میں جذب یا ضم کیا جاسکتا ہے، جن میں سیاسی سائنس کی مخصوص صفات کے آر پار شراکتی جمہوریت، جنس، نسل، طبقہ اور ماحولیاتی معاملات کے انضمام کی کوششیں شامل ہیں۔ یا پھر یہ ہلاکت گریز قلبِ ماہیت کی بھرپور جستجو کے لیے توانائی کے تمام وسائل کو یکجا کرتے ہوئے از کار رفتہ اداروں کی تعمیر نو کرنے، متوازی عبوری اداروں کی تعمیر کرنے، یا مکمل نئے یا مخلوط اداروں کے قیام کی جانب لے جاسکتا ہے۔

ہلاکت گریز سماجوں کو قابلِ حصول بنانے کی سنجیدہ کوششوں سے مراد ایسے اداروں کی ضرورت ہے جو ہلاکت گریز سائنسی اور انسان دوست دریافت، عدم تشدد کی تعلیم و تربیت، اثباتِ حیات کے حامل مسائل کا حل، ہلاکت گریز سلامتی، اور سماج کے ہر شعبے میں غیر متشدد فلاح کے لیے خدمات کی تخلیق کے لیے وقف ہوں۔

جمہوریتوں کو جمہوریت پسند وجود میں لاتے ہیں جنہیں اس امر کا ادراک ہوتا ہے کہ وہ کیا ہیں، جو یہ جانتے ہیں کہ جمہوریتوں کو کس طرح قابل عمل بنایا جائے اور جن کے اندر انہیں قابل عمل بنانے کی تحریک اور جذبہ موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح ہلاکت گریز سماجوں اور اداروں کو وہ افراد تشکیل دیں گے جو ہلاکت گریزی پر یقین رکھتے ہیں۔ ہلاکت گریز علم

سیاسیات بھی ایسا ہی کرے گی۔ ہلاکت گریزی کا شعور اجاگر کرنے کے کئی راستے اور طریقے ہیں لیکن اس امر کے حصول کے لئے کوئی واحد راستہ یا نسخہ تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ پیدائش، عقیدہ، دانش، صدمہ، دردمندی، سود وزیاں کا تجزیہ، زمانہ سازی (Sminlathor) اور مراقبہ (meditation) ایسے تمام راستے اور طریقے ہیں جو ہلاکت گری کی دریافت اور عمل کے حصول کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ ایسی وسیع تاریخی اور عصری شہادتیں موجود ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ انسان میں ہلاکت گریزی کے حوالے سے ایقان کی بڑی گنجائش موجود ہے۔ اس امر سے ہم سب کی حوصلہ افزائی ہونا چاہئے تاکہ ہم اپنے اندر موجود قلبِ ماہیت کی صلاحیتوں کو دریافت کر سکیں۔

علم سیاسیات کا ہلاکت گریز شعبہ

درآں حالیکہ، ایک ہلاکت گریز جذبے کو موجودہ سیاسی سائنس کے ہر اختصاص، شعبے اور انجمن میں نفوذ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے موجودہ شعبوں کی تعمیر نو کرنے، اور ابھرتی ہوئی عالمی یونیورسٹیوں میں نئے شعبے تشکیل دینے کے لیے نقشِ اول کے طور پر ایک نئے ہلاکت گریز شعبے کا تصور پیش کیا جا سکتا ہے۔

یہ شعبہ مشترکہ مقصد کی فہم کی بنیاد پر آگے بڑھتا ہے: ان مشترکہ مقاصد میں قتل، قتل کی دھمکیوں اور ان کے ہلاکت آفریں باہمی تعلق کا عالمی زندگی سے خاتمہ کرنا شامل ہے۔ یہ فکر

اس شعبے کو ان شعبوں سے ممتاز کرتا ہے جو تشدد پر مبنی جمہوریت، تشدد پر مبنی سائنسی سوشلزم، یا تشدد پر مبنی استبدادی نظام کے حامی ہیں۔ ہلاکت گریز شعبے پر ماضی کی اقدار کا بوجھ نہیں ہے۔ اب وہ خود ایک مختلف قدر ہے۔

تعارفی کورسوں سے ڈاکٹریٹ کے مطالعہ تک فضیلت کی موجودہ پیش روی کو تصرف میں لاتے ہوئے، یہ شعبہ ہلاکت گریز سماجوں کے حصول اور برقراری کے لیے مطلوب امتیازی خصوصیات اور ہنرمندیاں پروان چڑھانے کی جامع و مانع جستجو کرتا ہے۔ اس ضمن میں چار مہارتیں بنیادی ہیں۔ ان مہارتوں میں تحقیق، تعلیم و تربیت، عمل اور ابلاغی میڈیا اور روزمرہ زندگی میں فکر کا اظہار شامل ہے۔

آغاز میں ہی طلبا کو انسانی تاریخ کی ہلاکت آفریں میراث سے شدید طور پر سابقہ پڑتا ہے اور انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ وہ پیشہ ور ماہرین سیاسیات یا شہریوں کے خدمت گزار رہنماؤں کی حیثیت سے، انسانی کردار سے ہلاکت ختم کرنے کا چیلنج قبول کریں۔ اس کے بعد انہیں اختراعیت (بورسٹن 1983ء؛ 1992؛ 1998ء)، سیاسی تبدیلی (فائنر 1997ء)، اور سماجی زندگی کے ہر میدان میں انسانی شرف کو فروغ دینے والی پُرامن خدمت کی زندگیوں کے لیے (جوزف سن 1985ء) انسانی صفات کے شعور سے کیا جاتا ہے۔

اس سے اگلا قدم ان اہم عصری چیلنجوں کا جائزہ لینا ہے جن کا تعلق مسئلہ کے حل میں شرکت (تشدد، معاشیات، انسانی حقوق، ماحولیات، امدادِ باہمی) عہد حاضر کے سیاسی اداروں اور مسئلہ کے حل کے طریقوں (مقامی، قومی، بین الاقوامی، عالمی) اور اس جدید علم

سے ہے جو ہلاکت گریزی کے تجزیے اور عمل کے اصولوں کی منطق سے متعلق ہے اور جس کے ذریعے ہلاکت گریز مستقبل کو ممکن بنانے کے لیے فیصلوں میں مدد مل سکتی ہے۔

ایک اگلا قدم یہ ہے کہ طلباء کو مسائل کے حل کے لیے متبادلات کے امکانات تلاش کرنے کے مواقع دیئے جائیں۔ اس عمل میں وہ مسئلے کے حل میں شرکت اور کمیونٹی سروس میں باہمی تعلق پیدا کریں۔ اس سے انہیں مفادات اور صلاحیتوں کو جانچنے اور یکجا کرنے کا موقع ملے گا۔ اس مقصد کے لیے انہیں تحقیق، تدریس کی تربیت، لیڈر، سیٹزن ایکشن، اور تنقیدی سیاسی قدر پیمائی جیسے عوامل سے متعارف کرانا ضروری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کثیر العناصر مفادات اور اہلیتوں کے امکانات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ بلکہ اس امر کو تسلیم کرنا ہے کہ شراکت کے چاروں طریقوں کو غیر متشدد سماجی تبدیلی کو آسان بنانے کی جستجو میں انتہائی اولیت دینی چاہئے۔ باہمی معاون صلاحیتوں کو تسلیم کرنے اور ان میں تعاون پیدا کرنے کی ضرورت ہے، جو دیہی دستکاروں اور کھیلوں میں اول درجے کی ٹیموں کا خاصہ ہوتا ہے۔

ان تیاریوں کے ساتھ دوسرا قدم انفرادی یا گروپ منصوبوں پر توجہ مرکوز کرنا ہے تاکہ جسمانی تشدد، ساختیاتی تشدد، انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں، ماحولیاتی تنزلی اور مسئلہ کے حل کے تعاون میں موجود تشدد پر مائل مخاصمتوں کے متبادلات تخلیق کرنے کے لیے تحقیق، تعلیم، سرگرمی، اور تنقیدی غور و فکر میں مناسب مہارتیں استعمال کی جائیں۔ ان منصوبوں کا رخ مقامی، قومی، بین الاقوامی یا عالمی صورتحال کے مطابق متعین کیا جا سکتا ہے۔ گریجویٹنگ تھیسز کے طور پر پیش کردہ، ان منصوبوں کے نتائج، شعبہ جاتی میموری بنک میں جمع کرا دیے

جاتے ہیں اور انفرادی اور معاشرتی فیصلہ سازی میں مدد دینے کے لیے ورلڈ وائڈ ویب پر جاری کر دیے جاتے ہیں۔

گریجویٹ افراد سرکاری ملازمت اور شہری سماج میں تخلیقی پیشوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ (متعلقہ اداروں کی تفصیل ذیل میں ملاحظہ فرمائیں)۔ وہ ہلاکت گریز علمِ سیاسیات میں متعلقہ ایم اے اور پی ایچ ڈی پروگراموں میں اعلیٰ تربیت حاصل کر سکتے ہیں، علمِ سیاسیات کی تحقیقات کے موجودہ شعبوں میں داخل ہو سکتے ہیں یا اس سلسلے میں نئے شعبے تخلیق کر سکتے ہیں (ضمیمہ جات بی، سی)، یا دیگر شعبوں اور پیشوں میں دلچسپی لے سکتے ہیں۔

یہ شعبہ علم اور مہارت دونوں کو آگے بڑھاتا ہے اور اس حوالے سے ابتدائی سے لے کر ڈاکٹریٹ کے اعلیٰ مطالعے تک کا احاطہ کرتا ہے۔ فیکلٹی اور ڈگری کے امیدوار مسئلہ حل کرنے کے خصوصی تقاضوں کے لیے شراکت کے طریقوں کے اطلاق میں مشترکہ دلچسپیوں کے گرد ہر سطح کے درمیان اختراعی تعلق قائم کرتے ہیں۔ یہ شعبہ صریحی طور پر نئی فہم کی دریافت، تعلیم و تربیت میں اس کے استعمال اور سماجی مسئلے کے حل میں اس کے اطلاق کے درمیان باہمی طور پر معاون تعلقات کے قیام میں آسانی فراہم کرنے کی سعی کرتا ہے۔ یہ خود اپنے ابلاغ اور تنازعات حل کرنے کے طریقوں میں ہلاکت گریز سماج کی صفات کی نظیر پیش کرنے کی تدریجی طور پر سعی کرتا ہے۔ برابری کی بنیاد پر مردوں اور عورتوں کے درمیان مخلوط جنسی رفاقت کا کلچر معروف اور محترم ہے۔ یہ ایک ہلاکت گریز سماج کی روح ہے۔ اس امر کا اہتمام کیا گیا ہے کہ گریجویٹ افراد سے ان کے کیریئر کے عرصے کے دوران فیڈ بیک حاصل

کیا جائے تا کہ تحقیق کی نئی ضروریات کی نشاندہی ہو سکے اور طلبا کو مناسب تیاری کے لیے مشورہ دیا جا سکے اور وہ مستقبل کے اہداف کے لیے خود کو تیار کر سکیں۔ تجربہ کار کمیونٹی رہنما اور دیگر شعبوں کے ساتھی، بعض اوقات مشترکہ تقریروں کے ذریعے، کالجوں کے طلبہ کو تخلیقیت میں مدد دیتے ہیں۔ چونکہ ہلاکت گریز علم اور ہنرمندیاں عالمگیر ہوتی ہیں، لہٰذا یہ شعبہ راست شرکت اور کمپیوٹرائزڈ اور دیگر ابلاغی نظاموں کے ذریعے دنیا بھر کے کالجوں کی ذہانتوں کو شریک کرتا ہے۔ مقامی کمیونٹی کو بھی عملی طور پر اس تناظر میں دیکھا جاتا ہے کہ وہ عالمی فلاح کی راہ میں حائل مسائل سے نبرد آزما ہوتی ہیں۔

شانتی سینا یونیورسٹی

ہلاکت گریز سماجوں کا قیام عمل میں لانے کا مطلب یہ ہے کہ طلباء کی ایک غیر متشدد کمیونٹی سروس کے دستے تشکیل دیئے جائیں جو ملٹری ٹریننگ کا متبادل ہوں جو دنیا کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں یا تو فراہم کی جا سکتی ہے یا اُس کی ضرورت ہوتی ہے۔ علمِ سیاسیات کا شعبہ قائدانہ ذمہ داریاں اٹھا سکتا ہے لیکن اس کے ارکان تمام شعبوں سے لیے جانے چاہئیں۔

شانتی سینا ___ کا نام ہی اس کے بارے میں سب کچھ کہہ دیتا ہے، وہ ایک منضبط، نمایاں طور پر قابلِ شناخت قوت ہے جس کے ارکان تنازعے کے غیر متشدد حل اور مصالحت،

کمیونٹی کی سلامتی اور شہری دفاع، جان بچانے والی طبی معاونت، حادثات میں دستگیری اور کمیونٹی تقاضوں کے جواب میں تعمیری خدمات کے لیے تربیت یافتہ ہیں۔ یہ شراکت علمی کام کے متوازی اور معاون ہوتی ہے اور قیادت کے کردار اور ہنرمندیوں کی نشوونما کرتی ہے۔ یہ زندگی کو مامور کرنے والے تمام عقائد کے جذبوں، موسیقی اور فنون کی بلند کرنے والی روح، کھیلوں کی قوتِ حیات اور دوسروں کی حقیقی خدمت کی آسودگی پر توجہ دیتی ہے۔ بحران کے عرصوں میں شانتی سینا کو طلب کیا جاسکتا ہے کہ وہ کیمپسوں میں اور کیمپسوں سے باہر خدمات انجام دے اور وہ دیگر سماجی اداروں کے لیے باصلاحیت قیادتیں مہیا کرتی ہے۔ اسے بالکل اسی طرح سرمایہ اور تعاون فراہم کیا جاسکتا ہے جس طرح فوجی خدمات کے لیے عصری تربیت دینے والوں کو فراہم کیا جاتا ہے۔ اسے ماقبل یونیورسٹی تعلیم کے لیے بھی اختیار کیا جاسکتا ہے۔ تعلیمی اداروں میں شانتی سینا منظّم کرنے کے لیے عملی تجربے کا قابلِ قدر حوالہ ہندوستان میں گاندھی یونیورسٹی میں پروفیسر این رادھا کرشنن کے کام نے مہیا کیا ہے (رادھا کرشنن 1997a ء؛ 1997b ء)۔ اس ضمن میں تربیت کے اُن اصولوں اور عملی طریقوں کو شامل کیا جاسکتا ہے جو 47-1930ء کے دوران 80,000 افراد پر مشتمل ایک مضبوط غیر متشدد مسلم فوجِ آزادی، خدائی خدمت گار (بینرجی 2000ء:102-73) اور کنگ تحریک برائے غیر متشدد سماجی تبدیلی (لافیت اور جین سین 1995؛1996) نیز دیگر غیر متشدد تربیتی تجربات (واررِیزسٹرز لیگ 1989) کے نتیجے میں ابھرے اور سامنے آئے۔

ہلاکت گریز یونیورسٹیاں

ہلاکت گریز سماجوں کی تشکیل کے لیے ایسے علم اور مہارتوں کی ضرورت ہوتی ہے جسے کسی یونیورسٹی کا کوئی شعبہ یا کلیہ پورا نہیں کرسکتا۔ اس لیے، علم سیاسیات کو ہلاکت گریز علم سیاسیات میں تبدیل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سماجی سائنس، نیچرل سائنس، ہیومینیٹز اور دیگر پیشہ ورانہ شعبوں کی سرگرم معاونت اور تعاون کیا جائے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پوری یونیورسٹی، خود کو، مقامی، قومی، بین الاقوامی اور عالمی برادری کے لیے ہلاکت گریز خدمات کی فراہمی کے لیے وقف کردے۔

یونیورسٹیوں نے خود کو اس بات کا اہل ثابت کیا ہے کہ وہ جنگوں کے دوران ہلاکت آفرینی کے لیے علمی اور انسانی وسائل کو یک جا اور منظّم کرنے کی مکمل صلاحیتیں رکھتی ہیں۔ جیسا کہ ہارورڈ یونی کے پروفیسر نے 18 جون 1942ء کو یہ اعلان کیا تھا کہ ''اس دن کو جلد از جلد قریب لانے کے لیے کہ جب محوری طاقتیں (Axis Powers) غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیں، ہم نے اب عالموں کی اس قدیم سوسائٹی کے تمام وسائل وقف کرنے کا فیصلہ کیا ہے''۔ جنگ سے وابستگی کے اس عہد نے ہارورڈ یونیورسٹی کی ادارہ جاتی تشکیل نو کی اور اسے ''کوئینٹ کے اسلحہ خانے'' کے طور پر شہرت حاصل ہوئی۔ ہارورڈ میں فزکس کے نوجوان طلباء کو لاس الاموس اور نیو میکسیکو کے انتہائی خفیہ بین الشعبہ جاتی اسٹریم پروجیکٹ میں کام کرنے کے لیے بھرتی کیا گیا۔ اس صورتحال کے حوالے سے کسی نے اپنی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے کہا

تھا ''یہ بالکل ایک سائنسی یوٹوپیا کی طرح تھا..... ایک کھلی سوسائٹی (ہارورڈ یونیورسٹی) کے دستیاب بہترین دماغ عمر، علمی مرتبے اور ماضی کی کامیابیوں سے ماورا ہوکر آزادانہ طور پر خیالات کا تبادلہ کررہے تھے'' (ہارورڈ میگزین۔ستمبر۔اکتوبر 1995: کور 43-32)

یونیورسٹیاں، خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید، کیا ان سب کو بھرپور جذبے سے جنگوں کے خاتمے اور ہلاکت آفرینی کی تمام شکلوں کو ختم کرنے کا ہدف نہیں اپنا لینا چاہیے جو انسانی بقا اور فلاح کے لیے خطرہ ہیں؟ ''مطالعہ امن'' کے نصابوں، پروگراموں یا شعبوں کو متعارف کرانے یا ملٹی ڈالرعطیات کے پروگراموں میں ''اخلاقیات'' اور ''اقدار'' کے حوالے سے ''عدم تشدد'' کو ایک مرکزی موضوع کے طور پر شامل کرنے سے گریز، وہ بنیاد ہے جس کے تناظر میں یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں ہلاکت گریزی کے موضوع کی شمولیت کے کیا امکانات ہیں۔

ہلاکت گریز سیاسی پارٹیاں

اطلاقی ہلاکت گریز علم سیاسیات سے مفہوم، ہلاکت گریز سیاسی جماعتوں کی خدمات ہیں جو وہ سماج میں سب کی فلاح کے لیے مسائل کے حل کے تقاضوں کو پورا کرنے کے ضمن میں فراہم کرتی ہیں۔ایسی پارٹیوں کا عام اصطلاحی نام اہنسا سروودیا پارٹی (اہنسا، عدم تشدد؛ سروودیا، سب کی بھلائی) ہونا چاہیے۔ایسی پارٹیوں کو تخیل، نام، تنظیم اور سرگرمیوں میں تخلیقی

طور پر ابھرنے کے لئے مخصوص سماجی ثقافتی حالات درکار ہیں۔

ہلاکت گریز پارٹیوں کے اہداف میں، مقامی اور عالمی سطح پر ہلاکت گریز سماجوں کے قیام میں مدد فراہم کرنا شامل ہے۔ یہ ماضی کی پارٹیوں سے ان معنوں میں مختلف ہیں کہ یہ طبقاتی بنیاد پر قائم نہیں ہوتیں بلکہ سب کے مفادات کو یکجا کرتی اور ان کا اظہار کرتی ہیں___ کیونکہ ہلاکت آفرینی اور اس کے تلازمات سے اور آزادی، عدل اور مادی فلاح کی ہلاکت گریز صورتحال کی موجودگی سے ہر فرد فائدہ اٹھاتا ہے۔ ہلاکت گریز اصولوں پر مقابلہ کرنے والی، متعدد پارٹیوں کے وجود کی توقع کی جاسکتی ہے۔

انتخابی مقابلے، سرکاری پالیسی سازی، اور دیگر سیاسی سرگرمیوں میں ہلاکت گریز سیاسی پارٹیوں کی قبل از وقت تعمیری شرکت، براہِ راست سیاسی شرکت کے خلاف گاندھی کی ممانعتوں سے انحراف ہے۔ دسمبر 1947ء میں غیر متشدد تعمیری کارکنوں کو گاندھی کی آخری ہدایت یہ تھی کہ وہ سیاست سے دور رہیں کیونکہ سیاست لازمی طور پر بدعنوان بنا دیتی ہے (منتخب تصانیف 90: 4-223)۔ اس کی بجائے، ایک غیر متشدد سماج کے لئے کام کرنے والوں کو سیاستدانوں اور پالیسی پر باہر سے اثر انداز ہوتے ہوئے، سول سماج میں ان لوگوں کے درمیان کام کرنا چاہیے جن کی احتیاجات سب سے بڑی ہیں۔ منطقی طور پر اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ دوسرے لوگوں کو بدعنوان بننے دیا جائے اور ایسے فیصلے کرنے دیے جائیں جو اربوں ڈالر کے ٹیکس نچوڑنے کے ساتھ، کروڑوں لوگوں کو اور سماجی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کریں جن میں جنگ، سلامتی، خوراک، لباس، رہائش، صحت، تعلیم، معیشت، ثقافت، اور ماحولیات

جیسے پہلو شامل ہیں۔ جبکہ غیر متشدد سرگرم کارکن اور ان کے لوگ، بدعنوان لوگوں اور ان کے حامیوں پر اثر انداز ہو کر اچھے کام کرانے کی سعی کرتے ہیں۔ بہر حال، گاندھی نے دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی غیر سیاسی ہدایت میں شراکتی پیش بینی کو شامل کیا انہوں نے کہا:

''لیکن ایک مرحلہ آ سکتا ہے جب لوگ خود محسوس کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ انہیں حکمرانی کرنے کے لیے کسی اور کی نہیں ہماری ضرورت ہے۔ اس سوال پر اس وقت دوبارہ غور کیا جانا چاہیے''(223)۔

ہلاکت گریز سیاسی پارٹیاں ہلاکت گریز سماجی تبدیلی لانے میں مدد دینے والے منطقی اداروں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے ابھرنے کے لیے فطری حالات وسیع طور پر مختلف ہوں گے۔ یہ کام کہیں بھی آسان نہیں ہوگا، حتیٰ کہ وہاں بھی جہاں پارٹیاں، انتخابات، اور منتخب ادارے سماجی طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ہلاکت گریز سیاسی پارٹیاں ایسے عمل اور پالیسیوں کی مدد کرنے کے لیے تدریجی ایثار پسندانہ جدوجہد میں شریک ہوسکتی ہیں جو سب کے تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ چند موجودہ نزاعی مسائل کا مشاہدہ کرنے سے نئی بصیرت، نئی مہارتوں، تنظیم کی نئی شکلوں اور مسئلہ کے موثر حل کے عمل میں نئی پالیسیوں کو مربوط کرنے کے حوالے سے درپیش چیلنج سامنے آتے ہیں۔ ان میں اسقاطِ حمل، سزائے موت، جبری خدمت، جنگ، مسلح انقلاب، دہشت گردی، نسل کشی، بدکاری، سماجی تشدد، ثقافتی تشدد، ترکِ اسلحہ اور معاشی عسکر کاری شامل ہے۔ تاہم تخلیقیت، حوصلہ مندی، عالمی یکجہتی اور سماجی آموزش کے عمل کے ذریعے اس ضمن میں ارتقائی مراحل سے گزرا جا سکتا ہے۔

عدم تشدد کے سرکاری خدمات کے شعبے

حکمرانی کی تمام سطحوں پر، کابینہ کی ذمہ داریوں کے ساتھ، عدم تشدد کے لئے سرکاری خدمات کے شعبے ضروری ہیں۔ ان کے فرائض میں ہلاکت گریز سیاسی تجزیے کی منطق سے متعلق کمیونٹی صورتحال کی نگرانی کرنا، ہلاکت کا تدارک اور مابعد ہلاکت بحالی کے لیے پیشہ ورانہ تربیت کی حمایت کرنا، اور ہلاکت گریز کمیونٹی فلاح کے حوالے سے سرکاری پالیسیوں پر مشورہ دینا شامل ہے۔ چونکہ تشدد کی صورتحال، ایک کمیونٹی کے معیارِ زندگی کو از راہِ نفوذ متاثر کرتی ہے، لہٰذا اس مسئلے پر سرکاری خدمات کی توجہ اتنی ہی ضروری ہے جتنی گندگی، صفائی یا صاف پانی کی سپلائی کی فراہمی کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

عدم تشدد کا محکمہ، تشدد کے اعداد و شمار اور تمام سرکاری اور نجی ذرائع سے تشدد کے خاتمے کے اقدامات کے لیے تجاویز اور سفارشات مرتب کرے گا۔ یہ ایک خود مختار محتسب ادارے کے طور پر سرکاری فیصلہ سازوں اور سول سماج کے ارکان کے لیے ہلاکت گریز پالیسی تجاویز کے ساتھ ساتھ صورتحال کی معیادی رپورٹیں تیار کرے گا۔ اجمالی نگرانی کے متقاضی دائرہ کار میں قتل اور خودکشی؛ گھریلو تشدد (بچے، خواتین، بیوی، سن رسیدہ افراد)؛ تعلیمی ادارے میں تشدد؛ کام کرنے کی جگہ پر تشدد؛ فوجداری اور گروہی تشدد؛ پولیس تشدد؛ جیل میں تشدد؛ میڈیا تشدد؛ کھیلوں کا تشدد؛ سیاسی تشدد؛ فوجی۔ نیم فوجی۔ گوریلا تشدد؛ اور قاتلوں، ان کے رشتہ داروں، متاثرین کے رشتے داروں پر اور عام سماجی شعور پر مابعد

ہلاکت آفرینی جراحتی ذہنی دباؤ کے اثرات جیسے امور شامل ہیں۔ ان رپورٹوں میں غیر متشدد قلب ماہیت کی صلاحیتوں کی قوت اور کمزوریوں پر توجہ دینا چاہیے اور مسئلہ کے زیادہ موثر حل اور اقدامات کے لیے تجاویز تیار کرنا چاہیے۔ پیش کی جانے والی اس رپورٹ کی نمایاں خصوصیت حصص بازار کے بھاؤ میں اتار چڑھاؤ، کھیلوں کے اسکور، یا موسم کی صورتحال کے مقابلے میں کم نہیں ہونا چاہیے۔

ہلاکت گریز مشترکہ سلامتی کے ادارے

ہلاکت گریز سماجوں کے لیے روایتی فوج اور پولیس سے ملتے جلتے، ہلاکت گریز مشترکہ سلامتی کے ادارے درکار ہیں، تاکہ زمین، سمندر اور فضا کے ذریعے حفاظتی اور انسان دوست خدمات کی کارروائیاں عمل میں لائی جائیں۔ ایسی افواج کو تدارک، بحران پر قابو پانے، بحالی کے اقدامات، اور اثر انگیزی کی مابعدِ اقدام تخمینہ کاری کے لیے تربیت دی جانا چاہیے۔ موجودہ فوجی اور پولیس اکیڈمیوں سے یا نئی غیر متشدد سروس اکیڈمیوں سے قیادت حاصل ہوسکتی ہے، نئی اکیڈمیوں کی قلبِ ماہیت میں سب بلا امتیاز تربیت حاصل کر سکتے ہیں، بعدازاں مخصوص فریضوں کی ذیلی مہارت حاصل کی جاسکتی ہے۔ یونیورسٹیوں کی شانتی سینا قیادت کا ایک اور ذریعہ بن سکتی ہے۔

بعض فوجی اور پولیس کے اداروں میں تشدد کی روک تھام، معمولی طور پر مسلح ہوکر امن

وامان کی برقراری اور انسان دوست امدادی کارروائیوں میں شرکت، غیر ہلاکت آفریں ہتھیاروں کی افادیت کی جستجو، اور تنازعہ حل کرنے کے غیر متشدد طریقوں کی تربیت کی قبولیت کے موجودہ رجحانات کے پیش نظر، غیر متشدد مشترکہ سلامتی کی افواج تیار کرنے کے امکانات کو سرسری انداز میں مسترد نہیں کرنا چاہیے۔

غیر متشدد مشترکہ سلامتی سے مراد مقامی، قومی، اور بین الاقوامی سطحوں پر تمام آبادیوں کی شمولیت ہے۔ رہائشی علاقوں، اسکولوں، عبادت گاہوں، کام کی جگہوں اور الیکٹرونک رابطوں کے ذریعے زیادہ مربوط مشترکہ سلامتی کی کمیونٹیز میں موجود غیر متشدد مطالعاتی حلقوں اور شہری شانتی سینا کو منظّم کر کے اس کام کو آسان بنایا جا سکتا ہے۔ مقامی شہری تنظیم کاری کے نمونے متعدد شعبوں میں پہلے ہی موجود ہیں جن پر عمل کیا جا سکتا ہے۔

غیر متشدد سلامتی سے مراد قومی اور قومی حدود سے بالا سطحوں کی غیر متشدد سلامتی کونسلیں اور غیر متشدد انٹیلی جنس ایجنسیاں نیز سفارتی اداروں میں غیر متشدد کلچرل اتاشی بھی ہیں۔ فطری طور پر تشدد پر مائل قومی ریاستوں اور ان کے اتحادیوں کو پالیسی متبادلات مہیا کرنے کے لئے غیر متشدد مشترکہ سلامتی کونسلیں ضروری ہیں۔ مثال کے طور پر وہ اقوام جو اقوام متحدہ کی رپورٹوں کے مطابق قومی ہلاکت آفرینی کے اشاریے میں سب سے نچلی سطح پر ہوں یعنی وہ جو ہری ہتھیار اور فوجیں نہ رکھتی ہوں، جہاں سزائے موت نہ دی جاتی ہو، جہاں قتل کرنے کی شرح بہت کم ہو، جو اقوام اسلحے کی تجارت نہ کرتی ہوں وغیرہ وغیرہ، وہ ایک غیر متشدد عالمگیر مشترکہ سلامتی کونسل تشکیل دے سکتی ہیں۔ ابلاغ کی تحقیقاتی ماس میڈیا اور چوکس شہریوں کے

ساتھ غیر متشدد انٹیلی جنس ایجنسیوں کی ضرورت ہے جو ہلاکت آفرینی کی تمام شکلوں اور خطروں کو بے نقاب کریں اور ان کی تلافی کرنے والے سرکاری اور نجی قلب ماہیت کے اقدامات کے لئے صلاحیتوں کی نشاندہی کریں۔ سفارتی اداروں میں عدم تشدد کے ماہرین کی ضرورت ہے جن کا رتبہ روایتی فوجی اتاشیوں یا معاشی تعلقات کے لیے ذمہ دار افسروں سے کم نہ ہو۔ غیر متشدد کلچرل اتاشی اپنے ملک اور میزبان ممالک میں غیر متشدد فلاح کے تمام ذرائع کے درمیان تحقیق، باہمی علمیت اور تعاون کے پل تعمیر کرنے کی جستجو کرتے ہیں۔ گلوبل انٹرنیٹ صلاحیتیں عالمی سطح پر، مشترکہ سلامتی سے متعلق اطلاعات شہریوں کی شراکت کی بنیاد فراہم کرتی ہیں جس سے متفقہ غیر متشدد اقدامات کے امکانات پیدا ہوں گے اور جن کا انحصار سرکاری، کارپوریٹ یا میڈیا کی جانب سے صورتحال کی روایتی تشریح پر نہ ہوگا۔

سرکاری اور نجی تنظیموں میں ہلاکت گریز سرکاری خدمت کے لیے مہارتوں میں اضافہ غیر متشدد تربیت کے مناسب اداروں کا تقاضہ کرتا ہے۔ ابتدا میں ایک ذیلی جز اور بالاخر مکمل طور پر باعمل اور ہم پلہ ہلاکت گریز تربیتی اداروں کی ضرورت ہے جو جنگی کالجوں، قومی دفاع کی یونیورسٹیوں، فوجی خدمات کی اکیڈمیوں، پولیس اکیڈمیوں، اور پبلک ایڈمنسٹریشن کے اسکولوں نیز سول سماج میں دیگر تشدد پسند پیشہ ورانہ تربیتی اسکولوں کے متبادل کے طور پر جگہ لے سکیں۔

ہلاکت گریز سول سماج کے ادارے

ہلاکت گریز سماجوں کے ظہور، برقراری اور ہلاکت گریز سماجوں کے تخلیقی امکانات لامحدود ہیں۔ ہلاکت گریزی پر مبنی بیشتر ادارے پہلے ہی نمودار ہو چکے ہیں اور خصوصی اہمیت کے حامل دیگر اداروں کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

ہلاکت گریز روحانی کونسلیں (پنچایتیں): ہر سطح پر یا سماج کے، ہر اہم مرکز اور دائرے کے لیے، ہلاکت گریز روحانی پنچایتوں کی ضرورت ہے تاکہ پیدائش سے موت تک تمام معاملات میں زندگی کے غیر مبہم احترام کا اعتراف کیا جائے۔ اس نوع کی بین المسالک پنچایتیں متعلقہ ماحول سے مناسبت رکھنے والے عقیدے یا فلسفے سے جڑی ہوئی ہونی چاہئیں، جو اپنی روایات کی طاقتور ہلاکت گریز سچائیوں کو مشتہر کریں اور انہیں متحد کرنے کی جرأت مند صلاحیت کی حامل ہوں۔ اس قسم کی پنچائتیں تشدد کے حامی ان روایتی مذہبیوں اور سیکولر عذر خواہوں کا متبادل بن کر انسانی ماحول سے ہلاکت آفرینی کو ختم کرنے کے لیے سرکاری، نجی، مقامی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر ہونے والی کوششوں کو جذبہ اور تقویت فراہم کر سکتی ہیں۔ ہر الہام کے ماخذ کو بنیاد بنا کر، ہلاکت گریز روحانی پنچایتیں، ہر فرد اور سماجی ادارے کی داخلی اخلاقی قوت کو ابھار کر بنی نوع انسان کے ہلاکت گریز باطن کو مستحکم کرنے میں اہم معاون بن سکتی ہیں۔

ہلاکت گریز مشاورتی گروہ: عالمی وسائل تک رسائی حاصل کر کے ایسے مشاورتی اور صلاح کار گروہوں کی ضرورت ہے جو سماجوں کے اندر اور ان کے درمیان مسئلہ کے متبادل حل کی نشاندہی میں مدد کریں۔ ہدف سے متعلق روحانی، سائنسی، ماہرانہ، تنظیمی اور دیگر ذرائع کو یکجا کرتے ہوئے، اس قسم کے گروہ، بلاواسطہ یا بالواسطہ، ان سب لوگوں کی مدد کے لیے خود کو قابلِ رسائی بناتے ہیں جو خونریزی روکنے، جاری قتل عام کو بند کرنے اور مستحکم افہام وتفہیم اور تعمیرِ نو کے حالات پیدا کرنے کی جستجو کرتے ہیں۔ اس نوع کی ہلاکت گریز مشاورتی ٹیموں کے کام کرنے کا طریقہ اُن روایتی مذاکرات کاروں سے مختلف ہوتا ہے جنہیں ہلاکت کی دھمکی یا معاشی پابندیاں عائد کرنے جیسے عوامل کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ مشاورتی ٹیموں کے کام کا طریقہ اخلاقی ترغیب کاروں کی تنہا آوازوں کی طرح بھی نہیں ہوتا۔ یہ مشاورتی ٹیمیں ہلاکت گریزی سے غیر مبہم وابستگی کے ساتھ متنوع صلاحیتوں کو یکجا کر کے اور متشدد ریاستوں اور اُن کے ہلاکت آفریں مخالفین سے آزاد ہو کر کام کرتی ہیں۔ نجی سرمائے سے چلنے والے ایسے اداروں کی ضرورت ہے جو اس نوع کی مشاورتی خدمات فراہم کرنے کی اہل ہوں جو ان کے تجربات کا میزان لگائیں، اور ان کی اثر پذیری میں اضافہ کریں۔ کوئکر کی تنازعہ نپٹانے کی مہارت اور انسان دوست خدمات، نیز دیگر مذہبی اور انسان دوست امدادی ایجنسیاں، ان تنظیموں کی ابتدائی اور جُزوی مثالیں ہیں جن کی ہمیں ضرورت ہے۔

قومی حدود سے بالا مسئلے کے حل کے اتحاد: "top down" ہلاکت گریز

سیاسی اداروں (مثلاً پارٹیاں، سرکاری خدمات کے شعبے اور مشترکہ سلامتی کے ادارے) کے تکملہ کے لیے طاقتور تغیر کے قابل ہلاکت گریز قوتوں کا "bottom up" کنسورشیا (اتحاد) درکار ہے۔ اس کی ایک مثال ان ریپریزنٹیٹو نیشنز اینڈ پیپلز آرگنائزیشن (یو این پی او) ہے، جو اقوام متحدہ، حکومتوں اور دیگر اداروں پر اپنے اجتماعی انسانی حقوق تسلیم کرانے کے لیے اثر انداز ہونے کے غیر متشدد اقدام پر غیر مبہم طور سے وابستہ مختلف شناخت کے حامل لوگوں کا اتحاد ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل، گرین پیس اور انٹرنیشنل فیلوشپ آف ری کنسی لی ایشن اس کی دوسری مثالیں ہیں۔ ہلاکت گریز کنسورشیا کے شرکا کے لیے ارکان کی جانب سے پیش کیے گئے ہر موقف سے متفق ہونا ضروری نہیں سوائے اس موقف کے کہ عالمی صورتحال سے ہلاکت کو نکال دیا جائے۔ اس نوع کے کنسورشیا کو ہلاکتوں کی قیف کے منطقوں میں اور تشدد، معاشیات، انسانی حقوق، ماحولیات، اور امداد باہمی کے مسائل کے حل کے اہم شعبوں میں اندر اور آر پار قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ واقعتاً ایک ہلاکت گریز دنیا کے لیے عالمی شہریوں کا ایک طاقتور کنسورشیا، عورتوں اور مردوں کی ایک رفاقت کو عالمی فلاح کی ایک قوت کے طور پر ابھرنا چاہیے۔

ہلاکت گریز تربیتی ادارے: تشدد کے اثر پذیر خطرات سے آگہی اور اختراعی غیر متشدد متبادلات کے تقاضے جوں جوں شدت اختیار کر رہے ہیں، تنازعہ نپٹانے اور غیر متشدد سماجی تبدیلی کے لیے غیر متشدد رہنمائی کی صلاحیتوں میں تربیت کے تقاضوں میں بھی

اضافہ ہورہا ہے۔ کنگ، گاندھی، بدھ مت، عیسائیت، اور سیکولر نظریات کو ماننے والے غیر متشدد روایات کے ماہر تربیت کاروں کی شدید طلب ہے۔ ضرورت اور طلب کا دائرہ سماجی عدل کے ہر مسئلے پر شہریوں کی تحریک سے لے کر اسکولوں، کارخانوں، پولیس اور قید خانوں جیسے اداروں تک پھیلا ہوا ہے۔ کسی بھی دوسری مہارت کی طرح غیر متشدد شہری تربیت مہیا کرنے، اور پیشہ ور تربیت کاروں کو تیار اور انہیں سند فراہم کرنے کے لیے سول سماج کے اداروں کی ضرورت ہے۔

ہلاکت گریز قائدانہ مطالعہ اور حیات بخشی کے مراکز: ایسے اداروں کی ضرورت ہے جہاں غیر متشدد تنظیموں اور تحریکوں کے رہنما، معین عرصے کے لیے حیات بخشی، مسلسل غور وفکر، تصنیف اور تجربات کے تبادلے کے لیے آسکتے ہوں۔ غیر متشدد سماجی تبدیلی لانے کی زندگی کے لیے پُرخطر، ذہنی دباؤ والی سرگرمیوں میں مصروف رہنماؤں کے لیے قید یا اسپتال میں داخل ہوکر ہی سکون کے لمحات میسر آتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ایک رضا کار غیر متشدد عملی ہم قدر کی ضرورت ہے۔ جہاں رہنماؤں پر تشدد کیا جاتا ہو وہاں تشدد کے متاثرین کی بحالی کے مراکز کے ساتھ تعاون ضروری ہے۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے، رہنمائی کے غیر متشدد مراکز، روحانی اور جسمانی حیات بخشی، خودنوشتی اظہار اور سوانحی مطالعہ، مختلف ممالک سے ہلاکت گریز اصولوں سے یکساں طور پر وابستہ تجربہ کار ساتھیوں کے ساتھ مکالموں، اور آئندہ کی پیش قدمیوں کی بصیرت افروز غور وفکر کے لیے مواقع فراہم کرسکتے

ہیں۔ یہ مراکز خود مختار ادارے کے طور پر نجی تحویل میں دیے جا سکتے ہیں یا ہلاکت گریز سماجی تبدیلی سے وابستہ میزبان ادارے انہیں اپنی سرپرستی میں لے سکتے ہیں۔

فنون میں ہلاکت گریز تخلیقیت کے مراکز: فنون کے اندر اور ان کے درمیان ہلاکت گریز تخلیقیت کی حوصلہ افزائی کے لیے مراکز کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں سوئس مصنف رومین رولینڈ نے ٹالسٹائی کا یہ قول نقل کیا ہے، ''فن کو چاہئے کہ وہ تشدد کو دبائے، اور یہ کام صرف فن ہی انجام دے سکتا ہے'' (رولینڈ 1911ء: 203)۔ شیلے کی شاعری میں عدم تشدد کا مطالعہ کرتے ہوئے، آرٹ ینگ کا کہنا ہے، ''عدم تشدد سیاسی فکری نظام سے بھی سوا ہے؛ یہ شاعری اور زندگی کا لامحدود مواد ہے'' (1975ء: 165)۔ فوجی جوش و جذبے کے لیے فوجی موسیقی کی اہمیت یاد دلانے والی کنگ کی روایت میں ایک مقولہ ہے کہ ''اگر تمہارے پاس کوئی ترانہ نہ ہو تو تمہارے پاس کوئی تحریک بھی نہیں ہوگی'' (ینگ 1996ء: 161-184)۔

انسانی ہلاکت آفرینی کے جواب میں ہلاکت گریز تخلیقیت سرانجام دینے کے لیے ہر فکر کے فنکاروں کو یکجا کرنے کے مواقع فراہم کرنے کے لیے فنون کے درمیان یا مصوروں، شاعروں، اور مصنفوں کے درمیان تخلیقی کمیونیٹیز کو مالی تعاون فراہم کرنے والے نجی مراکز کے طرز پر ایک اداری نمونہ تیار کیا گیا ہے۔ وہ فنون جن میں ہلاکت گریز تخلیقیت کا چیلنج پیش کیا جا سکتا ہے ان میں ادب، شاعری، مصوری، مجسمہ سازی، موسیقی، رقص، تھیٹر، فلم، ٹیلی وژن،

فوٹو گرافی ،فن تعمیر، ملبوسات کے نئے نمونے تیار کرنا، اور ماس میڈیا کے کمرشل آرٹس شامل ہیں۔تشدد سے باہر آنے کی راہ تلاش کرنا تمام فنون کے لیے ایک چیلنج ہے۔مثال کے طور پر، روایتی قتل کے معموں کا ایک متبادل ہوسکتا ہے جس میں غیر متشدد جاسوس تخلیق کیا جا سکتا ہے جو قتل اور خودکشیوں کے وقوع کو ماہرانہ ذرائع سے روک سکتا ہے۔فنون کے مختلف شعبوں کے درمیان ہلاکت گریز تخلیقی عمل میں آہنگی پیدا کر کے تبدیلی سے متعلق اہم فریضوں کے لیے انسانی جذبوں اور تصورات کو ابھارا جا سکتا ہے۔

مختلف فنون میں ہلاکت گریزی کے لیے ہونے والے کام کو عالمی سطح پر تسلیم کرنے کی غرض سے ضروری ہے کہ مخیّر حضرات ایوارڈ جاری کریں۔حوصلہ افزائی کے حوالے سے ان کی اہمیت نوبل انعامات سے کسی بھی صورت کم نہیں ہونی چاہئے۔

ہلاکت گریز تحقیق اور پالیسی انالیسس انسٹی ٹیوٹس: جس طرح مختلف نجی ادارے حکومتوں اور عام لوگوں کو بین الاقوامی سلامتی کی پالیسیوں سے لے کر دیگر تمام مسائل جن میں سیاسی ،معاشی ،سماجی اور معاشرتی زندگی سے متعلق مسائل شامل ہیں مشاورت فراہم کرتے ہیں، بالکل اسی طرح ہلاکت گریز پالیسی اداروں کی ضرورت ہے جو سماجی سطح پر فیصلہ سازی کے لیے مطلوبہ معلومات اور تجزیہ فراہم کرسکیں۔یہ ادارے ،تشدد، معاشیات، انسانی حقوق، ماحولیات اور باہمی تعاون کے شعبوں میں ہلاکت گریز علم سیاسیات کی جانب سے مسئلے کے حل کی سرگرمیوں کو فروغ دے سکتے ہیں۔یہ روحانی پنچایتوں، پارٹیوں، مشترکہ

سلامتی کے اداروں، مشاروتی گروپوں اور دیگر شہری معاشرے کے اداروں کی عملی کاوشوں میں مدد دے سکتے ہیں نیز انفرادی طور پر شہریوں کو درکار معلومات فراہم کر سکتے ہیں۔

ہلاکت گریز ذرائع ابلاغ: ایسے ہلاکت گریز ذرائع ابلاغ کی ضرورت ہے جو فیصلہ سازی کے سرکاری اور نجی عمل میں مدد دینے کے لیے معلومات، خبریں اور تبصرے فراہم کر سکیں۔ اس سے وہ ذرائع ابلاغ مراد نہیں ہیں جو قتل نہ کرنے کی انسانی صلاحیتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بلکہ یہ ان روایتی ذرائع ابلاغ سے بلند (Beyond) ہوتے ہیں جن میں اکثر بلند آہنگ اور تفریحی انداز میں یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ قتل اور ہلاکتیں ناگزیر ہیں۔ ہلاکت گریز ذرائع ابلاغ کے ادارتی فیصلے، عبوری دور میں، ہلاکت گریز سیاسی تجزیہ کی منطق کو اجاگر کر سکتے ہیں۔ جس کا مطلب، تشدد کی حقیقت کی گہری تفتیش اور چھان بین اور برابر کی طاقت کی توڑ کرنے والی ہلاکت گریز حقیقتوں کے شعور کو اجاگر کرنا، تبدیلی کے عمل میں کامیابیوں اور ناکامیوں سے باخبر رکھنا، زندگی کے تمام فنون سائنس، بشری علوم، پیشوں اور روزمرہ زندگی کے مشاغل کے حوالے سے ہلاکت گریز تخلیقی امنگوں کو اظہار کی قوت فراہم کرتے ہیں۔ یہ انداز فکر ان ذرائع ابلاغ کی قدروں کا اسیر نہیں ہوتا جو دوامی ہلاکت آفرینی کے تصور کو چیلنج کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اور ظاہری یا باطنی طور پر، ذہنوں کو متشدد قنوطیت کے زیر اثر رکھنے میں مسلسل مدد کرتا ہے۔ اخباروں اور رسالوں میں، ریڈیو اور ٹیلی وژن پر، فلموں میں، اور عالمی کمپیوٹرائزڈ اطلاعاتی نیٹ ورکس پر اس نوعیت کی چیزوں کے متبادلات کی

ضرورت ہے۔ ہلاکت گریز علم سیاسیات کے ماہرین تبصرے اور تجزیوں کا ایک ذریعہ بن سکتے ہیں۔

ہلاکت گریز یادگاریں: ہلاکت گریز تہذیبی ورثے کی بازیافت اور اس کا جشن منانے کے لیے ہر سماج میں ، افراد، گروہوں، نامعلوم ہیرو اور ہیروئنوں کی قابل احترام یادگاروں کی تعمیر اور تقاریب منانے کی ضرورت ہے۔ ان تمام لوگوں کی یاد منانا اور انہیں خراج تحسین پیش کرنا ہوگا جنھوں نے قتل کرنے سے انکار کیا اور ہلاکت گریز عالمی تہذیب کے قیام کے طویل سفر میں اپنا کردار ادا کیا۔ اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ تاریخ کے ان فاتح اور شکست خوردہ قاتلوں کے مجسموں اور یادگاروں کو صاف کر دیا جائے جنھوں نے کرۂ ارض کو داغدار کر دیا تھا__ کیونکہ وہ تاریخی ہلاکت آفرینی کے حقائق کی یاددہانی کراتے ہیں۔ تاہم ہمیں یہ یاد دلانے کے لیے ہلاکت گریز یادگاریں ضروری ہیں کہ ہر دور میں غیر متشدد متبادلات کے حامی موجود رہے ہیں جو آج انسانی بقا کے لیے بتدریج ناگزیر بنتے جا رہے ہیں۔ نمایاں مقام دیے جانے والوں میں مذہبی شخصیات، متشدد قوت کے سامنے کلمہ حق کہنے والے شہدا، جنگ کی مزاحمت کرنے والے، اصولی اختلاف کرنے والے، سزائے موت کے مخالفین، امن کے شاعر، قید، تشدد، اور موت کے خطرات مول لیتے ہوئے تشدد کے بغیر ناانصافیوں کی مزاحمت کرنے والی عورتوں اور مردوں کے غیر معروف ہجوم شامل ہیں۔

امن کے ہلاکت گریز منطقے : تصور کردہ شہری سماج کے ادارے امن کے ہلاکت گریز منطقے ہیں جن کا دائرہ دیہی اور شہری کمیونیٹیز کی تنظیموں سے قومی اور بین الاقوامی معاہدوں تک وسیع ہے۔ مذہبی مقامات، مسلح انقلابی اور انقلاب مخالف فوجوں کے درمیان زد میں آئی ہوئی دیہی آبادی کی جانب سے اعلان کردہ امن کے منطقے، جنگ بندی کے قابل توسیع علاقے، اسلحے سے پاک سماجوں کے لیے تحریکیں، فوجداری اور گروہی تشدد سے رہائشی علاقوں کو پاک کرنے کی شہریوں کی کاوشیں اور ایٹمی ہتھیاروں سے پاک منطقے قائم کرنے کے لیے عالمی معاہدے اس کے پیشرو ہیں۔ باہمی مدد اور نفوذ کے لئے امن کے اس طرح کے منطقوں کے درمیان رابطہ پیدا کرنا، اور ان کے اندر ہلاکت گریزی کے مددگار ادارے متعارف کرانا ہلاکت گریز اداری نشوونما کا ایک اہم چیلنج ہے۔

ہلاکت گریز معاشی کاروباری ادارے: بعض لوگوں کے لیے جنگ اور تشدد کے کاروبار منافع بخش کہلائے جاتے ہیں جبکہ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ بہت سوں کے لیے نقصان کا باعث ہوتے ہیں، ہلاکت گریز فلاحی کاروباری اداروں کو سب کے لیے مزید نفع بخش ہونا چاہیے۔ ایک ہلاکت گریز اور غیر متشدد مواد اور ثقافتی اشیا، خدمات، تفریحات کو فرحت بخش متبادلات کے تناظر میں دیکھا جائے تو ہلاکت گریز کارجوئی کے امکانات لامحدود ہیں۔ متبادلات کی نشاندہی کا ایک طریقہ تشدد کی خدمات انجام دینے والے کاروبار کی فہرست تیار کرنا اور ان کے ہلاکت گریز متقابلات کا تصور قائم کرنا ہے۔ ان میں جنگی کھلونوں

کے متبادل امن کھلونے، وڈیو گیم کی ہلاکت آفرینی کے بدلے میں ہیجان انگیز غیر متشدد ہنرمندی اور زیرکی، اسلحہ کی صنعت کے بدلے ترکِ اسلحہ کی صنعت، تفریح کے متشدد کھیلوں، فلموں اور موسیقی کے مقابلے میں ہلاکت گریز فنون کی ڈرامائی تخلیقات، اور تباہ کن مشقت کے متبادل معیارِ زندگی میں بہتری پیدا کرنے والا کام شامل ہے۔ غیر متشدد معاشی تبدیلی کی مثالوں کے ذریعے تجربہ فراہم ہو چکا ہے جس کے ساتھ لاعسکر کاری کے ادوار بھی گزرے تھے۔ لیکن ہلاکت گریز سماجوں کے قیام کے لیے صرف معاشی کایا پلٹ کا عمل ضروری نہیں ہے۔ ہمیں آگے جانا ہوگا۔ عالمی تناظر میں لوگوں کی حقیقی ضروریات کی شناخت اور ان کی تکمیل کے لیے درکار خدمات تخلیق کرنی ہوں گی۔

مراکز برائے عالمی عدم تشدد: ایک ہلاکت گریز دنیا کے تصور سے مراد مکمل طور اجمالی تناظر میں، تبدیلی کو آسان بنانے کی صلاحیت کے حامل ادارے ہیں۔ ایسے اداروں کی جڑیں عالمی روحانی اور ثقافتی رواجوں کے ہلاکت گریز عام گروہوں میں مضبوطی سے پیوست ہونی چاہئیں۔ ان اداروں کو چاہئے کہ وہ بنی نوع انسان کو ہلاکت آفرینی اور اس کے مضمرات اور اثرات سے غیر متشدد انداز میں آزاد کرانے میں مدد فراہم کریں اور اس عمل میں سائنسی، ماہرانہ، فنکارانہ اور ادارہ جاتی وسائل میں تخلیقی عمل کو انگیز کریں۔ ہم عصر کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی اصطلاح میں، ان کو غیر متشدد ''سافٹ ویئر'' کے ایسے تخلیقی مراکز ہونے چاہئیں جو حکومت اور سول سوسائٹی کے اداروں کی موثر کارکردگی کے لیے لازمی ہے کہ وہ خود کو تشدد

کی طالب حکومتوں اور محدود واستثنائی مفادات سے ممکنہ اور انتہائی حد تک آزاد رکھیں۔ انہیں مسلسل طور پر مالی معاونت کے لیے مثالیت پسند سرپرستوں، عوامی چندوں اور دیگر ذرائع پر انحصار کرنا چاہئے۔

مرکز برائے عالمی عدم تشدد جن شعبوں میں حتی المقدور انسانی تخلیقیت کی دریافت کے استخراج اور اہداف اپناتا ہے ان میں: روحانی اور فلسفیانہ روایات میں عدم تشدد، حیاتی اعصابی سائنس اور عدم تشدد؛ صنفی تعلقات اور عدم تشدد؛ عدم تشدد اور ماحولیات؛ پیشے اور عدم تشدد؛ تعلیم اور عدم تشدد؛ عدم تشدد اور فنون؛ عدم تشدد اور کھیل؛ غیر متشدد تبدیلی میں فوج اور پولیس کا کردار؛ غیر متشدد قیادت؛ اور غیر متشدد انسانی مستقبل جیسے شعبے شامل ہیں۔

ہر ملک اور خطے میں مقامی طور پر مرکوز، تفتیش وتحقیق پر مبنی غیر متشدد عالمی ثقافتی وسائل کی فہرست بندی ایک بڑا برمحل اور تاریخی فریضہ ہے۔ اس کے لئے ہلاکت گریز تاریخی روایات، موجودہ توضیحات اور آئندہ کے امکانات میں تحقیق وتفتیش کی ضرورت ہے۔ عالمی پیمانے پر میزان کردہ، یہ دریافتیں۔ ہمیں انسانیت کو ہلاکت گریز صلاحیتوں کی اولین مجموعی آگہی فراہم کریں گی جس سے مستقبل میں ہونے والی پیش رفت کا اندازہ لگایا جا سکے گا۔

عالمی عدم تشدد کے مراکز ایسے ہوں جہاں عالمی صورتحال کا پورا منظر نامہ موجود ہو۔ ان مراکز کے ذریعے دنیا میں جاری ہلاکتوں، ہلاکتوں کے خطرات اور متعلقہ محرومیوں کے حقائق کو واضح طور پر نوع انسانی کو دستیاب ہلاکت گریز وسائل کے متوازی رکھ دینا چاہئے۔ درج بالا علم میں تخلیقی پیش رفتوں کو سامنے رکھ کر ہلاکت آفرینی کے چیلنجوں کا مقابلہ کرتے

ہوئے، یہ مراکز، ان سب کے لیے جو بنی نوع انسان کی بقا اور فلاح کی جستجو کرتے ہیں، تبدیلی لانے والی سرکاری پالیسی، تحقیق، تعلیم، اور تربیت میں مدد دینے کے لیے، روحانی، سائنسی، ماہرانہ، اداری وسائل کے امتزاجات تجویز کر سکتے ہیں۔

مطلوب ہلاکت گریز ادارے: ہلاکت گریز سماجوں کی تشکیل کا، ہدف رکھنے والی علم سیاسیات مناسب اداروں کے ذریعے تعلیم اور تدریس کا فرض سرانجام دے گی اور عمل کے نئے طریقے دریافت کرگی۔ یہ کام وہ خود سے شروع کرے گی۔ ایسے اداروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندگی کے احترام کی توثیق کرنے والی روحانیت، ہم آہنگ سازی، دریافت اور علم کا تبادلہ کرتے ہوں تاکہ سرکاری فیصلہ سازی، غیر متشدد مشترک سلامتی، فلاح اور فن اور پیشے کے تمام امکانات بھرپور انداز میں کام کر سکیں۔

ہلاکت گریز سماج کی منزل تک پہنچنے کے لیے جو کام اور اہداف درپیش ہیں ان کا تقاضہ ہے کہ عالمی عدم تشدد کے ان مراکز کو باہم مربوط کیا جائے جو سب کے لیے ہلاکت گریز ضروریات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے عمل میں سہولت فراہم کرتے ہیں۔ ہلاکت گریز ادارے، باہمی طور پر ایک دوسرے کو مدد دینے والے افراد سے اپنی طاقت اخذ کرتے ہیں۔ علم سیاسیات کا ہر ماہر اور ہر فرد، ہلاکت گریز دنیا کی تعمیر کے لیے عالمی عدم تشدد کا مرکز بن سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

چھٹا باب

ہلاکت گریز علم سیاسیات

ہم ایک نئے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ پرانے طریقے اور حل فرسودہ ہو چکے ہیں۔ ہمیں نئے افکار، نئے نظریات اور نئے تصورات اپنانا ہوں گے ..... ہمیں ماضی کا خول توڑ کر باہر نکلنا ہوگا۔

جنرل ڈوگلس میکارتھر

کسی کو تاریخ میں تشدد اور تخریب کی زنجیریں توڑنے کا واضح ادراک اور حکمتِ عملی حاصل کرنا ہوگی۔

مارٹن لوتھر کنگ، جونیئر

تمام تاریخی تجربات یقینی طور پر اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں ___ کہ انسان کے لیے کچھ بھی ممکن نہ ہوتا اگر اس نے وقتاً فوقتاً ناممکن تک رسائی حاصل نہ کی ہوتی۔

میکس ویبر

ہم روزانہ یہ مظہر دیکھتے ہیں کہ گذشتہ کل جو کچھ ناممکن تھا، وہ آج ممکن ہو چکا ہے۔

موہن داس کے۔گاندھی

ہلاکت آفرینی سے رہائی کی جانب

یہ طے کرنے کا وقت آ چکا کہ ہے انسانی ہلاکت ایک مسئلہ ہے جسے حل کرنا ہے بجائے اس کے کہ اسے دائمی صورتحال سمجھ کر قبول کرلیا جائے۔ بنی نوع انسان کی دیدہ و دانستہ ہلاکت، فرد کی فرد کے ذریعے، ہجوم کی ہجوم کے ذریعے، اورانبوہ کی مشینوں کے ذریعے، مریضانہ خودشکستگی کی صورت اختیار کرچکی ہے۔ ہلاکت، جس سے آزادی، تحفظ اور خوشحالی کی توقع کی گئی تھی لیکن وہ بجائے خود، عدم تحفظ، مفلسی اور انسانی اور کرۂ ارض کی بقا کے لیے خطرے کا باعث ثابت ہوتی ہے۔ کریک کامسٹاک کی اصطلاح میں انسانیت ''دفاع کے روگ'' میں مبتلا ہے جب اسے تحفظ کی خاطر اپنایا جائے تو وہ بذاتہی خودشکستگی کا ذریعہ بن جاتی ہے (کامسٹاک 1971ء)۔ دفاعی بندوقیں گھروں میں خاندان کے افراد کو ہلاک کرتی ہیں، محافظ خود اپنے سربراہانِ ریاست کو ہلاک کرتے ہیں، فوجیں اپنے ہی عوام کے خلاف صف آراء ہوتی ہیں اور انہیں مفلس بناتی ہیں، جوہری ہتھیار بننے کے بعد اپنے ہی موجدوں اور مالکوں کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں۔ تشدد سے آزادی کے ایک اعلان نامہ کی نہ صرف

ہمارے اپنے بلکہ ہمارے سماجوں کے لیے ضرورت ہے۔

عہدِ جدید میں تشدد کے ذریعے انسانی خواہشوں کی جستجو بے حساب خونریزی، مادی محرومی، اور نسل در نسل منعکس ہوتے ہوئے ذہنی صدمات کا باعث بن گئی ہے۔ گذشتہ دو صدیوں میں انسانی امیدیں انقلابِ فرانس کی چھوڑی ہوئی میراث __ ''آزادی، مساوات، اخوت'' __ صرف بینروں کی زینت بنی رہی ہیں۔ ہلاکت برائے آزادی امریکی انقلاب کی میراث رہی ہے۔ ہلاکت برائے مساوات روسی اور چینی انقلابات کی میراث رہ چکی ہے۔ ہلاکت برائے امن، جنگ، انقلاب، اور جوابی انقلاب کی دو صدیوں کی میراث رہ چکی ہے۔ اس سے یہ سبق سیکھنا چاہیے کہ حقیقی آزادی، مساوات، امن اور انسانی بھائی چارہ، ہلاکت آفرینی کو اس کی بنیاد سے اکھاڑے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔ مقتولین کے پہاڑ، جنہیں نیکی اور بدی کے نام پر قربان کیا گیا ہم سے تقاضہ کر رہے ہیں کہ ان سے یہ سبق حاصل کیا جائے۔

اس کا یہ مطلب ہے کہ علم سیاسیات کے ابھرتے ہوئے عالمی نظریے اور تقلیدی قواعد کے اس تصور کو چیلنج اور تبدیل کیا جائے کہ ہلاکت ناگزیر ہے اور بنی نوع انسان کی بہبود کے لیے اچھی چیز ہے۔ اس سے مراد ہے قدیم دانائی کے ایک انتہائی طاقتور عقیدے اور عہدِ حاضر کے سیاسی اصول کو زیر بحث لانا اور اسے شکست سے دوچار کرنا۔ طبی تاریخ میں ''مستحسن پیپ'' کے نظریے کی شکست میں مماثلت تلاش کی جاسکتی ہے۔ انتہائی معتبر یونانی ماہرِ طب جالینوس (200ء۔130ء) کا قول تقریباً 17 صدیوں تک مستند مانا جاتا رہا کہ زخم میں پیپ

بننے کا عمل صحت مندی کی نشانی ہے۔ 1867ء میں لسٹر نے اپنے اثر انگیز مقالے ''سرجری کے عمل میں دافع عفونت اصول'' میں اسے چیلنج کیا۔ اس پر اعتراضات بھی اٹھائے گئے تاہم اس کے نتیجے میں دافع عفونت ادویہ دریافت اور اختیار کی گئیں (ایکر کنیخت 1982ء: 77؛ گیریزن 1929ء: 116؛ 90-589)۔ یہ عقیدہ کہ ہلاکت فطری اور سیاست کے لیے عملی طور پر صحت مند ہے، دراصل علم سیاسیات کا ''نظریۂ مستحسن پیپ'' ہے۔

ماہرین علم سیاسیات، اسکالر جو اپنے آپ کو، خاندانی زندگی سے عالمی جنگ تک سیاسی قوت کے کثیر پہلو کے اظہار کے مطالعے کے لیے وقف کر دیتے ہیں وہ اگر ہلاکت آفرینی کے تصور کو سنجیدگی سے چیلنج نہیں کرتے تو سیاسی رہنماؤں اور کرۂ ارض کے شہریوں سے ایسا کرنے کی ہم توقع کیوں رکھیں؟ تاہم پوری تاریخ کے دوران اور موجودہ دور میں زیادہ، وہ رہنما اور شہری ابھرے ہیں جو علمِ سیاسیات کی مدد کے بغیر واضح طور پر بااصول ہلاکت گریز ذرائع سے..... آزادی، برابری اور امن کے حالات پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال 1895ء میں روس میں جبری فوجی بھرتی کی مزاحمت کرنے والے 7,000 امن پسند دوخوبور کسانوں کی جانب سے ''ہتھیاروں کو نذر آتش کرنا'' ہے (تراسوف 1995ء: 10-8)۔ ہلاکت آفرینی کو تسلیم کرنے والی علم سیاسیات، اور ہلاکت آفرینی کو رد کرنے والی سیاست کے درمیان اور مابین خلیج حائل ہے۔ بیسویں صدی میں ٹالسٹائی، گاندھی، عبدالغفار خاں، مارٹن لوتھر کنگ جونیئر، اور پیٹرا کیلی کی روایات کو __ دلائی لاما، آنگ سان سوکی، اور ڈیسمنڈ ٹوٹو جیسے رہنماؤں نے جرأت مندی سے آگے بڑھایا __ ہلاکت گریز مخلص

قیادت کو ممکن بنانے والے غیر معروف ہیروئنوں اور ہیروؤں سے قوتِ محرکہ اور مدد حاصل کر کے __ یہ لوگ مستقبل کی طاقتور ہلاکت گریز سیاست کے نقیب ہیں۔

کیا علم سیاسیات کے ماہرین، افراد اور عوامی تحریکوں کی ہلاکت گریزی کے لئے دی جانے والی قربانیوں اور کامرانیوں کی پیروی کرنے میں مزید تاخیر کریں گے اور جابرانہ حکومتوں سے فیض اٹھانے والوں کی طرح محتاط انداز میں تشدد پسند ''اسٹیٹس کو'' سے اس وقت تک چمٹے رہیں گے کہ جب تک غیر دوستانہ مظاہرے انہیں اُٹھا کر ایک طرف نہیں پھینک دیتے؟ کیا ماہرین علم سیاسیات تب ہی ہلاکت گریز جمہوری تقریبات میں شامل ہوں گے؟ یا علم سیاسیات کو طبی سائنس کی پیروی کرتے ہوئے ہلاکت آفرینی کی مرضیات کی تشخیص کے لیے خود کو وقف کر دینا چاہیے، اور ادویات اور علاج دریافت کرنا چاہیے جس سے وہ تمام لوگ فیض حاصل کر سکیں جو کرۂ ارض سے ہلاکت کے خاتمے کی جستجو کرتے ہیں؟

ہلاکت گریز صلاحیتوں کا نظریہ

یہاں یہ نظریہ پیش کیا جا رہا ہے کہ ہلاکت گریز عالمی سماج ممکن ہے اور علم سیاسیات کے علمی اصول اور اس کے سماجی کردار میں تبدیلی اس خواب کو شرمندہ تعبیر کر سکتی ہے۔ ہلاکت گریز سماجوں کے قیام کا معاملہ کم از کم سات بنیادوں پر منحصر ہے۔ انسانوں کی اکثریت قتل نہیں کرتی۔ بنی نوع انسان کی روحانی وراثت میں طاقتور ہلاکت گریز امکان موجود ہے۔

سائنس ہلاکت گریز انسانی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتی ہے اور ان کی پیش گوئی کرتی ہے۔ سزائے موت کے خاتمے اور فوجی خدمت پر اصولی اعتراض تسلیم کرنے جیسی تبدیلی لانے والی ہلاکت گریز سرکاری پالیسیاں، تشدد کے ذریعے وجود میں آنے والی ریاستیں بھی اختیار کر چکی ہیں۔ ہلاکت گریز اصولوں کی بنیاد پر قائم مختلف کئی سماجی ادارے، پہلے سے ہی باہم یکجا ہو کر ہلاکت گریز سماجوں کے تفاعلی (Functional) ہم پلہ بنے ہوئے ہیں۔ سماجی و معاشی تبدیلی کے لیے غیر متشدد عوامی مزاحمتیں، انقلابی ہلاکت آفرینی کے خلاف ایک ابھرتے ہوئے طاقتور متبادل کے طور پر سامنے آ رہی ہیں۔ ہلاکت گریز وجدان اور تجربے کی جڑیں دنیا بھر کی تاریخی روایات میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ بنیادی طور پر ہلاکت گریز تبدیلی کی توقع کا انحصار، ہلاکت گریز افراد، مرد اور خواتین، معروف و غیر معروف کی مثالوں پر ہے، جن کی جرأت آمیز زندگیاں اس تبدیلی کے قابل حصول ہونے کی شہادت دیتی ہیں۔

علم سیاسیات کے لیے مضمرات

یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ انسان حیاتیاتی طور پر اور میلان طبع کی تربیت کے باعث ہلاکت اور عدم ہلاکت دونوں خصوصیات کا حامل ہے۔ لیکن مشاہدہ یہ کیا گیا ہے کہ انسانوں کی اکثریت قاتل نہیں رہی ہے اور یہ کہ ہلاکت گریز اصولوں کی بنیاد پر قائم، سماجی اداروں کی ایک بڑی تعداد پہلے ہی تخلیق کی جا چکی ہے جو ہلاکت گریز سماجوں کے اولین عناصر کے

طور پر کام آ سکتے ہیں۔ مزید براں، موجود اور ممکنہ سائنسی پیش رفت، ہلاکتوں کی وجوہ کو ختم کرنے، عدم ہلاکت کے اسباب کو مستحکم کرنے اور ہلاکت گریز سماجوں کے قیام کے حالات پیدا کرنے کے لیے آ گہی فراہم کرتی ہے۔ ان مشاہدات کے پیش نظر، مفروضے کے طور پر ناگزیر ہلاکت آفرینی کی قبولیت جس پر علمی اصول اور علم سیاسیات کے سماجی کردار کی بنیاد رکھنا ہے، کم سے کم ممکن الوقوع ہے۔ لہٰذا دیگر مفروضوں کے ساتھ ہلاکت کا مفروضہ اور اس کے مضمرات، جنہیں علم سیاسیات کے ''تباہ کن اصول'' کہنا چاہیے مکمل طور پر زیر بحث لانا مناسب ہے۔ دیگر عقیدوں اور پیشوں کے ساتھ ساتھ، علم سیاسیات کو ماضی کے غیر متشدد تجربات کا احاطہ کرنا چاہیے، موجودہ غیر متشدد صلاحیتوں کو تسلیم کرنا چاہیے، مستقبل کے لیے غیر متشدد امکانات پر روشنی ڈالنا چاہیے، اور تحقیق، تدریس، اور ہلاکت گریز سماجی تبدیلی کے لیے سرکاری خدمات میں اس بصیرت کو آگے بڑھانے میں تعاون کرنا چاہیے۔

ہلاکت گریز تبدیلی کے لیے یکجائی کے طالب اصل عناصر ہیں۔ (روحانی جوہر) اسپرٹ (S_1)، ہر ایک اور تمام عقائد فلسفوں سے اخذ کردہ ہلاک نہ کرنے کے معروف عہد۔ سائنس (S_2)، تمام فنون، سائنسوں اور پیشوں سے آ گہی جو ہلاکت اور ہلاکت گریز قلب ماہیت کے اسباب پیدا کرتے ہیں۔ (مہارتیں) اسکلز (S_3) تبدیلی کے تغیراتی عمل میں روحانی جوہر اور سائنس کے اظہار کے لیے انفرادی اور گروہی طریقے۔ (گیت) سانگ (S_4)، موسیقی اور تمام فنون کی تخلیقی تحریک، سائنس اور ہلاکت گریز سیاسی عمل جو نہ تو بہت برا ہو اور نہ تباہ کن بلکہ زندگی کا طاقتور جشن ہو۔ ان چار عناصر کو موثر خدمت میں یکجا کرنے، ترقی

دینے اور افزوں کرنے کے لیے، جمہوری قیادت (لیڈر شپ) (L)، (شہری مستعدی) سٹیزن کمپٹینس (C)، نفاذی (ادارے) انسٹی ٹیوشنز (I) اور امدادی (وسائل) ریسورسز (R) ضروری ہیں۔

عناصر کے اس امتزاج کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

S^4xLCIR=Nonkilling Global Transformation

(ہلاکت گریز عالمی قلبِ ماہیت)

انسانی روح اور جذبے، سائنس، ہنرمندیوں اور گیتوں کو اگر ضروریات کے تقاضوں کو پورا کرنے والے جمہوری قیادت اور شہریوں کو بااختیار بنانے کے طریق عمل سے تخلیقی طور پر ہم آہنگ کر دیا جائے اور اداری اظہار اور عزم وارادے سے اس عمل کو افزوں کیا جائے تو ایک ہلاکت گریز دنیا کے قیام میں مدد مل سکتی ہے۔

نظریہ اور تحقیق

انسانی ہلاکت آفرینی کی دہشت سیاسی تجزیے کی ایک چہار جزوی منطق میں علم سیاسیات کی تحقیق وتفتیش کی متقاضی ہے جو ان قوتوں کے تعمل کو روکنے کے لیے ضروری آگہی مہیا کرسکتی ہے یہ آگہی انفرادی قتل سے نسل کشی تک ہلاکت اور شہروں کی ایٹمی تباہی سے ارضی زندگی کی ممکنہ معدومی پر منتج ہوسکتی ہے۔ علم سیاسیات کے شعور میں ہلاکت کو تشدد پسندی کے

حلقے سے تجزیاتی اور مسائل کے حل کرنے کے غور وفکر کے مرکز کی جانب حرکت کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب ہلاکت کے اسباب؛ ہلاکت گریزی کے اسباب؛ ہلاکت سے ہلاکت گریزی تک اور اس کے برعکس تغیر کے اسباب؛ اور مکمل طور پر ہلاکت سے آزاد سماجوں کی خصوصیات سمجھنے کی مرتکز کوشش ہے۔ ہلاکت آفرینی کی قیف کے ارتکازی منطقوں یعنی عصبی حیاتیاتی، ساختیاتی، ثقافتی، معاشرتی میلان کاری، اور ہلاکت کے منطقوں کے اندر اور ان کے مابین ہلاکت گریز متبادلات کی نشاندہی اور منقلب کرنے والے اقدامات میں مدد دینے کے لئے اس نوع کی آگہی ضروری ہے۔

تعلیم اور تربیت

ماہرین علم سیاسیات کی تعلیم وتربیت، نصابی ڈھانچے، نظری علم سیاسیات کے شعبوں کی تنظیم کاری، دیگر عقائد کے ساتھ تعلقات، اور سماج میں علم سیاسیات کے تحقیقی، تعلیمی، عملی کردار میں، اس نوع کے علم کے متلاشی اور منقلب کرنے والے اہداف کو آگے بڑھانا اولین اہمیت رکھتا ہے۔

ہلاکت گریز مسائل کے حل کے لیے تخلیقیت اور اس میں مہارت کی نشوونما کرنا علم سیاسیات کی تعلیم اور تربیت کا مجموعی ہدف بنتا ہے۔ چند رہنما اصولوں میں تخلیقی زندگی اور اداروں کی میراث کا جائزہ لینا؛ انفرادی دلچسپیوں اور مہارتوں کی تحقیق میں مدد کرنا؛ اجتماعی

علم اور مہارت پیدا کرنے کی سعی کرنا؛ ذاتی طور پر منتخب کردہ مسائل حل کرنے والے منصوبوں میں شرکت کرنا؛ متوازی تعمیری کمیونٹی خدمت مہیا کرنا؛ اور ہلاکت گریز علم سیاسیات کے پیشوں کی جانب رجحان بنانا اور ان کی مدد کرنا شامل ہے۔

ہلاکت آفرینی کی دہشت ناک تاریخ اور ہلاکت گریز تخلیقیت کی وجدان آمیز میراث کے انتہائی واضح تعارف کے بعد، یہ نصاب ہلاکت گریز سیاسی تجزیے کی منطق اور مسائل حل کرنے کے موثر اقدام کے اصولوں اور طریق عمل کی دریافت میں شرکت کے چیلنج پیش کرتا ہے۔ یہ شرکا۔۔۔۔ ہلاکت، ہلاکت گریزی، تغیرات اور ہلاکت گریز سماجوں کی خصوصیات کے بارے میں مفروضات کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس تناظر میں مقامی اور عالمی طور پر، سیاسی اداروں اور طریق عمل کی جانچ پڑتال کی گئی ہے۔ مسائل کے حل کے چیلنجوں کو پیش کیا گیا ہے جن میں قتل، قتل عام (Democide)، نسل کشی اور ترک اسلحہ؛ معاشی ہلاکت آفرینی؛ انسانی حقوق کی گھناؤنی صورتحال؛ ماحولیاتی حیات کشی؛ اور تباہ کن نزاع انگیزی بمقابلہ تنوع کے مابین باہمی تعاون شامل ہیں۔ تحقیق، تدریس، مخلص قیادت اور مبصرانہ ابلاغ کی صورت میں مسائل حل کرنے میں شراکت کے طریقوں میں مہارتیں پیدا کرنے کے مواقع فراہم کیے گئے ہیں۔ مسائل حل کرنے اور مہارتیں پیدا کرنے کے لیے ان بنیادوں پر انفرادی اور گروہی منصوبوں کو تلاش کر کے پیش کیا گیا ہے۔ پوری یونیورسٹی پر محیط ایک متوازی شانتی سینا (امن فوج) منضبط کمیونٹی خدمت کے لیے واجبی قائدانہ تربیت فراہم کرتی ہے۔

محققوں، رہنماؤں، معلموں اور مبلغوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے سند یافتہ افراد (گریجویٹ) عبوری سرکاری اور نجی اداروں کا رخ کرتے ہیں۔ وہ مسائل حل کرنے کی تخلیقی خدمت کے سماجی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ پوسٹ گریجویٹ تربیت، سیاست؛ حکومت اور سول سماج میں خدمت کے لیے ترقی یافتہ بندوبست فراہم کرتی ہے تاکہ تشدد کے تدارک اور غیر متشدد سماجی تبدیلی میں مہارتوں کے بڑھتے ہوئے موجودہ تقاضوں کو پورا کیا جاسکے۔ مسائل حل کرنے کی سرگرمیاں انڈر گریجویٹ تعلیم میں شراکتوں کی متوازی ہوتی ہیں۔ تحقیق، تعلیم، عمل اور سرگرمیوں میں مہارتوں کو ترقی دینے کے لیے ورکنگ گروپ قائم کیے جاتے ہیں تاکہ تشدد، معیشت، انسانی حقوق، ماحولیات، امداد باہمی اور دیگر معاملات کے مسائل حل کیے جائیں۔ ماسٹر ڈگری اور ڈاکٹریٹ کے امیدوار اپنے شعبے میں انڈر گریجویٹ منصوبوں میں بطور رہنما، صلاح کار اور ساتھی متعلم کا کردار ادا کرتے ہیں۔

ہلاکت گریز علم سیاسیات سے مراد ہے ایسے پیشہ ور ماہرین تیار کرنے کے لیے پی ایچ ڈی کے سطح کے لوگوں کی تربیت میں جوش اور ولولہ جو بذاتِ خود تخلیق کار ہوں اور دوسروں کی تخلیقیت کو آسانی فراہم کرنے میں ماہر ہوں۔ ہر مطلوبہ مہارت پر عبور حاصل کرنے کی سب سے توقع نہیں رکھی جاسکتی، لیکن سب مطلوبہ فریضوں کی آگہی میں حصہ لے سکتے ہیں، استعداد کی انتہائی حد تک تخلیقی مدد کی جستجو کر سکتے ہیں، اور سیکھ سکتے ہیں کہ علمی کمیونٹی کے اندر اور اس کے باہر دوسروں کے مسائل حل کرنے کی سرگرمیوں میں کس طرح تعاون کیا جائے۔

ڈاکٹریٹ کی تربیت میں ہلاکت گریز علم سیاسیات کی بنیادوں کے گہرے مطالعے؛

مقامی اور عالمی سطح پر مسئلہ کے حل کے تقاضوں کی آ گہی؛ ہلاکت گریز فاضلانہ قیادت کی مہارتوں کی تیاری؛ (بشمول زبانیں) تحقیق وتفتیش کے معیاری اور مقداری طریقوں کی آ گہی؛ سونپے گئے ہدف کے لیے لازمی طریق ہائے تحقیق وتفتیش پر دست رس؛ اور ترقی یافتہ منصوبوں میں شمولیت درکار ہوگی۔ آخرالذکر نئی آ گہی کی دریافت اور تعلیم وتربیت، اداری ترقی اور مسائل کے حل کے طریق ہائے عمل میں بہتری لانے کے لیے موجود علم کے اطلاق کا احاطہ کرنے کے لیے ضروری ہے۔

ہلاکت گریز فاضلانہ قیادت کو مطلوبہ سیاسی کردار کی ہمہ گیر بجا آوری کے لیے تیاری کی ضرورت ہے۔ ہلاکت اور ہلاکت گریزی کی جانب عقائد اور رویوں کے ماخذات پر خودنویسانہ عکاسی کے لیے سازگار صورتحال بنیادی شے ہے۔ شاگردوں کی تخلیقیت کو آسانی فراہم کرنے کی تدریس کے لیے تیاری درکار ہوتی ہے۔ جس میں کالجی تخلیقیت آسان بنانے کے لیے شعبہ جاتی قیادت کی تیاری۔ مخلوط الانضباطی امدادِ باہمی کی تیاری۔ ریاست اور شہری سماج میں ہلاکت گریز تبدیلی آسان بنانے کے لیے مشاورت کی تیاری۔ انتہائی تعمیری ذرائع ابلاغ کی تیاری اور بلاواسطہ غیر متشدد خادم قیادت کی تیاری شامل ہے (گرین لیف 1977ء)۔

علم سیاسیات کے ہلاکت گریز شعبے کو اپنے نجی سماجی تعلقات میں سعی وخطا (Trial and error) کے ذریعے ایک ہلاکت گریز سماج کی مطلوبہ خصوصیات کے اظہار کی جستجو کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب زندگی کے لیے غیر فرقہ وارانہ بلکہ کثیر العقیدہ روحانی اور انسان نواز احترام کا ادعا کرنا ہے۔ سب کی بھلائی کے لئے جواب دہی پیدا کرنا ہے۔ احتیاج پوری

کرنے والی فیصلہ سازی کے شراکتی طریق ہائے عمل میں بہتری لانا ہے۔ سب کے تنوع اور فضیلت کی تعریف کرنا ہے۔ مخلوط اور منقسم قیادت کی کارگزاریوں کی آزمائش کرنا ہے۔ امکانی طور پر قابلِ مداخلت تنازعہ کے موقع پر مسائل کے غیر متشدد حل کے مشیروں کو طلب کرنے کے لیے تیار رہنا ہے۔ دیگر عقائد اور پیشوں کی مدد کے لیے کشادگی اختیار کرنا ہے۔ سائنسی مسائل حل کرنے کے لیے اختراعی حلقوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔ اور یہ تسلیم کرنا ہے کہ ایک ہلاکت گریز عالمی سماج افراد اور مقامی کمیونٹی میں پیوستہ ہے۔

تحقیق، تعلیم، قیادت، مواصلات اور سماجی زندگی کے دیگر میدانوں میں کام کرنے کے لیے روانہ ہونے والے گریجویٹوں کے ساتھ طویل المدتی باہمی مشاورتی تعلقات قائم کیے جانے چاہئیں۔ ان کے تجربات تحقیق کے تقاضوں کو شناخت کرنے، مطلوبہ مہارتوں میں تیاری کو بہتر بنانے اور ہلاکت گریز قلبِ ماہیت کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کی تخلیقیت بیدار کرنے میں بڑی مدد کر سکتے ہیں۔ دیگر معاملات میں، وہ خواہ کتنے ہی مختلف ہوں، ہلاکت گریز علم سیاسیات کا چیلنج قبول کرنے والے سارے افراد خود کفالتی باہمی تعاون میں ایک ساتھ شرکت کر سکتے ہیں۔

مسئلے کا حل

ہلاکت گریز علم سیاسیات جامع و مانع مسائل حل کرنے کی سرگرمی میں بنیادی اور عملی

سائنس کے امتزاج کی دلالت کرتی ہے۔مخلوط سماجی تبدیلی کے سیاق وسباق میں تشریح کردہ حوالے سے مسائل کی شکلیں بدل جائیں گی۔انتہائی اہمیت کے حامل پانچ مسائل عالمی طور پر نمایاں ہیں: تشدد اور ترک اسلحہ، عالمگیر معاشی تباہی، انسانی حقوق کی کراہت انگیز صورتحال، ماحولیاتی انحطاط، اور مسئلہ حل کرنے میں امدادِ باہمی کی ناکامیاں۔سب مسائل بالواسطہ اور بلاواسطہ قتل کرنے پر آمادگی سے تعلق رکھتے اور تقویت پاتے ہیں۔عہدِ حاضر کے ایک نعرے میں کہا گیا ہے کہ ''عدل کے بغیر امن نہیں'' ہوگا__ مراد یہ کہ غیر منصفانہ صورتحال پر احتجاج یا تبدیلی کے لیے تشدد اور جنگ برقرار رہے گی یا ضروری ہوگی ورنہ غیر منصفانہ صورتحال تبدیل کردو۔مثال کے طور پر، خواتین کے ساتھ غیر مساویانہ سلوک کے معاملے میں، پٹیرا کیلی کے مشاہدے کے مطابق: ''اختیار، وسائل، اور ذمہ داریوں کی غیر منصفانہ صنفی تقسیم قدیم رواجوں کے ذریعے جائز قرار دی گئی ہے، قانون کا حصہ بنادی گئی ہے، اور بوقتِ ضرورت مردانہ تشدد کے ذریعے مسلط کی گئی ہے'' (کیلی 1994ء:15)۔

مسائل حل کرنے میں مشغولیت یہ دلالت نہیں کرتی کہ ہلاکت گریز علم سیاسیات ہمہ داں یا ہر حل کا ذریعہ ہے۔لیکن یہ مراد ضرور ہے کہ ہلاکت گریز سیاسی تجزیے اور ہلاکت گریز عمل کے اصولوں اور مشقوں سے اخذ کردہ علم کا عملی تجربہ، سماجی فیصلہ سازی کے ان طریق ہائے عمل کو بہتر کرسکتا ہے جو سب کے تقاضوں کو پورا کرنے والے ہیں۔اس صورتحال میں ہلاکت گریز علمِ سیاسیات تشدد پر قائم جمہوری رواج سے بالا، ترقی کے لیے غیر متشدد امداد کی یقین دہانی کراتی ہے (گولڈ مین 1990ء)۔

ادارے

تلاشِ آگہی، تربیتِ وتدریس، اور مسائل حل کرنے کے حوالے سے ہلاکت گریز علمِ سیاسیات کے مقاصد سے مراد نفاذی اداروں کے قیام کی ضرورت اور تقاضے ہیں۔ ان کا دائرہ نئے یا نوتعمیر کردہ شعبوں، حتیٰ کہ پوری یونیورسٹیوں سے (بشمول عالمی ہم پلہ رابطے جو موجودہ اداروں کے اندر یا باہر مضبوطی سے جمی ہوئی صلاحیتوں کو یکجا کرتے ہیں)، غیر فوجی شانتی سینا تربیتی یونٹوں، ہلاکت گریز سرکاری پالیسی اداروں، ہلاکت گریز مشترکہ سلامتی افواج، ہلاکت گریز سیاسی پارٹیوں، اور شہری سماج کے ہر شعبے میں ہلاکت گریز ادارہ جاتی اختراعات تک وسیع ہے۔ ان اداروں کی تخلیق اور ان میں خدمت انجام دینا، نیز مقامی اور عالمی زندگی سے ہلاکت آفرینی ختم کرنے کے لیے موجودہ اداروں کی قلبِ ماہیت کا عمل، ان سب لوگوں کے لیے انتہائی تخلیقی پیشوں کی پیش کش کرتا ہے جو ہلاکت گریز سیاست کی سائنس کا مطالعہ اور عملی اطلاق کرتے ہیں۔

رکاوٹیں اور تخلیقی تحریک

اکیسویں صدی کے آغاز پر علم سیاسیات کو، ایک ہلاکت گریز عالمی سماج کے قیام کے لیے مدد کا فریضہ ادا کرنے کا چیلنج درپیش ہے۔ یہ نہ صرف مناسب پسندیدہ بلکہ ناگزیر عمل

ہے۔علمِ سیاسیات کے ماہرین اس ذمہ داری سے اقدار کے بارے میں تعصب کا اعتراض لگا کر اور ''حقیقت پسند'' سائنسی غیر جانبداری کا دعویٰ کر کے پہلو تہی نہیں کر سکتے کیونکہ یہ فعل در حقیقت قتل کرنے کی آمادگی کا باعث بنتا ہے۔اگر ایسا ہوتا تو ماہرین علم سیاسیات کو پروانہ ہوتی کہ جس سماج یا دنیا میں وہ زندگی گزارتے تھے وہ آزاد تھی یا غلام، منصفانہ تھی یا غیر منصفانہ، متمول تھی یا مفلس، حالت امن میں تھی یا جنگ میں، فتح مند تھی یا شکست خوردہ۔انہوں نے اپنے شاگردوں کو یہ درس دے کر خوشی محسوس کی ہوتی کہ ماہرین علم سیاسیات کوئی قدری ترجیحات نہیں رکھتے اور اس لیے وہ اپنی تحقیق ،تعلیمات اور عوامی خدمت کے منصوبوں کی تشکیل ،بعض قدروں کی دوسری قدروں پر ترجیح کی بنیاد پر نہ کرتے۔پر ان کے نزدیک ہٹلر کی تباہ کاری اور گاندھی کی ستیا گرہ میں کوئی امتیاز نہ ہوتا۔

ماہرین علم سیاسیات یہ جواز پیش کر کے بھی ہلاکت گریز علم سیاسیات کی تخلیق کے فریضے سے گریز نہیں کر سکتے کہ دیگر اقدار مثلاً آزادی، مساوات، یا سلامتی، ہلاکت گریزی کے مقابلے میں زیادہ اہم ہیں۔ہلاکت گریزی تقریباً مساوی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ انسانیت ایسی صورتحال سے دوچار ہو چکی ہے جہاں علم سیاسیات اور سیاسی زندگی میں ہلاکت گریز اخلاقیات سے طاقتور پیمان وفا کے بغیر تمام اقدار کو خطرہ لاحق ہے۔مادیت اور اخلاقیات بھی اسی نتیجے پر پہنچ چکی ہیں۔اگر روایات نے سکھایا ہے کہ ہمیں آزاد، ہم سر اور محفوظ رہنے کے لیے قتل کرنا ضروری ہے تو عہد حاضر ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ جب تک ہم قتل کرنا بند نہیں کرتے ،اس وقت تک نہ صرف آزادی اور مساوات بلکہ ہماری انفرادی، سماجی

اور ماحولیاتی بقا کو بھی خطرہ لاحق رہے گا۔ ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ چکے ہیں جہاں سائنس اور سیاسی عمل کو سماج اور فطرت کی زندگی نواز قوتوں کے ساتھ وابستگی اختیار کرنا چاہیے۔ یہ نہ صرف اچھی اخلاقیات، اور اچھی عملیت پسندی ہے بلکہ یہ اس عہد میں اچھے علم سیاسیات کے لیے لازمی اور ناگزیر بھی ہے۔

قلبِ ماہیت کے عمل کے دوران، حقیقتاً، ایسی نظری اور عملی قوتوں سے مخالفت کی توقع کی جاسکتی ہے جو ہلاکت آفرینی کے تسلسل سے شناخت اور من چاہے فوائد حاصل کرتی ہیں۔ ان میں متشدد ریاستی قوتیں، ان کے ہلاکت آفریں حریف، اور ہلاکتی ثقافتوں کے سیاسی، معاشی اور نفسیاتی طور مستفید ہونے والے شامل ہیں۔ ان میں جنگ اور بغاوتوں کے سبب نہیں بلکہ Veterans اور ان کے پیش رو اور دیگر افراد شامل ہیں جو سماجی طور پر جائز راست باز Righteous ہلاکت آفرینی سے شناخت اور فخر حاصل کرتے ہیں۔ شہدا کے قبرستانوں میں اظہارِ عقیدت کرتے ہوئے ہم مرے ہوئے دشمن سے غیر ہمدردرویے اپناتے ہیں اور یہ نہیں سمجھ پاتے کہ دونوں سیاسی ناکامی کا شکار ہوئے ہیں، اور وہاں سے پُرمسرت احساس کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں کہ ایسی قربانیوں کے لیے ہمیں ہمہ وقت تیار رہنا ہے، بجائے اس کے کہ ہم اس عہد کو اپنائیں کہ آئندہ کبھی ایسی ہلاکتیں واقع نہیں ہوں گی۔

دنیا کے انتہائی معزز فوجی رہنماؤں کی تجربے پر مبنی نصیحتیں ہلاکت گریز علم سیاسیات پر عبور کے لیے امنگیں پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ جنرل ڈوگلس میکارتھر نے 1955ء میں

امریکن لیجن سے خطاب کرتے ہوئے جنگ کے خاتمے کی اپیل کی تھی اور اسے ناگزیر ''سائنسی حقیقت پسندی'' کا معاملہ قرار دیا تھا:

> آپ فوراً کہیں گے کہ گرچہ صدیوں سے آدمی جنگ کے خاتمے کا خواب دیکھتا رہا ہے تاہم ایسی ہر تجویز کو ناممکن اور خلافِ عقل کہہ کر بلاتوقف مسترد کیا جاتا رہا ہے۔ دنیا میں ہر قنوطیت پسند، ہر کلبی، ہر مہم جو، ہر بڑ ہانکنے والے نے ہمیشہ اس کی عمل پذیری سے انکار کیا ہے۔ لیکن یہ صورتحال اس سے قبل تک تھی جب پچھلی دہائی کی سائنس نے عام تباہی کو حقیقت میں ڈھال دیا۔ اس وقت دلائل کی بنیاد روحانی اور اخلاقی تھی، اور ناکام رہی .....لیکن اب تباہ کاری کے جوہری اور دیگر امکانات کے مہیب اور باضابطہ ارتقا نے مسئلے کو اچانک اس کے ابتدائی تصورات یعنی اخلاقی اور روحانی حدود سے دور اور سائنسی حقیقت پسندی میں جا گزیں کر دیا ہے۔ یہ اب ایک اخلاقی مسئلہ نہیں رہا جس پر غور وخوص کرنا صرف دانا فلسفیوں اور پادریوں کا مشغلہ ہو بلکہ عوام الناس کے فیصلے کے لیے جن کی بقا داؤ پر لگی ہے، یہ ایک سنگین مسئلہ ہے.....رہنما پسماندہ ہیں.....وہ اس ننگی حقیقت کا کبھی اظہار نہیں کرتے کہ جب تک جنگ کا خاتمہ نہیں کر دیا جاتا تہذیب میں اگلی عظیم پیش رفت نہیں ہوسکتی .....حکومت کرنے والے کس عظیم شخص کو یہ خیال کب آئے گا کہ اس عالمی خواہش کو__ جو تیزی سے ایک عالمی ضرورت بنتی جارہی ہے__ حقیقت کا روپ دے؟ ہم ایک نئے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ پرانے طریقے اور حل فرسودہ ہو چکے ہیں۔ ہمیں نئے افکار، نئے نظریات، نئے تصورات اپنانا ہوں گے.....ہمیں ماضی کا خول توڑ کر باہر نکلنا ہوگا (کزنس 1987ء:9-67)۔

آزادی، مساوات اور اخوت کے غیر متشدد قالب میں ڈھل کر انقلاب فرانس کے نعرے، نئی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ ان کی بازگشت ہمیں جنرل ڈوئیٹ۔ ڈی آئزن باور کے انتباہات میں نظر آتی ہے جو بعد ازاں امریکہ کا صدر بنا۔ اس نے آزادی، مساوات اور

اخوات پر جاری متشدد عسکر کاری کے نقصان دہ اثرات کا ذکر کیا تھا۔ آزادی کے حوالے سے اس نے کہا تھا: ''حکومت کی پنچایتوں میں، ہمیں ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس کی ضروری اور غیر ضروری ناواجب اثر اندازی کے خلاف چوکنا رہنا چاہیے۔ ہم کبھی اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ یہ اتحاد اپنے بوجھ سے ہماری آزادیوں یا جمہوری طریق ہائے عمل کو خطرے میں ڈالے۔ ہمیں کسی شے پر حتمی اعتبار نہیں کرنا چاہیے'' (الوداعی خطاب، 17 جنوری، 1961ء)۔ معاشی مساوات کا ذکر کرتے ہوئے آئزن ہاور کا کہنا تھا: ''جنگ میں اتارا جانے والا ہر جنگی جہاز، داغا جانے والا ہر راکٹ، آخری مفہوم میں، ان سے سرقہ کیا گیا ہے جو بھوکے ہیں اور جنہیں خوراک مہیا نہیں کی جاتی، جو سردی برداشت کر رہے ہیں اور جنہیں لباس فراہم نہیں کیا جاتا'' (امریکن سوسائٹی آف نیوز پیپرز ایڈیٹرز سے خطاب، 16 اپریل 1953ء)۔ ''بھائی چارہ'' کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے جنرل آئزن ہاور نے کہا ''فی الحقیقت، میری رائے ہے کہ آج کل لوگ اتنی شدت سے امن چاہتے ہیں کہ حکومتوں کو ان کے راستے سے ہٹ جانا چاہیے اور لوگوں کو امن حاصل کرنے دینا چاہیے'' (بی بی سی ٹیلی وژن انٹرویو، 31 اگست 1959ء)۔

4 دسمبر 1996ء کو واشنگٹن ڈی سی میں نیشنل پریس کلب سے خطاب کرتے ہوئے امریکہ کی ایٹمی جنگ لڑنے والی تمام افواج کے سابق کمانڈر (ر) جنرل جارج لی بٹلر نے جوہری اسلحہ کی محض کمی کا نہیں بلکہ مکمل خاتمے کا مطالبہ کیا اور امریکہ سے کہا کہ اس کے موجد اور اولین استعمال کنندہ کی حیثیت سے وہ اس عمل میں پہل کاری کرے۔ انہوں نے خبردار

کرتے ہوئے کہا کہ بصورتِ دیگر امریکہ کے پاس کوئی اخلاقی جواز نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو اس کے حصول سے روکے۔ انہوں نے دلائل پیش کرتے ہوئے کہا: ''جوہری ہتھیار خلقی طور پر خطرناک، انتہائی مہنگے قدر، فوجی طور پر غیر موثر، اور اخلاقی طور پر نا قابلِ تائید ہیں۔'' اس طرح جنرل بٹلر بھی اسی نتیجے پر پہنچے جو مدتِ دراز سے، روحانی وجدان کے حامل امریکیوں کا موقف رہا ہے، مثال کے طور پر سورڈز ان ٹو پلوشیئرز تحریک کے ارکان، جن کی جوہری ہتھیاروں کی مخالفت کا جرم مسلسل طور پر انہیں وفاقی قید خانوں کی زینت بناتا رہتا ہے۔ جوہری ہتھیاروں کے خاتمے کی تحریک کا ہلاکت کے دیگر ہتھیاروں پر بھی اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

اگر، ہلاکت کے پیشے میں مہارت رکھنے والے یہ جنرل، اپنے پیشوں کے جاری تصورات اور سماج سے اس کے تعلق کے بارے میں اتنے گہرے سوالات اٹھا سکتے ہیں تو کیا ماہرین علم سیاسیات اپنے ذاتی پیشے کی تشدد پسند پیش قیاسیوں اور ہلاکت گریز سماجوں کے عالمگیر حصول کے لیے سماجی کردار اور کوشش کو زیر بحث نہیں لا سکتے؟

علم سیاسیات کے زیادہ تر امریکن ماہرین اور ان کے بین الاقوامی ہم منصب، غالباً اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ہلاکت گریزی کی فکر نے، امریکہ میں ایک علمی ضابطے کے طور پر علم سیاسیات کی تخلیق میں کتنا ترغیبی کردار ادا کیا ہے۔ اس فکر کا ایک سرچشمہ ایک نوجوان یونین سولجر، جان ڈبلیو برگز کا میدان جنگ میں کیا گیا عہد (VOW) ہے۔ اس نوجوان سپاہی کو ٹینسی میں اتحادی فوجوں کے ساتھ سارے دن کی ایک خون ریز جنگ کے بعد رات کی

پہرے داری سونپی گئی تھی۔اس نے کہا تھا:

اس وقت بھی موسلا دھار بارش ہورہی تھی؛ نیلے آسمان پر خوفناک بجلیوں کی کڑک اور چمک جاری تھی،اور پورا آسمان توپ کے گولوں جیسی گرج کڑک سے گونج رہا تھا۔فطرت کے اس شور وغوغا اور دھاچوکڑی کے ساتھ زخمی اور مرتے ہوئے جانوروں کی چیخیں اور زخمی اور مرتے ہوئے لوگوں کی چیخیں اور کراہیں شامل ہوگئی تھیں۔ انتہائی سخت دل سپاہیوں کے لیے بھی یہ ایک دہشت ناک رات تھی۔ میری طرح کے نوجوان اور حساس آدمی کے لیے یہ سب ناقابلِ بیان حد تک ہیبت ناک تھا اور آج تک میرے لیے ایک کریہہ اور خوفناک خواب بنا ہوا ہے۔ بہرحال، اس تجربے سے گزرتے ہوئے میرے ذہن میں آئندہ زندگی میں کچھ کر گزرنے کا خیال آیا تھا۔ جب میں نے اندھیرے میں جھانکنے کے لیے نظروں پر زور ڈالا اور قریب آتے ہوئے دشمن کے قدموں کی آواز سننے کے لیے کان لگائے، تو میں نے اپنے آپ کو خود سے سرگوشی کرتے پایا: کیا خدا کی شبیہہ میں تخلیق کیے گئے، فہم کے حامل ایک آدمی کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ جسمانی تشدد کے تخریبی ذرائع استعمال کیے بغیر فراست کی قوت سے اپنی بقا کے مسائل حل کرے؟'' اور تب میں نے خدا سے عہد کیا کہ اگر رحم کرنے والے خدا نے مجھے موجودہ جنگ کے تباہ کن خطرے سے بچالیا تو میں اپنی زندگی خونریزی اور تباہی میں گزارنے کی بجائے عقلی حدود کے اندر اور افہام وتفہیم میں گزاروں گا (برگیز 1934ء:28)۔

اپنے عہد کو نباہتے ہوئے، برگیز گریجویشن کرنے کے لیے جرمنی روانہ ہوگیا اور وہاں سے واپس آکر اس نے 1880ء میں نیویارک میں کولمبیا کالج میں علم سیاسیات کی درس گاہ قائم کی۔

پروفیسر برگیز کو جو تجربہ حاصل ہوا، وہ ان رکاوٹوں کی نشاندہی کرتا ہے جن کا ہلاکت گریز علم سیاسیات کی مدد کرنے والوں کو سامنا ہوسکتا ہے۔ یہ رکاوٹیں ماحول کے حساب سے

معمولی سے لے کر انتہائی شدید نوعیت تک کی ہوسکتی ہیں، اور ان کو عبور کرنے کے لیے ہمت اور عالمی تعاون کی ضرورت ہوگی۔ برگیز، جرمنوں کو اپنا ہی جیسا انسان سمجھتا تھا اس نے پہلی عالمی جنگ میں جرمنوں کے خلاف امریکہ کی شمولیت کی مخالفت کی۔ اس کے خیال میں ''شمولیت کے دن 6 اگست 1917ء کو ایک المناک ضرب کے ساتھ..... میرا زندگی بھر کا کام میرے چاروں طرف تباہ کر کے بکھیر دیا گیا (تھا) اور اس کی تلافی نہیں ہوسکتی تھی۔'' جرمن مخالف اور وطن پرست جنگ کے عین درمیان میں، اس نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''امن اور معقولیت پسند انسان آج دنیا کے لوگوں کی نظر میں غدار اور بزدل سمجھا جاتا ہے'' (29)۔ اس طرح پروفیسر برگیز کو بھی اسی کرب سے گزرنا پڑا جن سے ہر عہد کے صلح کاروں کو گزرنا پڑا ہے۔ جنہیں متحاربین کی خوبیوں اور خامیوں سے آگہی کی پاداش میں، ہر فریق کی جانب سے مذمت کا سامنا کرنا پڑا اور بعض اوقات اپنی اپنی زندگیوں کی قیمت بھی ادا کرنی پڑی۔

ہلاکت گریز سیاست کی طرح، ہلاکت گریز علم سیاسیات کو بھی گاندھی کے پیغام سے رہنمائی حاصل کرنی چاہئے، یہ پیغام روحانی اور انسانیت نواز اور احترام زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اس کام کے لیے جرأت کی ضرورت ہوگی۔ عالمی خونریزی کے دوران احترام زندگی کے اصولوں سے ماہرین علم سیاسیات کی وابستگی اتنی ہی ضروری ہے جتنی میکسیکو کے علاقے چیاپاز میں 1992ء میں قائم کردہ دی بیز سول سوسائیٹی (Sociedal Civil Abejas) کے کسانوں کی وابستگی تھی۔ Bees نے زپاتستا (Zapatista) کی مسلح بغاوت کے دوران

انصاف کے حصول کے لیے غیر متشدد جدوجہد کی۔ انہیں بھی زپاتستا جیسی شکایات تھیں تاہم انہوں نے واشگاف انداز میں کہا: ''ہمارا راستہ جدا ہے۔ ہم خدا کے کلام پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہمیں بائبل پڑھنا آتا ہے۔ ہمیں اپنے دشمنوں سے محبت کرنا چاہیے؛ ہم قتل نہیں کر سکتے۔ سب سے پہلے، ہم تہی دست کسان ہیں، بھائی اور بہنیں ..... ہم مرنے سے نہیں ڈرتے۔ ہم مرنے کو تیار ہیں، لیکن قتل کرنے کو نہیں'' (پیس نیوز، جولائی 1998ء:13,14)۔

ہم یہ توقع کیوں رکھیں کہ ہلاکت گریزی سے اصولی وابستگی ہمیشہ ''نچلی سطح سے ابھر کر'' اوپر تک آئے۔ برطانوی سامراجی تسلط میں رہنے والے نوآبادیاتی غلام ہندوستانی، سفید فام نسل پرستوں کے جبر کے شکار سیاہ فام امریکی، یا میکسیکو کے تہی دست کسان اس کی ایک مثال ہیں۔ کیوں نہ ہلاکت گریزی سے اصولی وابستگی مقامی، قومی، بین الاقوامی عالمی اشرافیہ اور علمِ سیاسیات کے ماہرین کی سطح سے اُوپر سے نیچے کی طرف آئے؟

جیسا کہ ہلاکت گریز صلاحیتوں کی داخلی تحقیق وتفتیش سے انکشاف ہوتا ہے، اس اعتماد کی بنیاد موجود ہے کہ انسان، ہلاکت گریز عالمی قلب ماہیت کو ممکن بنا سکتا ہے۔ فی الحقیقت ایک ہلاکت گریز سماج کے اجزائے ترکیبی، انسانی تجربے میں کہیں نہ کہیں ظاہر ہو چکے ہیں۔ اب صرف ان کو شناخت کرنا، تقویت دینا، مقامی اور عالمی تقاضوں اور صورتحال پر ان کو تخلیقی طور پر منطبق کرنا باقی ہے۔ ماضی کا ہیبت زدہ احساس اور موجودہ خونریزی، ایک طاقتور ہلاکت گریز محرک اور معاشرتی میلان پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ ہمیں انسانیت کی قاتلانہ غلطیوں کو دہرانا نہیں چاہیے۔ لہٰذا ہمیں ایسے اقدامات کرنے چاہئیں جو ہلاکت کے

تسلسل یا ہلاکت کی جانب مراجعت کو ناممکن بنا دیں۔

ماہرین بشریات کلیٹن اور کیرول روبر جیک (1998) کی رپورٹ کے مطابق، 1958ء کے بعد 30 سال کے مختصر عرصے میں ایکویڈور کی ووارانی قوم (Waorani) کی قتل کی وارداتوں میں 90 فیصد حیرت انگیز کمی ظاہر کرتی ہے کہ انسان تیز رفتار ہلاکت گریز تبدیلی کی اہلیت رکھتے ہیں۔ گزشتہ پوری صدی کے دوران 60 فیصد اموات کا تعلق قتل سے تھا جس کے حوالے سے ووارانیوں کو ''بشریات کے علم کے مطابق انتہائی متشدد سماج'' خیال کیا جاتا تھا۔ وہاں قتل کی شرح فی ایک لاکھ کی آبادی میں ایک ہزار تھی جبکہ اس کے مقابلے میں امریکہ میں یہ شرح 10 یا اس سے کم قتل فی ایک لاکھ تھی۔ لیکن تین عشروں کے دوران ووارانیوں میں یہ تعداد کم ہوکر 60 قتل فی ایک لاکھ رہ گئی۔ اس تبدیلی میں اہم کردار ادا کرنے والوں میں دو عیسائی مشنری خواتین کی جراتمندانہ قائدانہ پہل کاریاں شامل تھیں۔ یہ دو خواتین ان شہید مردوں کی بیوہ اور بہن تھیں جو 1965ء میں ووارانیوں سے رابطہ کرنے کی ایک ناکام کوشش کے دوران قتل کر دیئے گئے تھے۔ اس کے علاوہ متعدد ووارانی خواتین کی معاونت، ایک متبادل ہلاکت گریز نظام اقدار کا تعارف ووارانیوں میں نئی Cognative معلومات کی رسائی جس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ بیرونی دنیا کے لوگ آدم خور نہیں ہیں۔ یہ معلومات ان ووارانی خواتین کے ذریعے ان تک پہنچی تھی جو باہر کی دنیا دیکھ چکی تھیں۔ ووارانیوں کی اپنی خواہش اور خوفناک انتقاموں کے لاانتہا سلسلے کے خاتمے کے حوالے سے ووارانیوں کی اپنی خواہش نے جن کے پورے خاندان موت کے گھاٹ اتارے

جا چکے تھے، اس تبدیلی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ کلیساؤں کو منظّم کیا گیا اور قتل بند کئے جانے کے لیے دعائیہ عہد کئے گئے۔ قتل کی شرح میں کمی پولیس یا دیگر استبدادی ذرائع کے بغیر اور سماجی و معاشی ڈھانچے میں تبدیلی کے ذریعے کی گئی۔ ماضی کے برعکس، ساختی تبدیلیوں کے نتیجے میں ہلاکت گریزی کے لئے نئے روحانی پیمان وفا اور نئی معلومات کی یکجائی کا عمل شروع ہوا یہاں تک کہ غیر عیسائی گروہ بھی تبدیل ہونے لگے۔

روبرجیکس کی رائے کے مطابق اقدار اور ساخت میں یہ غیر معمولی تبدیلی، جو کہ اب بھی نامکمل ہے، انسانی رویوں کے بارے میں اہم نظری تصورات کی تصدیق کرتی ہے:

> لوگوں کو ایسی غیر متحرک مشین نہیں سمجھنا چاہیے جو ماحولیاتی، حیاتیاتی، یا پھر سماجی ثقافتی جبریت کے ذریعے حرکت میں آتی ہے بلکہ یہ کام فعال فیصلہ ساز لوگ کرتے ہیں جو اپنے انفرادی اور ثقافتی طور پر واضح اہداف کے حصول کے لئے ثقافتی لحاظ سے واضح حقیقت کے تناظر میں انتخاب اور اجتناب کے میدان سے اپنی راہیں نکالتے ہیں کہ تعمیر اور تعمیر نو ایک مسلسل جاری عمل کا نام ہے (1998ء:4)۔

ووران تجربہ، ایک ہلاکت گریز علمِ سیاسیات کے تناظر میں یہ شہادت پیش کرتا ہے کہ تبدیلی لانے والی تخلیقی قیادت میں سماج کی قلب ماہیت کی صلاحیت مضمر ہوتی ہے۔ جو ایک ووران کر سکتا ہے، وہ بہ طور پیشہ اور سماج کی خدمت کے حوالے سے علم سیاسیات بھی کر سکتا ہے۔ ابھی بہت کام کرنا ہے کیونکہ حقیقتاً، نہ تو ووران اور نہ دنیا ہلاکت سے آزاد ہے۔ توانائی کے پیداواری عمل میں مصروف باہر والوں کی مداخلتوں اور ہلاکت گریز روحانی دانش کے اثرات سے ناواقف ووران کے پڑوسیوں کے حملوں کے نتیجے میں خوں ریزیوں کے کچھ

واقعات دوبارہ رونما ہوئے۔ ہر چند کہ ہلاکت گریز خطوں (enclaves) کا قیام ممکن ہے اور عالمی تبدیلی کے لئے ان کی ضرورت ہے تاہم عدم تشدد کے جذبے اور عمل کو عالمگیر ہونا چاہئے۔

عالمگیر ناگزیریت

ہلاکت گریز علم سیاسیات کا دائرہ عالم گیر ہونا چاہیے۔ اسے دریافت، اختراع، تنوع اور اثر پذیری کے اعتبار سے، جذبے، سائنس، مہارتوں، گیت، اداری ترجمانیوں، اور اختصاصِ وسائل کے اعتبار سے، پُر مسرت زندگی کے لیے درکار پہل کاریوں کے لیے خلاق قیادت کے نشو ونما اور سب کو بااختیار بنانے کے حوالے سے اُسے عالم گیر ہونا چاہئے۔ علمِ سیاسیات کو انسانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہمدردانہ وابستگی کے حوالے سے عالم گیر ہونا چاہئے۔ اُسے ہر جگہ سے قتل کے خاتمے کے عزم کے حوالے سے عالم گیر ہونا چاہئے، بصورت دیگر کوئی فرد کہیں بھی محفوظ نہ ہوگا۔ اُسے شراکت کے اعتبار سے عالم گیر ہونا چاہئے کیونکہ کوئی ایک مسلک، پیشہ، یا سماج تمام مطلوبہ بصیرتیں، مہارتیں اور وسائل نہیں رکھتا۔ اُسے مقامی سطحوں پر فلاح سے وابستگی کے اعتبار سے عالم گیر ہونا چاہئے کیونکہ یہ وہ چھوٹے چھوٹے بیج ہیں جو عالم گیر آزادی کے خواب کے لیے بارآور ہو سکتے ہیں۔ اسے تنوع کے احترام میں اور خود اپنے اور دوسرے سماجوں میں لوگوں کی ہلاکت گریز فلاح سے، کثیر الجہت وفاداریوں

کے حوالے سے عالمگیر ہونا چاہئے، اُسے اُن سب لوگوں کے درمیان باہمی تعاون (Supportiveness) کے حوالے سے عالم گیر ہونا چاہئے جو مکمل آزادی، برابری، خوشحالی اور امن کے حصول کی راہ میں مزاحم ہلاکت آفریں دور کے خاتمے کے لیے مطالعے، تدریس اور عمل میں مصروف ہیں۔ ہمیں عالم گیر ہونا چاہئے کہ ہم چاند سے اپنی مادر گیتی کا نظارہ کرسکیں جہاں ہم سب زندگی کی اربوں لمحاتی چنگاریوں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ جاننا چاہئے کہ ہلاکت گریز دنیا کی تعمیر میں ہم سب کو اہم کردار ادا کرنا ہے۔ ہم میں سے کوئی ایک بھی اس حوالے سے غیر اہم نہیں ہے۔

عالم گیر زندگی میں ہلاکت آفرینی کے خاتمے کے ہدف سے مراد یہ ہے کہ تشدد کو قبول کرنے والے علمِ سیاسیات کو ایک ایسی ہلاکت گریز سائنس میں تبدیل کر دیا جائے جو محبت، فلاح، اور تخلیقی جوہر کے آزادانہ اظہار جیسی انسانی ضروریات اور امنگوں کو پورا کر سکے۔

کیا ایک ہلاکت گریز سماج ممکن ہے؟

کیا ایک ہلاکت گریز عالمی علم سیاسیات ممکن ہے؟

ہاں!

Bibliography

ABUEVA, Jose V. 2004. *Towards a Nonkilling Filipino Society: Developing an Agenda for Research, Policy and Action*. Marikina City: Kalayaan College.

ACKERKNECHT, Erwin H. 1982. *A Short History of Medicine*. Baltimore: Johns Hopkins University Press.

ACKERMAN, Peter and DUVALL, Jack. 2000. *A Force More Powerful: A Century of Nonviolent Conflict*. New York: St. Martin's Press.

ADAMS, David *et al*. 1989. Statement on violence. *Journal of Peace Research*, 26: 120-21.

_____ 1997. War is not in our biology: a decade of the Seville statement on violence. In Grisolía et al. 1997: 251-56.

ADAMS, David. 2007. *Why Do They Kill? Men who Murder Their Intimate Partners*. Nashville, TN: Vanderbilt University Press.

ALMOND, Gabriel A. 1996. Political science: the history of the discipline. In Goodin and Klingemann 1996: 50-96.

ALPEROVITZ, Gar. 1995. *The Decision to Use the Atomic Bomb*. New York: Alfred A. Knopf.

AMATO, Joseph A. 1979. Danilo Dolci: a nonviolent reformer in Sicily. In Bruyn and Rayman 1979: 135-60.

AMNESTY INTERNATIONAL. 2009. *Figures on the death penalty* (access January 2009), http://www.amnesty.org/en/death-penalty/numbers.

ANDERSON, Richard C. 1994. *Peace Was In Their Hearts: Conscientious Objectors in World War II*. Watsonville, Calif.: Correlan Publications.

AQUINO, Corazón C. 1997. Seeds of nonviolence, harvest of peace: The Philippine revolution of 1986. In Grisolía *et al*. 1997: 227-34.

ARENDT, Hannah. 1970. *On Violence*. New York: Harcourt, Brace & World.

_____ 1982. *Lectures on Kant's Political Philosophy*. Chicago: University of Chicago Press.

ARISTOTLE. 1962. *The Politics*, trans. T.A. Sinclair. Harmondsworth: Penguin.

ASHE, Geoffrey. 1969. *Gandhi*. New York: Stein and Day.

AUNG SAN SUU KYI. 1998. *The Voice of Hope*. New York: Seven Stories Press.

BAHÁ'U'LLÁH. 1983. *Gleanings from the Writings of Bahá'u'lláh*. Wilmette, Ill.: Baha'i Publishing Trust.

BANERJEE, Mukulika. 2000. *The Pathan Unarmed*. Karachi & New Delhi: Oxford University Press.

BARBEY, Christophe. 1989. *Les pays sans armée*. Cormagens, Switzerland: Éditions Pour de Vrai.
BAXTER, Archibald. 2000. *We Will Not Cease*. Baker, Ore.: The Eddie Tern Press.
BEBBER, Charles C. 1994. Increases in U.S. violent crime during the 1980s following four American military actions. *Journal of Interpersonal Violence* 9(1): 109-16.
BEER, Michael. 1994. Annotated bibliography of nonviolent action training. *International Journal of Nonviolence*, 2: 72-99.
BEISNER, Robert L. 1968. *Twelve Against Empire: The Anti-Imperialists, 1898-1900*. New York: McGraw-Hill.
BENDAÑA, Alejandro. 1998. "From Guevara to Gandhi." Managua, Nicaragua: Centro de Estudios Internationales.
BENNETT, Lerone Jr. 1993. *Before the Mayflower: A History of Black America*. New York: Penguin Books.
BHAVE, Vinoba. 1963. *Shanti Sena*, 2nd ed., trans Marjorie Sykes. Rajghat, Varanasi, India: Sarva Seva Sang Prakashan.
_____ 1994. *Moved by Love: The Memoirs of Vinoba Bhave*, trans. Marjorie Sykes. Hyderabad: Sat Sahitya Sahayogi Sangh.
BING, Anthony G. 1990. *Israeli Pacifist:* The *Life of Joseph Abileah*. Syracuse, N.Y.: Syracuse University Press.
BISWAS, S.C. ed. 1990[1969]. *Gandhi: Theory and Practice. Social Impact and Contemporary Relevance*. Shimla: Indian Institute of Advanced Study.
BONDURANT, Joan V. 1969. *Conquest of Violence: The Gandhian Philosophy of Conflict*. Berkeley: University of California Press.
BONTA, Bruce D. 1993. *Peaceful Peoples: An Annotated Bibliography*. Metuchen, N.J. and London: Scarecrow Press.
_____ 1996. Conflict resolution among peaceful societies: the culture of peacefulness. *Journal of Peace Research*, 33: 403-420.
BOORSTIN, Daniel J. 1983. *The Discoverers*. New York: Random House.
_____ 1992. *The Creators*. New York: Random House.
_____ 1998. *The Seekers*. New York: Random House.
BOSERUP, Anders and MACK, Andrew. 1974. *War Without Weapons: Non-Violence in National Defence*. New York: Schocken Books.
BOUBALT, Guy; GAUCHARD, Benoît; and MULLER, Jean-Marie. 1986. *Jacques de Bollardière: Compagnon de toutes les libérations*. Paris: Non-Violence Actualité.
BOULDING, Elise. 1980. *Women, the Fifth World*. New York: Foreign Policy Association.
_____ 1992. *New Agendas for Peace Research: Conflict and Security Reexamined*. Boulder, Colo.: Lynne Rienner Publishers.
BOURKE, Joanna. 2001. *An Intimate History of Killing: Face-to-Face Killing in Twentieth Century Warfare*. New York: Perseus Books.
BOURNE, Randolph S. 1964[1914-1918]. *War and the Intellectuals*. New York: Harper & Row.

BROCK, Peter. 1968. *Pacifism in the United States: From the Colonial Era to the First World War*. Princeton: Princeton University Press.
_____ 1970. *Twentieth Century Pacifism*. New York: D. Van Nostrand.
_____ 1972. *Pacifism in Europe to 1914*. Princeton: Princeton University Press.
_____ 1990. *The Quaker Peace Testimony 1660 to 1914*. York, England: Sessions Book Trust.
_____ 1991a. *Studies in Peace History*. York, England: William Sessions Limited.
_____ 1991b. Conscientious objectors in Lenin's Russia: A report, 1924. Pp. 81-93 in *Studies in Peace History.*
_____ 1992. *A Brief History of Pacifism: From Jesus to Tolstoy*. Syracuse, N.Y.: Syracuse University Press.
BROWN, Lester *et al*. 1997. *State of the World 1997*. New York: W.W. Norton & Company.
_____, GARDNER, Gary, and HALWEIL, Brian. 1999. *Beyond Malthus: Nineteen Dimensions of the Population Challenge*. New York: W.W. Norton.
BRUYN, Severyn T. and RAYMAN, Paula M., eds. 1979. *Nonviolent Action and Social Change*. New York: Irvington Publishers.
BUREAU OF JUSTICE. 1997. *Capital Punishment 1996*. Washington: U.S. Department of Justice.
_____ 1998. *Prisoners in 1997*. Washington, D.C.: U.S. Department of Justice.
BURGESS, John W. 1934. *Reminiscences of an American Scholar*. New York: Columbia University Press.
BURNS, James MacGregor. 1978. *Leadership*. New York: Harper & Row.
BURROWES, Robert J. 1996. *The Strategy of Nonviolent Defense: A Gandhian Approach*. Albany: State University of New York Press.
BURTON, John. 1979. *Deviance, Terrorism & War: The Process of Solving Unsolved Social and Political Problems*. New York: St. Martin's Press.
_____ 1984. *Global Conflict: The Domestic Sources of International Crisis*. Brighton: Wheatsheaf Books.
_____ 1996. *Conflict Resolution: Its Language and Processes*. Lanham, Md.: Scarecrow Press.
_____ 1997. *Violence Explained: The Sources of Conflict, Violence and Crime and their Prevention*. Manchester: Manchester University Press.
CAMPBELL, Donald T. and FISKE, Donald W. 1959. Convergent and discriminant validation by the multitrait-multimethod matrix. *Psychological Bulletin* 56 (2): 81-105.
CANADA, Geoffrey. 1995. *Fist Stick Knife Gun: A Personal History of Violence in America*. Boston: Beacon Press.
CARNEGIE COMMISSION ON PREVENTING DEADLY CONFLICT. 1997. *Preventing Deadly Conflict: Final Report*. Washington, D.C.: Carnegie Commission on Preventing Deadly Conflict.
CARROLL, Berenice A. 1998. Looking where the key was lost: feminist theory and nonviolence theory. In Satha-Anand and True 1998: 19-33.

CASE, Clarence M. 1923. *Non-Violent Coercion: A Study in Methods of Social Pressure*. London: Allen and Unwin.
CHAPPLE, Christopher K. 1993. *Nonviolence to Animals, Earth, and Self in Asian Traditions.* Albany: State University of New York Press.
CHARNY, Israel W. 1982. *How Can We Commit the Unthinkable? Genocide the Human Cancer*. Boulder, Colo.: Westview Press.
CHAUDHURI, Eliana R. 1998. *Planning with the Poor: The Nonviolent Experiment of Danilo Dolci in Sicily*. New Delhi: Gandhi Peace Foundation.
CHOWDHURY, H.B., ed. 1997. *Asoka 2300*. Calcutta: Bengal Buddhist Association.
CHRISTIAN, R.F. 1978. *Tolstoy's Letters: Volume II 1880-1910*. New York: Charles Scribner's Sons.
CLAUSEWITZ, Carl von. 1976 [1832]. *On War*, ed. and trans. Michael Howard and Peter Paret. Princeton: Princeton University Press.
COMMONER, Barry. 1990. *Making Peace With the Planet*. New York: Pantheon Books.
COMMAGER, Henry S. 1991. The history of American violence: an interpretation. Pp. 3-28 in *Violence: The Crisis of American Confidence*, ed. Hugh D. Graham. Baltimore: Johns Hopkins Press.
COMSTOCK, Craig. 1971. Avoiding pathologies of defense. Pp. 290-301 in *Sanctions for Evil*, ed. Nevitt Sanford and Craig Comstock. Boston: Beacon Press.
CONSER, Walter H., Jr.; McCARTHY, Ronald M.; TOSCANO, David J.; and SHARP, GENE., eds. 1986. *Resistance, Politics and the Struggle for Independence*. Boulder, Colo.: Lynne Rienner Publishers.
COOK, Philip J. and LUDWIG, Jens. 1997. Guns in America: national survey on private ownership and use of firearms. *Research in Brief*, no. 1026. Washington: National Institute of Justice.
COONEY, Robert and MICHALOWSKI, Helen, eds. 1987. *Power of the People: Active Nonviolence in the United States*. Philadelphia, Penn.: New Society Publishers. (Chief Seattle's message pp. 6-7 has been shown to be a screenwriter's fiction.)
COPPIETERS, Bruno and ZVEREV, Alexei. 1995. V.C. Bonch-Bruevich and the Doukhobors: on the conscientious-objection policies of the Bolsheviks. *Canadian Ethnic Studies/Etudes Ethniques au Canada* 27(3): 72-90.
COUSINS, Norman. 1987. *The Pathology of Power*. New York: W.W. Norton.
CRAIG, Leon H. 1994. *The War Lover: A Study of Plato's Republic*. Toronto: University of Toronto Press.
CROW, Ralph E.; GRANT, Philip; and IBRAHIM, Saad E., eds. 1990. *Arab Nonviolent Political Struggle in the Middle East*. Boulder, Colo.: Lynne Rienner Publishers.
CROZIER, Frank P. (Brig. Gen.). 1938. *The Men I Killed*. New York: Doubleday.
DALTON, Dennis. 1993. *Mahatma Gandhi: Nonviolent Power in Action*. New York: Columbia University Press.
DANGE, S.A.; MUKERJEE, H.; SARDESAI, S.G.; and SEN, M. 1977. *The Mahatma: Marxist Evaluation*. New Delhi: People's Publishing House.
DANIELS, David N. and GILULA, Marshall F. 1970. Violence and the struggle for existence. In Daniels, Gilula, and Ochberg 1970: 405-43.

_____; GILULA, Marshall F.; and OCHBERG, Frank M., eds. 1970. *Violence and the Struggle for Existence*. Boston: Little, Brown.
DAVIDSON, Osha G. 1993. *Under Fire: The NRA and the Battle for Gun Control*. New York: Henry Holt.
THE DEFENSE MONITOR. 1972-. Washington, D.C.: Center for Defense Information.
DELLINGER, Dave. 1970. *Revolutionary Nonviolence*. Indianapolis, Ind.: Bobbs-Merrill.
DENNEN, J.M.G. van der. 1990. Primitive war and the ethnological inventory project. Pp. 247-69 in *Sociobiology and Conflict*, eds. J. van der Dennen and V. Falger. London: Chapman and Hall.
_____ 1995. *The Origin of War*. 2 vols. Groningen: Origin Press.
DENSON, John V., ed. 1997. *The Costs of War: America's Pyrrhic Victories*. New Brunswick, N.J.: Transaction Books.
DHAWAN, Gopinath. 1957. *The Political Philosophy of Mahatma Gandhi*. Ahmedabad: Navajivan Publishing House.
DISSERTATION ABSTRACTS INTERNATIONAL, 1963-99.
DOGAN, Mattei and PAHRE, Robert. 1990. *Creative Marginality: Innovation at the Intersection of the Social Sciences*. Boulder, Colo.: Westview.
DRAGO, Antonino. 1996. When the history of science suggests nonviolence. *The International Journal of Nonviolence* 3: 15-19.
EDGERTON, William, ed. 1993. *Memoirs of Peasant Tolstoyans in Soviet Russia*. Bloomington: Indiana University Press.
EIBL-EIBESFELDT, Irenäus. 1979. *The Biology of Peace and War: Men, Animals, and Aggression*. New York: Viking Press.
EISENDRATH, Maurice. 1994. Thou shalt not kill – period. In Polner and Goodman 1994: 139-45.
EISENHOWER, Dwight D. 1953. Speech to the American Society of Newspaper Editors, April 16, 1953. Full-page excerpt in *The Wall Street Journal*, May 30, 1985, p. 29.
_____ 1959. BBC TV interview, August 31, 1959. Quoted in Peter Dennis and Adrian Preston, eds., *Soldiers as Statesmen*. New York: Barnes & Noble, 1976, p. 132.
_____ 1961. Farewell broadcast, January 17, 1961. *The Spoken Word*, SW-9403.
EVANS, Gwynfor. 1973. "Nonviolent Nationalism." New Malden, Surrey: Fellowship of Reconciliation. The Alex Wood Memorial Lecture, 1973.
EVERETT, Melissa. 1989. *Breaking Ranks*. Philadelphia, Penn.: New Society Publishers.
FABBRO, David. 1978. Peaceful societies: an introduction. *Journal of Peace Research* 15: 67-84.
FEDERAL BUREAU OF INVESTIGATION, U.S. DEPARTMENT OF JUSTICE. 1998. *Crime in the United States 1997*. Washington, D.C.: Federal Bureau of Investigation.
FINER, Samuel E. 1997. *The History of Government From the Earliest Times*. New York: Oxford University Press. Vol. i, *Ancient Monarchies and Empires*. Vol. ii, *The Intermediate Ages*. Vol. iii, *Empires, Monarchies, and the Modern State*.
FISHER, Roger and URY, William. 1981. *Getting to Yes*. Boston, Mass.: Houghton Mifflin Company.

FOGELMAN, Eva. 1994. *Conscience & Courage: Rescuers of Jews During the Holocaust*. New York: Doubleday.
FOSTER, Catherine. 1989. *Women for All Seasons: The Story of the Women's International League for Peace and Freedom*. Athens: University of Georgia Press.
FRANK, Jerome D. 1960. Breaking the thought barrier: psychological challenges of the nuclear age. *Psychiatry* 23: 245-66.
_____ 1993. *Psychotherapy and the Human Predicament,* ed. P.E. Dietz. Northvale, N.J.: Jason Aronson.
FRIEDRICH, Carl J. 1969[1948]. *Inevitable Peace*. New York: Greenwood Press.
FROMM, Erich. 1973. *The Anatomy of Human Destructiveness*. New York: Holt, Rinehart and Winston.
FRY, A. Ruth. [1952]1986. *Victories Without Violence*. Santa Fe, N. Mex.: Ocean Tree Books.
FRY, Douglas P. 1994. Maintaining social tranquility: internal and external loci of aggression control. In Sponsel and Gregor 1994: 135-54.
_____ and BJÖRKVIST, Kaj, eds. 1997. *Cultural Variation in Conflict Resolution: Alternatives to Violence*. Mahwah, N.J.: Lawrence Erlbaum Associates, Publishers.
FULLER, John G. 1985. *The Day We Bombed Utah*. New York: Signet Books.
FUNG, Yu-Lan. 1952. *History of Chinese Philosophy*, trans. Derke. Bodde. Vol. i. Princeton: Princeton University Press.
FUSSELL, Paul. 1997. The culture of war. In Denson 1997: 351-8.
GALTUNG, Johan. 1969. Violence, peace and peace research. *Journal of Peace Research*, 6: 167-91.
_____ 1984. *There are Alternatives!* Nottingham: Spokesman.
_____ 1990. *The True Worlds: A Transnational Perspective*. New York: The Free Press.
_____ 1992. *The Way is the Goal: Gandhi Today*. Ahmedabad: Gujarat Vidyapith, Peace Research Centre.
_____ 1996. *Peace by Peaceful Means*. London: SAGE Publications.
_____ 1998. *Conflict Transformation by Peaceful Means: The Transcend Method*. Geneva/Torino: Crisis Environments Training Initiative and Disaster Management Training Programme, United Nations.
GANDHI, Mohandas K. 1957[1927-1929]. *An Autobiography: The Story of My Experiments with Truth*. Boston, Mass.: Beacon Press.
_____ 1958-1994. *The Collected Works of Mahatma Gandhi*. Vols. 1-100. New Delhi: Publications Division, Ministry of Information and Broadcasting, Government of India.
_____ 1969[1936-1940]. *Towards Non-Violent Politics*. Thanjavur, Tamilnad, India: Sarvodaya Prachuralaya.
_____ 1970. *The Science of Satyagraha*, ed. A.T. Hingorani. Bombay: Bharatiya Vidya Bhavan.
_____ 1971. *The Teaching of the Gita*, ed. A.T. Hingorani. Bombay: Bharatiya Vidya Bhavan.

GARA, Larry and GARA, Lenna Mae. 1999. *A Few Small Candles: War Resisters of World War II Tell Their Stories.* Kent, Ohio: Kent State University Press.
GARRISON, Fielding H. 1929. *An Introduction to the History of Medicine*. Philadelphia, Penn.: W.B. Saunders.
GIOGLIO, Gerald R. 1989. *Days of Decision: An Oral History of Conscientious Objectors in the Military in the Vietnam War*. Trenton, N.J.: Broken Rifle Press.
GIORGI, Piero. 1999. *The Origins of Violence By Cultural Evolution*. Brisbane: Minerva E&S.
GIOVANNITTI, Len and FREED, Fred. 1965. *The Decision to Drop the Bomb*. New York: Coward-McCann.
GOLDMAN, Ralph M. 1990. *From Warfare to Party Politics: The Critical Transition to Civilian Control*. Syracuse: Syracuse University Press.
GOODIN, Robert E. and KLINGEMANN, Hans-Dieter, eds. 1996. *A New Handbook of Political Science*. Oxford: Oxford University Press.
GREENLEAF, Robert K. 1977. *Servant Leadership: An Inquiry into the Nature of Legitimate Power and Greatness*. New York: Paulist Press.
GREGG, Richard B. 1966[1935]. *The Power of Nonviolence*. New York: Schocken.
GRISOLÍA, James S. *et al.*, eds. 1997. *Violence: From Biology to Society*. Amsterdam: Elsevier.
GROSSMAN, Dave (Lt. Col.). 1995. *On Killing: The Psychological Cost of Learning to Kill in War and Society*. Boston, Mass.: Little Brown.
_____ and DeGaetano, GLORIA. 1999. *Stop Teaching Our Kids to Kill*. New York: Crown Publishers.
GUETZKOW, Harold. 1955. *Multiple Loyalties: Theoretical Approach to a Problem in International Organization*. Princeton, N.J.: Center for Research on World Political Institutions, Princeton University.
GUSEINOV, A.A., ed. 1993. *Nyenasiliye: Filosofiya, Etika, Politika* [Nonviolence: Philosophy, Ethics, Politics]. Moscow: Nauka.
HALBERSTAM, David. 1998. *The Children*. New York: Random House.
HALLIE, Philip. 1979. *Lest Innocent Blood Be Shed*. New York: Harper & Row.
HARRIES-JENKINS, Gwyn. 1993. Britain: from individual conscience to social movement. In Moskos and Chambers 1993: 67-79.
HAWKLEY, Louise and JUHNKE, James C. 1993. *Nonviolent America: History through the Eyes of Peace*. North Newton, Kans.: Bethel College.
HERMAN, A.L. 1999. *Community, Violence, and Peace*. Albany: State University of New York Press.
HESS, G.D. 1995. An introduction to Lewis Fry Richardson and his mathematical theory of war and peace. *Conflict Management and Peace Science* 14 (1): 77-113.
HOBBES. 1968 [1651]. *Leviathan*, ed. C.B. Macpherson. Harmondsworth: Penguin.
HOFSTADTER, Richard. 1971. Reflections on violence in the United States. Pp. 3-43 in *American Violence: A Documentary History*, ed. Richard Hofstadter and Michael Wallace. New York: Vintage.

HOLMES, Robert L., ed. 1990. *Nonviolence in Theory and Practice*. Belmont, Calif.: Wadsworth.

HORIGAN, Damien P. 1996. On compassion and capital punishment: a Buddhist perspective on the death penalty. *The American Journal of Jurisprudence*, 41: 271-88.

HOREMAN, Bart and STOLWIJK, Marc. 1998. *Refusing to Bear Arms: A World Survey of Conscription and Conscientious Objection to Military Service*. London: War Resisters International.

HUSAIN, Tariq. 1997. "The Leadership Challenges of Human Development." Paper presented at the United Nations University/International Leadership Academy, Amman, Jordan, June 1, 1997.

ISHIDA, Takeshi. 1974[1968]. *Heiwa no Seijigaku* [Political Science of Peace], 7th ed. Tokyo: Iwanami Shoten.

IYER, Raghavan N. 1973. *The Political and Moral Thought of Mahatma Gandhi*. New York: Oxford University Press.

JAIN, Sagarmal, ed.; VARNI, Jinendra, comp. 1993. *Saman Suttam*. Rajghat, Varanasi: Sarva Seva Sang Prakashan.

JOSEPHSON, Harold, ed. 1985. *Biographical Dictionary of Modern Peace Leaders*. Westport, Conn.: Greenwood Press.

JOSEPHSON, Hannah G. 1974. *Jeannette Rankin: First Lady in Congress*. Indianapolis: Bobbs-Merrill.

KANO, Takayoshi. 1990. The bonobos' peaceable kingdom. *Natural History*, 11: 62-70.

KANT, Immanuel. 1939[1795]. *Perpetual Peace*. New York: Columbia University Press.

KAPUR, Sudarshan. 1992. *Raising Up a Prophet: The African-American Encounter With Gandhi*. Boston, Mass.: Beacon Press.

KEELEY, Lawrence H. 1996. *War Before Civilization: The Myth of the Peaceful Savage*. Oxford: Oxford University Press.

KEEVER, Beverly Ann Deepe. 2007. De-escalating Media Language of Killing: An instructional module. *Conflict and Communication Online*, 6 (1).

KELLY, Petra K. 1984. *Fighting for Hope*. London: Chatto and Winders·The Hogarth Press.

_____ 1989. Gandhi and the Green Party. *Gandhi Marg*, 11: 192-202.

_____ 1990. "For feminization of power!" Speech to the Congress of the National Organization for Women, San Francisco, June 30, 1990.

_____ 1992. *Nonviolence Speaks to Power*. Honolulu: Center for Nonviolence Planning Project, Matsunaga Institute for Peace, University of Hawai i.

_____ 1994. *Thinking Green! Essays on Environmentalism, Feminism, and Nonviolence*. Berkeley, Calif.: Parallax Press.

KEYES, Gene. 1982. Force without firepower. *CoEvolution Quarterly*, 34: 4-25.

KEYFITZ, Nathan. 1966. How many people have lived on earth. *Demography* 3 (2): 581-2.

KHAN, Abdul K. 1997. "The Khudai Khidmatgar (Servants of God)/Red Shirt Movement in the North-West Frontier Province of British India, 1927-47." Ph.D. diss., History, University of Hawai i.

KING, Martin Luther, Jr. 1998. *The Autobiography of Martin Luther King, Jr.*, ed. Clayborne Carson. New York: Warner Books.
KISHTAINY, Khalid. 1990. Violent and nonviolent struggle in Arab history. In Crow, Grant, and Ibrahim 1990: 41-57.
KOHN, Stephen M. 1987. *Jailed for Peace: The History of American Draft Law Violators, 1658-1985*. New York: Praeger.
KONRAD, A. Richard. 1974. Violence and the philosopher. *Journal of Value Inquiry*, 8: 37-45.
KOOL, V.K., ed. 1990. *Perspectives on Nonviolence: Recent Research in Psychology*. New York: Springer-Verlag.
_____, ed. 1993. *Nonviolence: Social and Psychological Issues*. Lanham, Md.: University Press of America.
KROPOTKIN, Peter. 1972 [1914]. *Mutual Aid: A Factor of Evolution*. New York: New York University Press.
KUHLMANN, Jürgen and LIPPERT, Ekkehard. 1993. The Federal Republic of Germany: conscientious objection as social welfare. In Moskos and Chambers 1993: 98-105.
LAFAYETTE Jr., Bernard and JEHNSEN, David C. 1995. *The Briefing Booklet: An Introduction to The Kingian Nonviolence Reconciliation Program*. Galena, Ohio: Institute for Human Rights and Responsibilities.
_____ 1996. *The Leader's Manual, A Structured Guide and Introduction to Kingian Nonviolence: The Philosophy and Methodology*. Galena, Ohio: Institute for Human Rights and Responsibilities.
LEWER, Nick and SCHOFIELD, Steven, eds. 1997. *Non-Lethal Weapons: A Fatal Attraction!* London: Zed Books.
LEWIS, John. 1973[1940]. *The Case Against Pacifism*. Introd. Carl Marzani. New York: Garland.
LIGT, Barthélemy de. 1972[1938]. *The Conquest of Violence: an Essay on War and Revolution*, introds. George Lakey and Aldous Huxley. New York: Garland.
LOCKE, Hubert G. 1969. *The Detroit Riot of 1967*. Detroit, Mich.: Wayne State University Press.
LOCKE John. 1970 [1689]. *Two Treatises of Government*, ed. P. Laskett. Cambridge: Cambridge University Press.
LOPEZ-REYES, Ramon. 1998. The fight/flight response and nonviolence. In Satha-Anand and True 1998: 34-82.
LYND, Staughton and LYND, Alice, eds. 1995. *Nonviolence in America: A Documentary History*. Maryknoll, N.Y.: Orbis Books.
LYTTLE, Bradford. 1982. The apocalypse equation. *Harvard Magazine* (March-April): 19-20.
MCALLISTER, Pam. 1982. *Reweaving the Web of Life: Feminism and Nonviolence*. Philadelphia, Pa.: New Society Publishers.
_____ 1988. *You Can't Kill the Spirit*. Philadelphia, Pa.: New Society Publishers. Barbara Deming Memorial Series: Stories of Women and Nonviolent Action.

MCCARTHY, Colman. 1994. *All of One Peace*. New Brunswick, N.J.: Rutgers University Press.
MCCARTHY, Ronald M. 1997. Methods of nonviolent action. In Vogele and Powers 1997: 319-28. New York: Garland Publishing.
_____ and SHARP, G. 1997. *Nonviolent Action: A Research Guide*. New York and London: Garland Publishing.
MCGUINESS, Kate. 1993. Gene Sharp's theory of power: a feminist critique of consent. *Journal of Peace Research* 30: 101-15.
MCSORLEY, Richard. 1985. *New Testament Basis of Peacemaking*. Scottdale, Penn.: Herald Press.
MACGREGOR, G.H.C. 1960. *The Relevance of an Impossible Ideal*. London: Fellowship of Reconciliation.
MACNAIR, Rachel M. 2002. *Perpetration-Induced Traumatic Stress: The Psychological Consequences of Killing*. Westport, Conn.: Praeger Publishers.
_____ 2003. *The Psychology of Peace: An Introduction*. Westport, Conn.: Praeger Publishers.
_____ and ZUNES, Stephen, eds. 2008. *Consistently Opposing Killing: From Abortion to Assisted Suicide, the Death Penalty, and War*. Westport, CT: Greenwood.
MACHIAVELLI, Niccolo. 1961 [1513]. *The Prince*, trans. G. Bau. Harmondsworth: Penguin.
MAGUIRE, Mairead Corrigan. 1999. *The Vision of Peace*, ed. John Dear. Maryknoll, N.Y.: Orbis Books.
MAHAPRAJNA, Yuvacharya. 1987. *Preksha Dhyana: Theory and Practice*. Ladnun, Rajasthan: Jain Vishva Bharati.
_____ 1994. *Democracy: Social Revolution Through Individual Transformation*. Ladnun, Rajasthan: Jain Vishva Bharati.
MAHONY, Liam and EGUREN, Luis E. 1997. *Unarmed Bodyguards*. West Hartford, Conn.: Kumarian Press.
MANN, Coramae Richey. 1996. *When Women Kill*. Albany: State University of New York Press.
MARTIN, Brian. 1989. Gene Sharp's theory of power. *Journal of Peace Research*, 26: 213-22.
_____ *et al.* 1991. *Nonviolent Struggle and Social Defence*. Ed. S. Anderson and J. Larmore. London: War Resisters International and the Myrtle Solomon Memorial Fund.
_____ 1992. Science for non-violent struggle. *Science and Public Policy*, 19: 55-8.
MARX, Karl and ENGELS, Friedrich. 1976[1848]. *The Communist Manifesto*, introd. A.J.P. Taylor. Harmondsworth: Penguin.
MAYOR ZARAGOZA, Federico. 1995. *The New Page*. Paris: UNESCO Publishing.
MERCY, James A. and SALTZMAN, Linda E. 1989. Fatal violence among spouses in the United States 1976-85. *American Journal of Public Health* 79 (5): 595-9.
MOGIL, Christopher; and SLEPIAN, Ann; with WOODROW, Peter. 1993. *We Gave a Fortune Away.* Gabriola Island, B.C.: New Society Publishers.
MORGAN, Robin, ed. 1984. *Sisterhood is Global*. Garden City, N.Y.: Anchor Press.

MORRISEY, Will. 1996. *A Political Approach to Pacifism.* 2 vols. Lewiston, N.Y.: Edwin Mellen Press.
MORTON, Bruce E. 2000. "The Dual Quadbrain Model of Behavioral Laterality." Dep. of Biochemistry and Biophysics, School of Medicine, University of Hawai i.
MOSER-PUANGSUWAN, Yeshua. 1995. From the peace army to the Balkan peace team. *Seeds of Peace*, 11/3: 9-11.
_____ and WEBER, Thomas. 2000*. Nonviolent Intervention Across Borders: A Recurrent Vision*. Honolulu: Spark M. Matsunaga Institute for Peace, University of Hawai i.
MOSKOS, Charles and CHAMBERS, John W. II, eds. 1993. *The New Conscientious Objectors: From Sacred to Secular Resistance*. Oxford: Oxford University Press.
NAGLER, Michael N. 1982. *America Without Violence*. Covelo, Calif.: Island Press.
NAHAL, Chaman. 1997. A sister remembered. *The Hindustan Times*, New Delhi, November 10.
NAKAMURA, Hajime. 1967. Basic features of legal, economic, and political thought in Japan. Pp. 143-63 in *The Japanese Mind*, ed. Charles A. Moore. Honolulu: East-West Center and University of Hawaii Press.
NARAYAN, Jayaprakash. 1975. From socialism to sarvodaya. Pp. 145-77 in *Jayaprakash Narayan,* A. Bhattacharya. Delhi: Vikas.
_____ 1978. *Towards Total Revolution.* 4 vols., ed. Brahmanand. Bombay: Popular Prakashan.
NATHAN, Otto and NORDEN, Heinz, eds. 1968. *Einstein on Peace*. New York: Schocken Books.
NAUTIYAL, Annpurna. 1996. Chipko movement and the women of Garhwal Himalaya. *Gandhian Perspectives* 9 (2): 9-17.
NOBEL PRIZE RECIPIENTS. 1981. Manifesto of Nobel prize winners*. IFDA Dossier*, 25: 61-63.
NORMAN, Liane E. 1989. *Hammer of Justice: Molly Rush and the Plowshares Eight*. Pittsburgh, Pa.: Pittsburgh Peace Institute.
ORGANIZATION OF AMERICAN HISTORIANS. 1994. Peacemaking in American history. *Magazine of History*, 8(3): 1-96.
PAIGE, Glenn D. 1968. *The Korean Decision: June 24-30, 1950*. New York: Free Press.
_____ 1971. Some implications for political science of the comparative politics of Korea. Pp. 139-68 in *Frontiers of Development Administration*, ed. Fred W. Riggs. Durham, N.C.: Duke University Press.
_____ 1977. *The Scientific Study of Political Leadership*. New York: Free Press.
_____ 1977. On values and science: *The Korean Decision* reconsidered. *American Political Science Review* 71(4): 1603-9.
_____ 1986. Beyond the limits of violence: toward nonviolent global citizenship. Pp. 281-305 in *Textbook on World Citizenship*, ed. Young Seek Choue. Seoul: Kyung Hee University Press.
_____ and GILLIATT, Sarah, eds. 1991. *Buddhism and Nonviolent Global Problem-solving: Ulan Bator Explorations*. Honolulu: Center for Global Nonviolence Planning Project, Matsunaga Institute for Peace, University of Hawai i.

_____; SATHA-ANAND, Chaiwat; and GILLIATT, Sarah, eds. 1993a. *Islam and Nonviolence*. Honolulu: Center for Global Nonviolence Planning Project, Matsunaga Institute for Peace, University of Hawai i.

_____ 1993b. *To Nonviolent Political Science: From Seasons of Violence*. Honolulu: Center for Global Nonviolence Planning Project, Matsunaga Institute for Peace, University of Hawai i.

_____ and ROBINSON, James A. 1998. In memoriam: Richard Carlton Snyder. *PS: Political Science & Politics*, 31: 241-2.

_____ 1999. Gandhi as leader: a Plutarchan perspective. *Biography* 22 (1): 57-74.

_____ 1999. A question for the systems sciences: is a nonkilling society possible? pp. 409-16 in Yong Pil Rhee, ed. *Toward New Paradigm of Systems Sciences*. Seoul: Seoul National University Press.

PALMER, Stuart H. 1960. *A Study of Murder*. New York: Thomas Y. Crowell.

PAREKH, Bhikhu. 1989a. *Colonialism, Tradition and Reform: An Analysis of Gandhi's Political Discourse*. Newbury Park: Sage.

_____ 1989b. *Gandhi's Political Philosophy: A Critical Examination*. London: Macmillan.

PARKIN, Sara. 1994. *The Life and Death of Petra Kelly*. London: Pandora, Harper-Collins Publishers.

PBS. 1993. "Fame in the 20th Century." Part V.

PEACE NEWS. 1998. Las Abejas: the Bees continue to fly. July: 12-14.

PELTON, Leroy H. 1974. *The Psychology of Nonviolence*. New York: Pergamon Press.

PERRIN, Noel. 1979. *Giving up the Gun*. Boston: David R. Godine Publisher.

PLATO. 1974. *The Republic*, trans. D. Lee. Harmondsworth: Penguin.

PLIMAK, E.G. and KARYAKIN, YU.F. 1979. "Lenin o mirnoi i nyemirnoi formakh revolyutsionnogo perekhoda v sotsializmu" [Lenin on peaceful and nonpeaceful forms of revolutionary transition to socialism]. Paper presented to the XIth IPSA World Congress, Moscow University, 12-18 August.

PLUTARCH. 1967-75. *Plutarch's Lives.* 11 vols. Trans. B. Perrin. Cambridge, Mass.: Harvard University Press.

POLK, Kenneth. 1994. *When Men Kill: Scenarios of Masculine Violence*. New York: Cambridge University Press.

POLNER, Murray and GOODMAN, Naomi, eds. 1994. *The Challenge of Shalom*. Philadelphia, Penn.: New Society Publishers.

_____ and O'GRADY, J. 1997. *Disarmed and Dangerous: The Radical Lives and Times of Daniel and Philip Berrigan*. New York: Basic Books.

POWERS, Roger S. and VOGELE, William B., eds. 1997. *Protest, Power and Change: An Encyclopedia of Nonviolent Action from ACT-UP to Women's Suffrage*. New York & London: Garland Publishing.

RADHAKRISHNAN, N. 1992. *Gandhi, Youth & Nonviolence: Experiments in Conflict Resolution*. Mithrapuram, Paranthal Post, Kerala, India: Centre for Development & Peace.

_____. 1997a. *Gandhian Nonviolence: A Trainer's Manual*. New Delhi: Gandhi Smriti and Darshan Samiti.

_____ 1997b. *The Message of Gandhi through Universities*. New Delhi: Gandhi Smriti and Darshan Samiti.
RAMACHANDRAN, G. 1984. *Adventuring With Life: An Autobiography*. Trivandrum, India: S.B. Press.
_____ and MAHADEVAN, T.K., eds. 1970. *Quest for Gandhi*. New Delhi: Gandhi Peace Foundation.
RAMSEY, L. Thomas. 1999. "How many people have ever lived, Keyfitz's calculation updated." http://www.math.hawaii.edu/~ramsey/People.html.
RANDLE, Michael. 1993. *Civil Resistance*. London: Fontana Press.
RESTAK, Richard M. 1979. *The Brain: The Last Frontier*. Garden City, N.Y.: Doubleday.
RIVERA, Joseph de. 2008. *The Paradigm Challenge of Political Science: Delegitimizing the Recourse to Violence*. pp. 71-87 in Joseph de Rivera, ed. Handbook on Building Cultures of Peace. New York: Springer.
ROBARCHEK, Clayton and ROBARCHEK, Carole. 1998. *Waorani: The Contexts of Violence and War*. Fort Worth, Tex.: Harcourt Brace College Publishers.
ROBERTS, Adam. 1967. *The Strategy of Civilian Defense: Non-Violent Resistance to Aggression*. London: Faber & Faber.
_____. 1975. Civilian resistance to military coups. *Journal of Peace Research*, 12(1): 19-36.
ROLLAND, Romain. 1911. *Tolstoy,* trans. Bernard Miall. New York: E.P. Dutton.
ROODKOWSKY, Mary. 1979. Feminism, peace, and power. In Bruyn and Rayman 1979: 244-66.
ROSENBERG, Mark L. and MERCY, James A. 1986. Homicide: epidemiologic analysis at the national level. *Bulletin of the New York Academy of Medicine*, 62: 376-99.
ROUSSEAU, Jean-Jacques. 1966[1762]. *Du contrat social*, introd. Pierre Burgelin. Paris: Garnier-Flammarion.
_____ 1994[1762]. *The Social Contract*, trans. C. Betts. Oxford: Oxford University Press.
ROUSSELL, Vincent. *Jacques de Bollardière: De l'armée à la non-violence.* Paris: Desclée de Brouwer.
ROYAL SWEDISH ACADEMY OF SCIENCES. 1983. *Ambio* 12. Special issue on environmental research and management priorities for the 1980s.
ROYCE, Joseph. 1980. Play in violent and non-violent cultures. *Anthropos*, 75: 799-822.
RUMMEL, Rudolph J. 1994. *Death by Governments*. New Brunswick, N.J.: Transaction Publishers.
SAGAN, Eli. 1979. *The Lust to Annihilate: A Psychoanalytic Study of Violence in Greek Culture*. New York: Psychohistory Press.
SALLA, Michael E. 1992. "Third Party Intervention in Interstate Conflict: The International Implications of Groups Committed to Principled Nonviolence in the Thought of M.K. Gandhi, Martin Luther King, Helder Camara & Danilo Dolci." Ph.D. diss., Government, University of Queensland.
SANTIAGO, Angela S. 1995. *Chronology of a Revolution 1986*. Manila: Foundation for Worldwide People Power.

SATHA-ANAND, Chaiwat. 1981. "The Nonviolent Prince." Ph.D. diss., Political Science, University of Hawai i.

_____ (Qader Muheideen). 1990. The nonviolent crescent: eight theses on Muslim nonviolent action. In Crow, Grant, and Ibrahim 1990: 25-40.

_____ and TRUE, Michael, eds. 1998. *The Frontiers of Nonviolence*. Bangkok and Honolulu: Peace Information Center and Center for Global Nonviolence. In cooperation with the Nonviolence Commission, International Peace Research Association (IPRA).

_____ 1999. Teaching nonviolence to the states. *In Asian Peace: Regional Security and Governance in the Asia-Pacific*, ed. Majid Tehranian. London: I.B. Taurus.

SCHLISSEL, Louise. 1968. *Conscience in America: A Documentary History of Conscientious Objection in America 1757-1967*. New York: E.P. Dutton.

SCHMID, Alex P. 1985. *Social Defence and Soviet Military Power: An Inquiry Into the Relevance of an Alternative Defence Concept*. Leiden: Center for the Study of Social Conflict, State University of Leiden.

SCHWARTZ, Stephen I., ed. 1998. *Atomic Audit: The Costs and Consequences of U.S. Nuclear Weapons Since 1940*. Washington, D.C.: Brookings Institution Press.

SCHWARZSCHILD, Steven et al., n.d. *Roots of Jewish Nonviolence*. Nyack, N.Y.: Jewish Peace Fellowship.

SEBEK, Viktor. 1983. Bridging the gap between environmental science and policy-making: why public policy often fails to reflect current scientific knowledge. *Ambio*, 12: 118-20.

SELECTIVE SERVICE SYSTEM. 1950. *Conscientious Objection*. Special monograph. No. 11, Vol. i.

SEMELIN, Jacques. 1994. *Unarmed Against Hitler: Civilian Resistance in Europe, 1939-1943*. Westport, Conn.: Praeger.

SETHI, V.K. 1984. *Kabir: The Weaver of God's Name*. Punjab, India: Radha Soami Satsang Beas.

SHARP, Gene. 1960. *Gandhi Wields the Weapon of Moral Power*. Ahmedabad: Navajivan Publishing House.

_____ 1973. *The Politics of Nonviolent Action*. Boston, Mass.: Porter Sargent.

_____ 1979. *Gandhi As a Political Strategist*. Boston, Mass.: Porter Sargent.

_____ 1980. *Social Power and Individual Freedom*. Boston, Mass.: Porter Sargent.

_____ 1989. "The Historical Significance of the Growth of Nonviolent Struggle in the Late Twentieth Century." Paper presented at the Institute of World History of the Academy of Sciences of the USSR, Moscow, November 21-23.

_____ 1990. *Civilian-Based Defense: A Post-Military Weapons System*. Princeton, N.J.: Princeton University Press.

_____ 1993. *From Dictatorship to Democracy*. Cambridge, Mass.: The Albert Einstein Institution.

_____ 1994. "Nonviolent Struggle: A Means toward Justice, Freedom and Peace." A presentation during the mass on Public Education Day, January 18, 1994, spon-

sored by the Justice and Peace Commission of the Union of Superiors General of the Catholic Church, Rome.
SHRIDHARANI, Krishnalal. 1962[1939]. *War without Violence*. Bombay: Bharatiya Vidya Bhavan.
SHUB, David. 1976. *Lenin*. Harmondsworth: Penguin Books.
SIBLEY, Mulford Q., ed. 1963. *The Quiet Battle: Writings on the Theory and Practice of Non-violent Resistance*. Boston, Mass.: Beacon Press.
SIMON, David. 1991. *Homicide: A Year on the Killing Streets*. Boston, Mass.: Houghton Mifflin.
SIVARD, Ruth Leger. 1996. *World Military and Social Expenditures 1996*. Washington, D.C.: World Priorities. 16th edition.
SNYDER, Richard C.; BRUCK, Henry W.; and SAPIN, Burton, eds. 1962. *Foreign Policy Decision-Making: An Approach to the Study of International Politics*. New York: The Free Press of Glencoe, Macmillan.
_____ and WILSON, H.H. 1949. *Roots of Political Behavior*. New York: American Book Company.
SOLOMON, George F. 1970. Psychodynamic aspects of aggression, hostility, and violence. In Daniels, Gilula, and Ochberg 1970: 53-78.
SOROKIN, Pitirim A. 1948. *The Reconstruction of Humanity*. Boston: Beacon Press.
_____ 1954. *The Ways and Power of Love*. Boston: Beacon Press.
SOROS, George. 1997. The capitalist threat. *The Atlantic Monthly*, February: 45-58.
SPONSEL, Leslie E. 1994a. The mutual relevance of anthropology and peace studies. In Sponsel and Gregor 1997: 11-19.
_____ and GREGOR, Thomas, eds. 1994b. *The Anthropology of Peace and Nonviolence*. Boulder, Colo.: Lynne Rienner.
_____ 1996. Peace and nonviolence. Pp. 908-12 in *The Encyclopedia of Cultural Anthropology*, eds. David Levinson and Melvin Ember. New York: Henry Holt.
STANFIELD, John H., II. 1993. The dilemma of conscientious objection for African Americans. In Moskos and Chambers 1993: 47-56.
STANNARD, David E. 1992. *American Holocaust: Columbus and the Conquest of the New World*. Oxford: Oxford University Press.
STEGER, Manfred B. 2000. *Gandhi's Dilemma*. New York: St. Martin's Press.
_____ and LIND, Nancy S, eds. 1999. *Violence and Its Alternatives*. New York: St. Martin's Press.
STEIN, Michael B. 1997. Recent approaches to the concept of creativity and innovation in political and social science: a summary assessment. Paper presented to the XVIIth World Congress of the International Political Science Associaation, Seoul, Korea.
STEINSON, Barbara J. 1980. "The mother half of humanity": American women in the peace and preparedness movements of World War I. Pp. 259-284 in *Women, War, and Revolution*, eds. Carol R. Berkin and Clara M. Lovett. New York and London: Holmes & Meier.
STEPHENSON, Carolyn M. 1997. Greenpeace. In Vogele and Powers 1997: 220-2.

STEVENS, John. 1987. *Abundant Peace: The Biography of Morihei Ueshiba Founder of Aikido*. Boston: Shambala.
STONE, I.F. 1989. *The Trial of Socrates*. New York: Anchor Books.
SUMMY, Ralph. 1988. Towards a nonviolent political science. Pp. 161-172 in *Professions in the Nuclear Age*, eds. S. Sewell, A. Kelly and L. Daws. Brisbane: Boolarong.
_____ 1991. Vision of a nonviolent society: what should be society's aims. *Balance*, 3(4): 3-8.
_____ 1994. Nonviolence and the case of the extremely ruthless opponent. *Pacifica Review*, 6(1): 1-29.
_____ and SAUNDERS, Malcolm. 1995. Why peace history*? Peace & Change* 20: 7-38.
_____ 1997. Australia, a history of nonviolent action. In Powers and Vogele 1997: 25-32.
_____ 1998. Nonviolent speech. *Peace Review* 10 (4): 573-8.
TARASOFF, Koozma J. 1995. Doukhobor survival through the centuries. *Canadian Ethnic Studies/Etudes Ethniques au Canada* 27(3): 4-23. Special Issue: From Russia with Love: The Doukhobors.
TAYYABULLA, M. 1959. *Islam and Non-Violence*. Allahabad: Kitabistan.
TENDULKAR, D.G. 1967. *Abdul Ghaffar Khan: Faith is a Battle*. Bombay: Popular Prakashan.
THOMPSON, Henry O. 1988. *World Religions in War and Peace*. Jefferson, N.C. and London: McFarland & Company.
TOBIAS, Michael. 1991. *Life Force: The World of Jainism*. Berkeley, Calif.: Asian Humanities Press.
TOLSTOY, Leo. 1974[1893 and 1894-1909]. *The Kingdom of God and Peace Essays*, trans. Aylmer Maude. London: Oxford University Press.
TROCMÉ, André. 1974. *Jesus and the Nonviolent Revolution*. Scottdale, Penn.: Herald Press.
TRUE, Michael. 1995. *An Energy Field More Intense Than War: The Nonviolent Tradition and American Literature*. Syracuse, N.Y.: Syracuse University Press.
TSAI, Loh Seng. 1963. Peace and cooperation among natural enemies: educating a rat-killing cat to cooperate with a hooded rat. *Acta Psychologia Taiwanica*, 3: 1-5.
TWAIN, Mark. 1970[1923]. *The War Prayer*. New York: Harper & Row.
UNITED NATIONS. 1978. *Final Document of Assembly Session on Disarmament 23 May – 1 July 1978*. S-10/2. New York: Office of Public Information.
_____. 1993. *Agenda 21: The United Nations Programme of Action from Rio*. New York: United Nations.
_____ 1996. *Report of the Fourth World Conference on Women, Beijing, 4-15 September 1995*. New York: United Nations.
UNNITHAN, N. Prabha; HUFF-CORZINE, Lin; CORZINE, Jay; and WHITT, Hugh P. 1994. *The Currents of Lethal Violence: An Integrated Model of Suicide and Homicide*. Albany: State University of New York Press.
UNNITHAN, T.K.N. and SINGH, Yogendra. 1969. *Sociology of Non-Violence and Peace*. New Delhi: Research Council for Cultural Studies, India International Centre.

_____ 1973. *Traditions of Nonviolence*. New Delhi: Arnold-Heinemann India.
UNREPRESENTED NATIONS AND PEOPLES ORGANIZATION (UNPO). 1998. *Nonviolence and Conflict: Conditions for Effective Peaceful Change*. The Hague: Office of the Secretary General, UNPO. http://www.unpo.org.
_____ 1998. *Yearbook 1997*, ed. J. Atticus Ryan. The Hague: Kluwer Law International.
VILLAVINCENCIO-PAUROM, Ruby. 1995. Nature/gunless society: utopia within reach. Pp. 146-51 in Emelina S. Almario and Asuncion D. Maramba, eds. *Alay sa Kalinaw: Filipino Leaders for Peace*. Makati City: Aurura Aragon Quezon Peace Foundation and UNESCO National Commission of the Philippines.
WAAL, Frans de. 1989. *Peacemaking Among Primates.* Cambridge, Mass.: Harvard University Press.
_____ 1996. *Good Natured: The Origins of Right and Wrong in Humans and Other Animals*. Cambridge, Mass.: Harvard University Press.
_____ 1997. *Bonobo: The Forgotten Ape*. Berkeley: University of California Press.
WALKER, Charles C. 1979. Nonviolence in Africa. In Bruyn and Rayman 1979: 186-212.
WAR RESISTERS LEAGUE. 1989. *Handbook for Nonviolent Action*. New York: War Resisters League.
WASHINGTON, James M., ed. 1986. *A Testament of Hope: the Essential Writings and Speeches of Martin Luther King, Jr*. New York: HarperCollins Publishers.
WASSERMAN, Harvey. 1982. *Killing Our Own: The Disaster of America's Experience With Atomic Radiation*. New York: Delacorte Press.
WATSON, Peter. 1978. *War on the Mind: The Military Uses and Abuses of Psychology*. New York: Basic Books.
WEBER, Max. 1958[1919]. Politics as a vocation. Pp. 77-128 in *From Max Weber: Essays in Sociology*, ed. H.H. Gerth and C. Wright. Mills. New York: Oxford University Press.
WEBER, Thomas. 1989. *Hugging the Trees: The Story of the Chipko Movement*. New Delhi: Penguin.
_____ 1996. *Gandhi's Peace Army: The Shanti Sena and Unarmed Peacekeeping*. Syracuse, N.Y.: Syracuse University Press.
_____ 1997. *On the Salt March: The Historiography of Gandhi's March to Dandi*. New Delhi: HarperCollins Publishers India.
WEEKS, John R. 1996. *Population*. 6th edition. Belmont, Calif.: Wadsworth Publishing.
WEINBERG, Arthur and WEINBERG, Lila. 1963. *Instead of Violence: Writings of the Great Advocates of Peace and Nonviolence throughout History*. Boston, Mass.: Beacon Press.
WHIPPLE, Charles K. 1839. *Evils of the Revolutionary War*. Boston, Mass.: New England Non-Resistance Society.
_____ 1860a. *Non-Resistance Applied to the Internal Defense of a Community*. Boston, Mass.: R.F. Wallcut.
_____ 1860b. *The Non-Resistance Principle: With Particular Attention to the Help of Slaves by Abolitionists*. Boston, Mass.: R.F. Wallcut.

WHITMAN, Walt. 1855. “Song of myself,” *Leaves of Grass,* 42: 33-42. Norwalk, Conn.: The Easton Press.

WILCOCK, Evelyn. 1994. *Pacifism and the Jews*. Landsdown, Gloucestershire: Hawthorn Press.

WILSON, H. Hubert. 1951. *Congress: Corruption and Compromise*. New York: Rinehart.

WITTNER, Lawrence S. 1993. *One World or None: A History of the World Nuclear Disarmament Movement Through 1953*. Stanford, Calif.: Stanford University Press.

_____ 1997. *Resisting the Bomb: A History of the World Nuclear Disarmament Movement, 1954-1970*. Stanford, Calif.: Stanford University Press.

WORLD BANK. 1997. World Development Report 1997*: The State in a Changing World*. Oxford: Oxford University Press.

_____ 1999. Press briefing, "Poverty Update." Washington, D.C., June 2.

WORLD WILDLIFE FUND. 1986. *The Assisi Declarations: Messages on Man and Nature From Buddhism, Christianity, Hinduism, Jainism & Judaism*. Gland, Switzerland: WWF International.

WRANGHAM, Richard and PETERSON, Dale. 1996. *Demonic Males: Apes and Origins of Human Violence*. New York: Houghton Mifflin.

YODER, John H. 1983. *What Would You Do? A Serious Answer to a Standard Question*. Scottdale, Penn.: Herald Press.

YOUNG, Andrew. 1996. *An Easy Burden: The Civil Rights Movement and the Transformation of America*. New York: HarperCollins Publishers.

YOUNG, Art. 1975. *Shelley and Nonviolence*. The Hague: Mouton.

YOUNGER, Stephen M. 2007. *Endangered Species: Mass Violence and the Future of Humanity*. New York: Ecco.

YOUTH DIVISION OF SOKA GAKKAI. 1978*. Cries for Peace: Experiences of Japanese Victims of World War II*. Tokyo: The Japan Times.

ZAHN, Gordon. 1964. *In Solitary Witness: The Life and Death of Franz Jägerstätter*. New York: Holt, Rinehart and Winston.

ZAVERI, Zetha Lal S. and KUMAR, Mahendra. 1992. *Neuroscience & Karma: The Jain Doctrine of Psycho-Physical Force*. Ladnun, Rajasthan: Jain Vishva Bharati.

ZHANG, Yi-Ping. 1981. Dui feibaoli zhuyi ying jiben kending [We should positively affirm nonviolence]. *Shijie lishi* [World History], 16(3): 78-80.

ZIMRING, Franklin E. and HAWKINS, Gordon E. 1986. *Capital Punishment and the American Agenda*. Cambridge: Cambridge University Press.

ZINN, Howard. 1980. *A People's History of the United States*. New York: Harper & Row.

ZUNES, Stephen; KURTZ, Lester R.; and ASHER, Sarah Beth, eds. 1999. *Nonviolent Social Movements: A Geographical Perspective*. Oxford: Blackwell Publishers.